بہاؤ

مستنصر حسین تارڑ







اُس کے سفید پَروں تلے ریت تھی؛

سفید پَر جو ایک دوسرے کے ساتھ کہیں چُھو جاتے تو اُن میں سے چنگاریاں پھوٹنے لگتیں کہ اُن میں نَمی کا ایک قطرہ نہ تھا۔ خُون صرف دل کے اردگرد گھومتا تھا پَروں میں سُوکھ چکا تھا، اِن میں دوڑنے والی سُرخ نَمی خشک ہو چکی تھی۔ اُس زبان کی طرح جو اُس کے تالُو سے ایک مُردہ سانپ کی مانندِ چپکی ہوئی تھی۔ جسم زندہ تھا، اِسی لئے اُڑان میں تھا، اُڑان کر رہا تھا پر اُس کا رُواں رُواں چڑیا کے تریہیائے ہوئے بوٹوں کی طرح مُنہ کھولے ہانپتا تھا اور ہانپے چلا جاتا تھا۔ پرندے کی آنکھوں میں البتہ توانائی تھی مگر ڈوبتی ہوئی۔ اور اُس کے پنجے نیچے سے اُٹھتی ہوئی گرم لُو میں جُھلس رہے تھے، اُس نے اُنہیں سمیٹ کر بدن کے ساتھ لگانے کی کوشش کی لیکن بدن بھی آگ تھا کہ اِسے بجھانے کے لئے کہیں نَمی کا کوئی سانس نہ تھا، اُس نے پھر اُنہیں ڈِھیل دے کر لٹکا لیا۔

اُس کے سفید پَروں تلے ریت تھی اور وہ اُڑان میں تھا۔

سفید پَر جو اب شائد سفید نہ تھے، بُھورے ہو رہے تھے، اُن میں جذب ہوتی ہوئی حِدّت اُن کا رنگ بدل رہی تھی، جیسے گرم توّے پر بکھرا سفید آٹا بُھورا ہونے لگتا ہے۔ گوشت کو اپنے ہی پروں کی تپش بے جان کئے دیتی تھی اور ریت کے ذرّوں میں سُلگتی تپش اُس کے پَروں کی جانب لپکتی تھی اور اُن میں چھید کرتی تھی۔ اِس لپک میں ایک کشش تھی، ایک سندیسہ تھا، ایک بلاوا تھا کہ اُڑان ختم ہو جائے، یہ بھٹک جانے کا سفر اختتام تک پہنچے، اِن پروں میں سکت نہ رہے ساکت ہو جائیں، اِنہیں سمیٹ لیا جائے اور یہیں اِس ریت میں اُترا جائے۔ تو پھر کیسا لگے؟ پروں کی یہ مُٹھی ایک واوروے کی طرح گھومتی اور بے بس آسمان سے گرتی جائے اور نیچے ریت کی تپتی قبر میں گم ہو جائے۔

پرندے کی سُکڑتی آنکھوں نے نیچے دیکھا۔

اُس کی آنکھوں میں لُو گھومتی تھی اور اُنہیں سُکھاتی تھی پھر بھی وُہ نیچے دیکھتی تھیں۔ ریت کے بے انت ذرّے لشکتے تھے، لشکتے تھے اور اُس کی آنکھوں میں پُھوٹتے تھے۔ گرمی کاالاؤ بل کھاتے سانپوں کی صُورت صرف اُس کے ایک بدن کی طرف شُوکتا چلا آرہا تھا۔ گرم لہریں ایک نشہ آور تواتر کے ساتھ اپنے پھڑپھڑاتے لبادے پھیلائے اوپر اُٹھتی تھیں اور اُسے اپنی لپیٹ میں لیتی تھیں۔ اُس کی چونچ کُھل گئی۔ پگھلتی ہوا اُس میں داخل ہوئی اور اُس کے تن کو تندور میں بدل دیا۔ اُس نے چونچ پھر بند کرنے کی کوشش کی، لیکن زبان سُوکھتی تھی، پُھول رہی تھی، ایک قطرہ ... نمی کا ایک سانس۔ گرم فضا میں ریت کی خاموشی میں اُس کے چٹختے پَروں کی شُوکر بھی پیاسی سُولوں کی طرح اُسی کا جسم چھلنی کر رہی تھی، اُس نے سکڑتی آنکھوں کو میچ کر دیکھا، آگے کیا ہے؟ کہاں تک؟ کب تک؟ کیا اس ہوا کو مُجھ سے سوا آج تک کسی اور پرندے کے پروں نے چیرا یا میں پہلا ہوں۔ اور آخری ہوں اور میں کون ہوں اور آگے کیا ہے؟ حلق میں اگر کہیں کچھ ہے، اور اُس تُھوک کو نِگلنا کتنا گیلا اور زندہ کر دینے والا لگے گا۔ اُس نے حلق کو پچکایا کہ نمی کا کوئی شائبہ اُس میں سے پُھوٹے مگر وہ بھی بنجر اور جُھلسا ہوا کھیت تھا۔ وہاں بھی صرف لُو تھی اور ریت تھی جس کے ذرّے اِس بلندی پر بھی فضا میں حِدّت بکھیرتے تیر رہے تھے۔ اُس نے اِس چھالے ڈال دینے والی لُو کو نِگلا اور ریت کو نِگلا اور۔ . . .

اور اِن سُوکھے ہوئے پَروں اور خشک جُھلسے ہوئے بے جان ہوتے ڈھیلے پڑتے گوشت کو اُڑان میں رکھنے سے فائدہ؟۔ مُجھے آخر کار ڈار سے الگ ہونے کی سزا بُھگتنا ہے، اِن پروں کو یکدم ساکت ہو کر نیچے جانا ہے۔ پانی کی بجائے چمکتی آبلہ ریت کے اتھاہ سمندر میں ـ ـ ـ۔ اُس نے پھر نیچے دیکھا، خشک اور ڈوبتی آنکھوں کے سامنے بے انت ذرّے چمکے، اور پھر اُسے ہر ہر ذرّے میں اپنی شکل اور اپنا مہاندرہ دکھائی دینے لگا۔ وہاں اتنے پرندے تھے جتنے پرندے آج تک پیدا ہوئے، جو ہیں وُہ بھی، جو نہیں ہیں وُہ بھی اور جو ہوں گے وُہ بھی۔ سب اُس کے ہم شکل، اُس جیسے، اُس کی اُڈیک میں،، ہمارے پاس اُتر آؤ، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ یہ سراب تو نہیں، یہ سراب تو نہیں، اُس نے ہر پرندے سے باری باری پُوچھا اور ہر پرندے نے یہی کہا کہ اس کا جواب تمہارے پاس ہے، اس کا جواب تمہارے پاس ہے، سو اُس نے اپنے پروں کو حرکت میں رکھا کہ اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ وُہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اور اِس زندگی کی بُھوک میں اُس نے ایک طویل سانس اپنی چونچ اور سُوکھی زبان کے درمیان میں سے کھینچا۔۔ گرم ہوا کا بھبھوکا اُس کی چونچ کو بُھر بھرا کرتے ہوئے مُنہ میں داخل ہوا اور سُوکھتی زبان کو

پھپھولتا حلق میں گیا اور ناگ پھنی کی فصل بوتا، شریانوں اور رگوں میں ببول بن کر چُبھتا اٹکتا اُس کے پورے بدن میں جڑیں پکڑ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُڑان ایک خواب ہے، اور اسی لئے حرکت مدھم پڑتی جا رہی ہے، میں اتنی آہستگی سے اُڑان میں ہوں کہ ہوا میں اُٹھتے اور گرتے میرے بازؤں کا ایک ایک پَر گِنا جا سکتا ہے، نیچے پھیلی ہوئی ریت ایک تپتا ہوا ہیولیٰ ہے جو اصل نہیں، میرا وہم ہے، میں دراصل جھیل کالری کی سطح پر پانی کو اپنے پروں سے ان گنت چھینٹوں میں تبدیل کرتا اُڑ رہا ہوں اور میری پُونچھ پانی کی ٹھنڈک میں تیر رہی ہے، میرے پروں میں نمی سرائت کرتی ہے، جذب ہو رہی ہے، میرا تن تندور نہیں ٹھنڈا ٹھار ہے۔ میرے منہ میں پانی کا رِم جھم سواد برس رہا ہے، میں آزاد ہوں، میرے گرد بے انت اور اَن گنت پرندوں کا ہجوم ہے۔ میں اکیلا نہیں۔ وہ سب کے سب مجھے دیکھ کر پھڑپھڑا رہے ہیں، خوشی سے چلّا رہے ہیں، پروں سے چھینٹے اُڑا رہے ہیں اور یوں ایک جھیل ہے اور اُس کے اوپر پرندے ہیں اور اُن کے اوپر چھینٹوں کی ایک جھیل ہے جو پرندوں پر برس رہی ہے۔ ہم سب برفانی تودوں اور سرد کاٹتی ہواؤں کی ٹھنڈک لئے ادھر اِن نرم رُتوں کے ملک میں آتے ہیں اور ہر برس آتے ہیں۔ اور میرے آگے پانی میں ایک پرندہ چھینٹے اُڑاتا پھڑپھڑاتا، خوشی سے چیختا جا رہا ہے اور میں اُس کے پیچھے جا رہا ہوں اور میری پُونچھ پانی کی ٹھنڈک میں تیر رہی ہے ... پانی کی ٹھنڈک میں یا لُو کے جُھلسا دینے والے الاؤ میں وہ بُھوری ہو رہی ہے۔ میں اتنی آہستگی سے اُڑان میں ہوں کہ ہوا میں اُٹھتے اور گرتے میرے بازؤں کا ایک ایک پَر گِنا جا سکتا ہے اور وُہ چھینٹے خواب تھے یہ اُڑان تو ہے۔ اُس نے اپنا چھوٹا سا سَر جَھٹکا، وُہی اُڑان ہے اور نیچے دُور نیچے ریت لشکتی تھی اور لشکتی تھی۔

پھر کڑکڑاتے، ٹُوٹنے کے قریب پَروں کے سِرے پر لُو کے ایک تھپیڑے کا لَمس چُھوا۔ اِس سے پہلے کی جھلسا دینے والی ہواؤں کی طرح۔ یہ واہمہ تھا کہ اس تھپیڑے میں نَمی کا ایک ہلکا سا لمس تھا۔ ذرّہ بھر۔ ایک شائبہ، نمی کا ایک نامعلوم چُوما۔

نیچے ایک لکیر نظر آئی۔

اُس کی سُکڑتی آنکھوں نے پہچان کی۔ لکیر لشکتی تھی پر ریت نہ تھی۔ اُس میں نَمی کی جھلک تھی۔ پرندے نے ڈھلکتی گردن سیدھی کی اور پَروں کو اُس لکیر کی سمت دھکیلنے لگا۔ دھیرے دھیرے وُہ قریب ہوا۔ نمی کی لکیر بڑی ہونے لگی، اور اُس کے کنارے کوئی بستی تھی اور اُس سے پرے ہریاول کے ٹکڑے بچھے ہوئے تھے جن کی باس اُس کی مردہ ہوتی ناک میں بھی اُترتی چلی

گئی۔ لکیر کا پاٹ پھیلنے لگا اور لشک کا رقبہ بڑھتا گیا اور پھر اُس نے دیکھا کہ وہاں پانی ہے۔ اور جب اُس کے نیم مُردہ سر کو، اُس کے سُوکھتے بدن اور مُرجھائے ہوئے پروں کو خبر ہو گئی کہ وہاں پانی ہے تو اُسی لمحے، اُس کی اُڑان کا رُخ اپنے آپ بدل گیا۔ وُہ اُس کی طرف لپکنے کی بجائے اُس نمی سے، اُس پانی سے دُور ہٹتا چلا گیا۔ اُس نے کوشش کی اپنا رُخ سیدھا رکھنے کے لئے لیکن وُہ بائیں جانب جُھکتا گیا۔ پانی سے پرے ہوتا گیا اور اُس کے اپنے پَر اُس کے بس میں نہ تھے، اُس کے اختیار سے باہر تھے۔ اُس کی خواہش الگ تھی اور اُس کی اُڑان کا راستہ اُس سے جُدا تھا۔ وہ گردن کو بَل دے کر اُس جانب دیکھنا چاہتا تھا جس طرف اُس کی خواہش تھی مگر اُس کے پَر اور اُس کا جسم اور اُس جسم میں حرکت کرتی ہوئی کوئی نامعلوم شے اُسے کسی اور راستے کی طرف اڑائے چلی جا رہی تھی۔ وہ جیسے پروں کے بغیر ہی اڑان کر رہا تھا، خود بخود، نہ چاہتے ہوئے بھی، وُہ اُس نمی سے دُور ہو رہا تھا۔ اُس کے نیچے ہریاول کی باس گزر رہی تھی۔ نم آلود مٹّی کی مہک اُس کے نتھنوں میں آتی تھی مگر وہ رُک نہیں سکتا تھا۔ وہ لکیر جو لشکتی تھی اور پانی تھی دھیرے دھیرے اوجھل ہو گئی۔ تب ایک اور تبدیلی اُس کے بدن میں آئی، جس سمت میں وہ اڑان کر رہا تھا اب وہی اُس کی خواہش تھی، وُہ ادھر ہی جانا چاہتا تھا، وُہی اُس کی امنگ تھی اور جیسے وہ اپنے آلنے کو لوٹتا تھا ویسے وہ پوری توانائی سے اُس کشش کے آگے جھکتا نیچے ہوتا چلا گیا۔ نیچے ہریاول سے نچڑتے ہوئے گھنے رُکھ تھے جو اُس کے پاس آ رہے تھے۔ وہ اور نیچے ہوا تو رُکھوں کے ذخیرے میں گھری ایک جھیل دکھائی دی پر اس کا پانی لشکتا نہ تھا۔ پر یہ پانی تو تھا، اُس نے پَیر سمیٹے اور پھڑپھڑاتا ہوا نیچے اُترنے لگا۔ اُس کے جُھلستے بُھورے پَر، تالُو سے چپکی زبان، بُھربھری چونچ اور چنگاریوں سے بویا ہوا بدن پانی پانی لپکنے لگا اور پھر اُس نے دیکھا، اپنی سُوکھتی ڈوبتی آنکھوں سے دیکھا کہ پانی کے ہر قطرے میں اُس کی اپنی شکل ہے، وہاں بے انت اور ان گنت پرندے تھے۔ وہاں اتنے پرندے تھے جتنے پرندے آج تک پیدا ہوئے، جو ہیں وہ بھی، جو نہیں ہیں وہ بھی اور جو ہوں گے وہ بھی۔ سب اُس کے ہم شکل، اُس جیسے، اُس کی اُڈیک میں۔ ہمارے پاس اُتر آؤ، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ یہ سراب تو نہیں، یہ سراب تو نہیں، اُس نے ہر پرندے سے باری باری پُوچھا۔ اور کسی نے بھی جواب نہ دیا کیونکہ۔۔۔۔۔۔ یہ سراب نہ تھا۔ وہ جھیل کنارے پرندوں کے ایک غول کے درمیان میں آگرا۔

پاروشنی نے اُسے ایک ہاتھ سے اٹھایا اور دوسرے سے اُس کی کُھلی چونچ میں پانی ٹپکاتے ہوئے کہا "تم بھی اس جھیل پر مرنے کے لئے آ گئے ہو؟"

پرندے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مر چکا تھا۔

"می آؤں۔ می آؤں" رُکھوں کے اندر سے کہیں مور بولا۔

اُس نے اپنے ہاتھ میں لٹکی پَروں کی پوٹلی کو اُن بے شمار پرندوں کے ڈھیر پر رکھ دیا جو اب ہڈّیاں ہو چکے تھے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"گئے برسوں میں پانی یہاں تک آتے تھے" اُس نے قدموں میں بچھی سفید مٹّی کی تہہ کو دیکھا۔ رُکھوں کے ذخیرے میں چھپا ہوا یہ کلراٹھا میدان پانچ چھ سو کرو لمبائی میں اور چوڑائی میں ہو گا۔ پہلے تو جھیل کے پانی رُکھوں کے تنوں تک آتے تھے پر اب وہ صرف بیچ میں سو ڈیڑھ سو کرو کے رقبے میں سمٹ گئے تھے۔ گہرائی میں بھی بس اتنے کہ تہہ کا کیچڑ صاف نظر آتا تھا اور چوپائے اُس میں کھڑے رہ سکتے تھے پر لیٹنے سے ڈوبتے تھے۔ اب بڑے پانی بھی کم آتے تھے اور اگر آتے تھے تو دریا سے نکل کر یہاں تک پہنچتے پہنچتے زمین ہی میں گُم ہو جاتے تھے اور یوں ہر برس یہ جھیل بھرنے کی بجائے کُچھ اور سُوکھ جاتی تھی، کُچھ اور سمٹ جاتی تھی۔ ہر برس پانی کے گرد ایک اور دائرہ بن جاتا، جہاں تک پانی پہلے تھا اور اب سُوکھ چکا تھا۔ ایسے دائرے پھیلتے ہوئے رکھوں کے اندر تک جاتے تھے کہ پانی بھی تو وہیں تک جایا کرتا تھا۔ اس کلراٹھی زمین پر جہاں سے جھیل ہٹ چکی تھی پرندے گرتے تھے اور مرتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ اس مقام پر پرندے صرف مرنے کے لئے آتے ہیں اور دُور دُور سے آتے ہیں، کبھی اکّا دکّا اور کبھی اَن گنت ڈاروں میں وہ اِدھر آتے۔ اُن کے مردہ جسم گلتے سڑتے اور اُن کی بُو رُکھوں کے اندر تک جاتی پر وہ سب ایک ہی جگہ پر گرتے اور یوں اُن کی ہڈیوں کا ایک ٹیلا سا بن گیا تھا۔۔ اِسی ٹیلے پر وہ بھی گرا تھا اور اب پڑا تھا اگرچہ ابھی گلا سڑا نہیں تھا۔

"می آؤں۔ می آؤں" مور بولا۔

پاروشنی کا سایہ کلراٹھی زمین پر سفید ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنا سایہ دیکھتے ہی ڈر کے مارے

ہچکی لی آسے پاسے دیکھا اور فوراً اپنا مُکھ موڑ کر سُورج پاسے کر لیا۔ اُس نے پہلے کبھی بھی بُھول چوک میں بھی سُورج کی طرف پیٹھ نہیں کی تھی۔ اُس نے بڑوں سے سُن رکھا تھا کہ ایسا کرنے سے بُرا سامنے آتا تھا۔ پر آج تو وہ آسمان سے گرتے پرندے کو دیکھنے میں مگن انجانے میں ایسا کر بیٹھی تھی۔

"می آؤں۔ می آؤں" مور بولا۔

پاروشنی سُورج کو سامنے رکھ کر رُکھوں میں داخل ہوئی اور اُن کی گھنیری چھاؤں میں راستہ بنانے لگی۔ یہاں گرم نمی میں اُس کے بدن کے مسام کُھلے اور سانس لینے لگے اور پسینہ اُس کی گردن سے رینگتا ہوا پیٹھ کو چھونے لگا۔ رُکھوں کے اس ذخیرے میں بارش اُترتی رہتی تھی اور یوں ایک گیلی ہوا دم سادھے اِدھر موجود رہتی تھی۔ رُکھوں میں پیپل اور املی کے رُکھ زیادہ تھے اور ان میں سے بیشتر اگرچہ کھوکھلے ہو چکے تھے لیکن کوئی بھی اُنہیں چُھونے کا سوچ نہیں سکتا تھا کیونکہ اِن رُکھوں میں یکشنا اور یکشنی رہتی تھیں، اُن کی روحیں جو دیکھتی تھیں۔ پیپل کا ایک بہت بڑا تنا اُس کے راستے میں آیا تو پاروشنی اُسے پھلانگنے کی بجائے سر جھکا کر اُس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی اور اُس کے گرد چکر لگا کر واپس اپنے راستے پر آئی۔ چھاؤں اتنی گھنی تھی کہ کچھ سُجھائی نہ دیتا تھا، کہیں کوئی ایک پتہ ہلتا تو سورج کی ایک کرن اس اندھیرے میں شتابی سے داخل ہوتی اور پھر جیسے تاریکی اُسے جذب کر لیتی۔ پر پاروشنی یہاں بھی دیکھ سکتی تھی اور نہ بھی دیکھ پاتی تو وُہ یہاں آنکھیں بند کر کے چل سکتی تھی۔ صرف وُہ تھی جو رُکھوں کے اندر جھیل تک جاتی تھی، اور کوئی نہ جاتا تھا۔

"می آؤں۔ می آؤں" مور بولا۔ اور اس بار وُہ پاروشنی کو دیکھ کر بولا تھا۔ اُس کا اوپر والا ہونٹ دانتوں سے پرے ہوا اور پیپل کے پتوں میں سے آتی روشنی اُن پر لشکی اور وُہ مسکراتی ہوئی اُس کے پاس سے گزر گئی۔ جب وُہ بانجھ عورتوں کے رُکھ کے قریب ہوئی تو پل بھر کے لئے رُکی، پیپل کی شاخوں اور خاص طور پر اُس کے موٹے اور اوپر اُٹھتے ہوئے تنے کے گرد بے انت وَن سوَنے دھاگے بندھے ہوئے تھے، ہر دھاگہ ایک ایسی عورت نے باندھا تھا جو خشک تھی اور فصل چاہتی تھی اور اپنے آپ کو ہرا بھرا کرنے کی اُمید پالتی تھی۔ ۔۔۔ اُس نے ایک گہرا سانس لیا، کم سے کم اُسے اِس پیپل کے ساتھ رنگین دھاگہ باندھنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئے گی، نیچے حدت دیتے بدن کے گیلے ہوتے حصے نے اُسے یہی بتایا۔ ۔۔ ورچن! اُس حصے میں تھرتھراہٹ سی ہوئی اور پاروشنی نے گھبرا کر ہاتھ باہر نکال لیا۔ اُس نے اپنی گیلی اُنگلیوں

کو ناک سے لگایا، وہاں گرم اور پھوٹنے والی مہک تھی جس میں فصل ہی فصل تھی۔

جہاں رُکھ ختم ہوتے تھے وُہیں سے ڈوبو مٹی کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ انجان چلنے والا تو اِس میں ڈوب سکتا تھا کہ اوپر سے یہ ایسے تھی جیسے عام مٹی ہو پر اُس پر چھوٹی چھوٹی گھاس اُگی ہو اور کہیں کہیں سرکنڈے اور دھامن اور کھبّل دکھائی دیتے ہوں۔ اِسے ہڑپ کرنے والی مٹی بھی بولتے تھے کیونکہ جنور یا بندہ جو بھی ادھر آیا تو اِس نے اُسے اپنے اندر ایسے گم کیا کہ باہر کوئی نشان نہ ملتا کہ ادھر کوئی تھا کہ نہیں۔۔۔ گھاس بھی واپس آ جاتی اور اُس پر مچھر اور مکوڑے پہلے کی طرح منڈلانے لگتے۔ پر اس ڈوبو مٹی میں بھی پکے پیڈے راستے تھے جن پر لوگ چلتے تھے اور پاروشنی ان راستوں کو جانتی تھی۔ اُس نے یہاں رُک کر آنکھیں بند کیں اور ہوا کو اپنے اندر کھینچا، تھوڑی دیر تک دم روکا اور پھر اُس کے نتھنوں میں کٹرن کی بوجھل خوشبو آئی اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ دائیں ہاتھ پر کٹرن کی جھاڑی کے ساتھ وہ راستہ شروع ہوتا تھا جو چھپری اور کھیپ کی جھاڑیوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا پیڈی مٹی یعنی کھیتوں کے قریب جا نکلتا تھا۔ دیکھنے میں تو یہ بھی ڈوبو مٹی ایسا ہی لگتا تھا، وہی چھوٹی چھوٹی گھاس اور باریک گتّی جو اُس کے اوپر اُڑتی رہتی پر اندر سے یہ اُکا پکا پیڈا تھا۔ پاروشنی دھیرے دھیرے دیکھ دیکھ کر پاؤں دھرتی اس پر چلنے لگی۔ کہیں کہیں نرم مٹی بھی آ جاتی اور اُسے ٹخنوں تک دھنسے پاؤں کو کھینچ کر باہر نکالنا پڑتا۔ دریا کے بڑے پانی اس برس ابھی نہیں آئے تھے ورنہ یہ راستہ بھی ڈوبو ہو چکا ہوتا۔ کٹرن کی جھاڑیوں کے ایک جُھنڈ میں اُسے پندرُو پھر دکھائی دیا۔ وُہ شاندار لشکتی گردن اٹھائے خاموش کھڑا جیسے گم تھا، پاؤں، سر یا آنکھوں میں کوئی جنبش نہیں صرف کان کبھی کبھار اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھر جاتے۔ اُس کی آنکھیں اتنی تیز نہیں کہ پاروشنی کو دیکھ سکے۔ وُہ گم کھڑا تھا اور اُسی سمے پاروشنی کے پاؤں تلے ایک سُوکھی ہوئی ٹہنی ٹوٹی تو اُس کے کان اس آواز کی جانب پھرے، اُس دم ہوا کا ایک جھونکا پاروشنی سے اُدھر کو گیا تو اُس نے نتھنے پُھلا کر سُونگھا اور کسی کی موجودگی کو جان کر ہوشیار ہوا اور پھر پلانگیں بھرتا ڈوبو مٹی پر سے بھاگتا رُکھوں کے اندر چلا گیا۔ پندرو ڈوبو مٹی پر اتنا بھارا ہی نہیں ڈالتا تھا کہ وُہ ڈوب سکے۔ پاروشنی جب کبھی جھیل کو جاتی تو یہ چنکارہ ہرن کنک رنگا، سفید پیٹ والا اپنی چھوٹی سی دُم جھاڑتا آنکھیں جھپکتا اُسے کہیں نہ کہیں ضرور دکھائی دے جاتا۔ وُہ اُسے پندرُو کہتی تھی۔ پاروشنی اپنے اندر میں مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ تین کرُو کا پینڈا کرنے کے بعد اُس کے پیروں نے بتایا کہ ڈوبو مٹی ختم ہو رہی ہے، وہ اب زمین میں کم دھنستے تھے، اور وُہ پلانگیں بھرتی ہوئی تیزی سے چلنے لگی۔

اُنہوں نے اُسے ڈوبو مٹّی سے باہر آتے تو نہیں دیکھا تھا کیونکہ وُہ سویر سے اپنی کسّیوں اور کُدالوں پر جھکے زمین کھود رہے تھے۔ بڑے پانی کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کب آجائے۔ یہی دن اُس کے آنے کے تھے اور زمین کا یہ ٹکڑا اُن کے ذمّے پڑا تھا۔ ہاں جھوریا پسینہ پونچھنے کو کھڑا ہوا تو وہ پھوگ کی جھاڑیوں کے درمیان چلتی دکھائی دی۔ اُن دونوں نے جب اپنے بھرا کو دوبارہ جُھکتے محسوس نہ کیا تو وہ بھی کمر پر ہاتھ رکھ کر سیدھے ہو گئے اور اُدھر کو دیکھنے لگے جدھر تیسرا دیکھتا تھا۔ اس بار مینہ کم برسا تھا اور پھوگ پر پتّے نہیں تھے صرف خشک ٹہنیوں کا جھاڑ تھا جس کا چاندی رنگ دُھوپ میں ٹھاٹھیں مارتے پانی کی طرح لشکارے مارتا تھا۔ اور ان خشک لشکتے جھاڑوں میں پاروشنی چلی جا رہی تھی۔ پھوگ کی ٹہنی اگر خشک ہو تو اُس کا رنگ تازہ راکھ ایسا ہوتا ہے پر اس میں ایسی لشک ہوتی ہے کہ گہری رات میں صرف ایک پھوگ دور سے جلتے الاؤ کی طرح دکھائی دیتی رہتی ہے۔ اور یہاں ان گنت الاؤ تھے جن کے بیچ پاروشنی چلی جاتی تھی۔

تینوں بھراؤں سے ایک کرُوہ کے فاصلے پر ماتی کا سیاہ جسم ایک کسّی پر جھکا ہوا تھا۔ اُس کے کانوں تک جب کسّیوں کی کُھس کُھس خاصی دیر تک نہ پہنچی تو اُس نے اپنی چھاتیوں پر سے لیڑا ڈھیلا کیا اور اُن پر تیرتے پسینے کو ہتھیلیوں سے پونچھا اور کھڑی ہو گئی۔ وُہ تینوں بلکہ چاروں اُس نے ایک ہی رات میں جنے تھے اور اُنہیں موت کے یَم کتّوں سے بچائے رکھنے کے لیے اُسی وقت دریا پر گئی تھی اور اُن چاروں کی ٹانگیں پکڑ کر اُنہیں کُچھ دیر کے لئے پانی میں ڈبو دیا تھا۔ جب انہیں باہر نکالا تو اُن میں سے ایک بے جان لٹکتا تھا اور باقی تینوں پھیپھڑے پُھلا پُھلا کر چیختے تھے اور اُن کے ناک مُنہ سے پانی جاری تھا۔ اُن کے جُثّے سوہنے سیاہ تھے، قد چھوٹے، ناکیں چپٹی اور بال گھنگھریالے تھے۔ وہ تینوں الگ سے کوئی کام کاج نہ کر پاتے، ہمیشہ جنوروں کی طرح سانجھے کام کرتے۔ اور اب وُہ سانجھے ہی پاروشنی کو دیکھ رہے تھے اور اُنہیں اُن کی میّا ماتی دیکھ رہی تھی۔ ماتی کے چِٹّے سفید دانت دُھوپ میں لشکے اور اُس نے اپنے موٹے ہونٹوں کو پھیلا کر ہیک لگائی "۔ جھوریا"۔ وُہ تینوں جھوریا تھے۔ پہلا دوجا اور تیجا جُھوریا۔ ماتی کی آواز سنتے ہی تینوں کی نظریں پاروشنی سے الگ ہوئیں اور زمین پر جُھک گئیں۔ وُہ اُن کی میّا تھی، بڑی میّا کا زمینی رُوپ، وُہ اُس کے چاکر تھے۔

پاروشنی نے اُن تینوں کو کسیّاں چھوڑ کر کھڑے ہوتے اور پھر ماتی کی ہیک پر دوبارہ زمین پر جُھکتے دیکھا۔

وُہ اپنے حصّے کی زمین کھود چکی تھی۔ ڈوبو مٹّی اور دریا کے درمیان پھیلی ہوئی زمین پُوری بستی

کی تھی۔ مینہ اُترنے سے پہلے اور بڑا پانی کناروں سے باہر پھیلنے سے اگیتے سارے باسی اُسے کھودنے کے لئے اپنا اپنا حصّہ بانٹ لیتے اور پھر اُس میں کنک۔ جَو اور مَٹری وغیرہ کے بیج ڈال کر اُسے پدھر کر دیتے۔ کھیتوں کے آسے پاسے گارے کی دیوار بس بنا دیتے تاکہ پانی اُن کے اندر آکر ٹھہرا رہے اور جذب ہو جائے۔ جب پَھوٹ پڑتی، بُوٹے بنتے اور اُن میں بیج پڑتا تو وُہ سب کا سانجھا ہوتا۔ کبھی کبھار جب بیج زمین میں پڑا سُوکھنے لگتا اور اُس میں پھوٹ نہ پڑتی تو بڑی میّا کی ایک مورتی جو پکلی کی پکائی ہوئی ہوتی کھیتوں کے بیچ رکھ کر بستی کی کوئی جِمی۔ بدھری یا کواسی اُس کے پاس لیٹ جاتی اور کوئی مندرا۔ پنڈو یا چپّا اُس کے بیچ اپنا بیج اُتارتا اور یُوں دنوں میں بڑی میّا کے زور سے زمین کا بیج بھی پَھوٹ مارنے لگتا۔ ماتی کے تینوں پُتروں کا بیج بھی ایسے ہی بڑی میّا کے سامنے کھیت میں لیٹے ہوئے ہُنگا نے ڈالا تھا۔ ہُنگا اُسی رات دریا میں نہانے گیا تو پھر لوٹا نہیں۔ دوسرے کنارے چلا گیا جہاں سارے مرنے والوں کی رُوحیں جاتی ہیں۔ پاروشنی بھی بڑی میّا اور کھیتوں کے لئے سب کچھ کر سکتی تھی لیکن اُس کا جی چاہتا تھا صرف ورچن؟ یا سمرو ہو؟۔ کوئی بھی۔۔ ورچن یا سَمرو کون؟ اُس کے بیچ بدن میں پھر ایک تھرتھراہٹ سی ہوئی اور وُہ گھبرا کر تیز تیز چلنے لگی۔ جن کھیتوں میں سے وُہ گزر رہی تھی اُنھیں بھی کھودا جا رہا تھا۔ کئیوں نے یہیں بستی سے باہر کھیتوں میں ڈیرے بنا لئے تھے اور اپنا مال ڈنگر بھی ساتھ لے آئے تھے۔ بڑے پانی کے آنے پر اُنہوں نے بستی کو لوٹنا تھا۔ اُس کی آہٹ ان ڈیروں کے پاس آتی تو کتّوں کی دُموں کو پہلے خبر ہوتی اور وہ دُھول میں دَھپ دَھپ چلنے لگتیں اور جب وُہ بھونکنے کو مُنہ کھولتے تو پاروشنی کو جان لیتے اور پھر لیٹ جاتے۔

جہاں بستی کا پہلا چھپّر تھا اُس سے دو تین کرَو ادھر لمبے سینگوں والے بیلوں کا باڑا تھا۔ اِن بیلوں کے کوہان نہیں تھے اور انہیں اگر سامنے کی بجائے ایک پاسے سے دیکھا جائے تو یُوں لگتا تھا جیسے اُن کا صرف ایک سینگ ہے۔ یہ پوتّر بیل صرف نسل بڑھانے کے کام میں لائے جاتے اور ویسے سارا دن بیکار بیٹھے جُگالی کرتے رہتے۔ اُن کی دیکھ بھال کے لئے بستی کا سب سے بوڑھا شخص دُھروا وہاں بٹھایا گیا تھا مگر لگتا تھا کہ وُہ جانے والا ہے کیونکہ اب وُہ ہر رات دریا کے پاسے جاتا اور کنارے پر بیٹھ کر دوسرے کنارے کی طرف دیکھتا اور روتا رہتا۔ اُس کی ہڈیاں دن بہ دن بڑی ہوتی جا رہی تھیں اور وُہ سوتے میں بھی یَم کتّوں کے رونے کی آواز بس سنتا رہتا تھا۔ جب پاروشنی اُس کے قریب آئی تو وہ چارے کے اُن چھوٹے چھوٹے گٹّھوں کو باڑے کے اندر

لے جا رہا تھا جو بستی والے سویرے سویرے اُس کی دیوار کے ساتھ جوڑ گئے تھے۔

"مامن دھروا" پاروشنی رُک گئی۔

دُھروا ایک گٹھے پر جھکا ہوا تھا، اُس نے ٹیڑھی آنکھ سے اُدھر کو دیکھا اور پھر اُسی طرح جھکا ہوا پاروشنی کے پاس آگیا "کسی کے دل میں میرا خیال نہیں۔ میرا کس بل میرا زور تو جا چکا۔ چارے کے گٹھے دیوار کے ساتھ لگا کر چلے جاتے ہیں، اُنہیں پتہ نہیں کہ میں نے کتنے بڑے پانی دیکھے ہیں، مجھ میں اب ہمت نہیں"۔

پاروشنی بولی نہیں، دیوار کی طرف گئی اور ایک گٹھا اُٹھا کر باڑے کے اندر لے گئی۔ پیشاب اور لید میں لتھڑے ہوئے بیلوں نے چارہ لانے والے کی چال اور ڈھنگ میں فرق جانا تو موندھی ہوئی آنکھوں کو کھولا اور پھر اپنی دُمیں باریک لید میں چلا کر پہلے سے بھی زیادہ چوڑے ہو کر جگالی کرنے لگے۔ کُل چھ گٹھے تھے اور پاروشنی انہیں ڈھوتے ہوئے یوں نڈھال ہوئی کہ باڑے میں جو لید اور پیشاب کی بُو تھی وُہ اُس کے اندر اتھل پتھل کرتی تھی۔

"مامن دھروا تمہارا کام کاج تو ختم ہوا" وُہ باہر آکر اُس سے ذرا پرے ہو کر بیٹھ گئی۔ دُھروا کی مہین ٹھوڑی پر گھنگھریالے بالوں کا صرف ایک گُچھا تھا جو اُس کے کالے شاہ رنگ کی وجہ سے دکھائی ہی نہیں دیتا تھا البتہ ہوا کے کسی جھونکے سے سرسراتا تو دُھروا اُسے فوراً ٹھوڑی کے ساتھ ایسے چپکانے کی کوشش کرتا جیسے وہ اُڑ جائے گا۔ اُس کی چھوٹی سی کھوپڑی پر سیاہ ماس ایسے کسا ہوا تھا کہ جونہی وُہ بولنے کو منہ کھولتا اُس کے سر کی ہڈی بالکل ہی ننگی دکھائی پڑتی۔

"آج کا کام کاج تو ختم ہوا پاروشنی۔ پر اِس آسے پاسے۔۔" اُس نے سوکھتی اور اُبھری ہوئی رگوں والا ہاتھ چاروں اور گھمایا "اور اُدھر۔۔ اُوپر" اُسنے آسمان کی طرف انگلی کھڑی کی "۔۔ جو مانا ہے۔ جسے راضی رکھنے کو ہم بڑی میا کے پاس بیٹھتے ہیں اور لنگ پر پھول تیل چڑھاتے ہیں، جو بیج میں سے بُوٹا نکالتا ہے اور جس کے یم کتے ہمیں دریا کے اُس پار لے جاتے ہیں۔۔۔ وُہ جانے میرا کاج کب مُکائے گا"

"مامن دُھروا۔ مانا ہے بھی کہ نہیں؟"

دُھروا نے یکدم پاروشنی کی طرف دیکھا جو آلتی پالتی مارے اُس سے دو کرو کے فاصلے پر دُھوپ میں بیٹھی تھی" مجھے پتہ نہیں پاروشنی۔ پر میں سوتے میں یم کتّوں کو دیکھتا ہوں اور وُہ تیز دانتوں والے سیاہ جنور مجھے کوئی دُکھ نہیں دیتے، بس میرے سامنے بیٹھ کر بُوتھیاں اوپر اٹھائے روتے رہتے ہیں۔۔۔ وُہ کتے مانا ہی تو بھیجتا ہے"

"کیا پتہ مامن، کیا پتہ۔"

دُھروا نے اپنی ٹھوڑی پر سرسراتے بالوں کو غصّے سے چپکایا "کیا کہتی ہو؟"

"مامن۔ اگر کوئی بھول چوک میں سُورج کی طرف پیٹھ کر لے۔ تو کیا ہوتا ہے؟"

"تو مانا اپنے یَم کُتوں کو اُس کے گھر میں بھیج دیتا ہے۔۔ تُو نے ایسا کیا؟"

"بُھول چوک میں مامن۔" پاروشنی کے چہرے پر ایک سیاہی پھیلنے لگی۔ دُھروا کُچھ چونکا اور پھر مانا کے کسی جانُوں کی طرح یقین کے ساتھ بولا "تُو لِنگ پر تیل ڈال، اُسے دُودھ لگا اپنے ہاتھوں سے اور جو پُھول مل جائیں تو وُہ اُس پر رکھ۔"

پاروشنی نے جو سنا، وہ اُسے اچھا نہ لگا۔ اُس کا ماتھا جو پدھرا کھیت تھا اُس پہ مینڈھیں سی بننے لگیں" مجھے جو اور کام کاج نہ ہو تو تب یہ کرتی پھروں مامن۔۔ ہیں مامن۔ سویرے مجھے اپنے کنویں میں سے پانی نکال کر سب کے گھڑے اور جھجھریاں بھرنے ہوتے ہیں۔ اپنے حصّے کی زمین کھودنا ہوتی ہے۔ بڑا پانی آنے سے پہلے اُس میں بیج ڈالنا پڑتا ہے، اور پھر کھانے پینے کا اور۔۔ جسے اور کوئی کاج نہ ہو وُہ یہ سب کرے تو کرے۔۔ میں تو۔۔۔" ۔۔ پاروشنی وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

جھیل اور دریا کے بیچ دس کوس کا فاصلہ تھا۔ دو کوس میں رُکھ تھے، دو میں ڈوبو مٹی اور پھر دریا تک کھیت اور کہیں کہیں ٹیلے اور جھاڑیاں۔ بستی سے ذرا ہٹ کر جیوا اور اُس کی بھیڑوں کا چھپّر تھا۔ پاروشنی اب دریا کے قریب آرہی تھی۔ بستی بائیں بازو پر رہ گئی تھی۔ پیڈی مٹّی پر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس کے تلووں تلے بے انت روڑے، چھوٹے چھوٹے گیٹے اور ٹھیکریاں پچھلے پہر کی گرمی میں پُھنک رہے تھے۔ کنکر اور چھوٹے چھوٹے پتھر تو اُس راستے کا پتہ دیتے تھے جس پر ایک کوس پرے ہٹنے سے پہلے دریا چلتا تھا مگر ٹھیکریاں پکلی کے آوے کی تھیں۔ ٹوٹے ہوئے گھڑوں اور صحنکوں کی یہ ٹھیکریاں آوا چڑھانے کے وقت بھانڈوں اور برتنوں کے درمیان رکھی جاتی تھیں تاکہ وہ جُڑ نہ جائیں اور پھر بعد میں پکلی انہیں آوے سے دُور یہاں تک پھینک دیتی تھی۔ اُس کے جلتے ہوئے تلووں نے پکلی کو کوسا اور وُہ پیاں بھار اُن جلتی ہوئی ٹھیکریوں پر کم سے کم بھار ڈالتی آگے بڑھنے لگی۔ دریا کی طرف سے ہوا کا ایک جھونکا آیا جس کی ٹھنڈک میں ایک گرم سانس بھی گُھل کر آتا تھا۔ پکلی نے آوا چڑھا رکھا ہے، پاروشنی نے سوچا اور مہاندرے سے مَس ہوتی ٹھنڈی اور گرم باس بدن میں اتارتی منہ کھول کر چلنے لگی۔ اسے اب پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے کٹرن کی جھاڑی کی ایک جڑ منہ میں رکھی اور اُسے چبانے لگی۔ یُوں پیاس

کُچھ کم ہوئی اوراس کے ساتھ ہی اُسے پکلی کے چھپّر دکھائی دینے لگے۔ اوراب تھکاوٹ نے اُسے بوجھل کرنا شروع کر دیا، اُس نے اپنے بدن کو ذرا ڈھیلا چھوڑا تو پاؤں گھسٹنے لگے پر جونہی گرم ٹھیکریاں اُن پر لگیں تو وُہ پھر پیتوں پر چلنے لگی۔

پکلی دونوں پاؤں جوڑے، گھٹنوں کے بیچ ایک گیلی اور کچّی جھجھر رکھے اُس پر جھکی تھی۔۔۔ اُس کی اُنگلیوں میں ہاتھ بھر کی ایک سبز ٹہنی تھی جس کا سِرا کوٹ کر نرم کیا گیا تھا۔ وہ اِسے دائیں بازو میں رکھے گیری کے پیالے میں ڈبوتی اور پھر جھجھر پر بُوٹے اُلیکنے لگتی۔ پاروشنی کو اپنے چھپّر کی طرف آتے دیکھ کر اُس نے ٹہنی کو ایک نظر دیکھا اور پھر اسے گھما کر اُس کی جانب پھینک دیا "یہ تو گیری نہیں چوستی۔ سویرے سے چار جھجھریں خراب ہوئی ہیں۔"

پاروشنی چپکے سے بیٹھ گئی۔

"ٹہنیاں لائی ہو؟"

"بُھول گئی" پاروشنی بولی اور ہتھیلیاں جھجھّر کی گولائی پر رکھ دیں۔ گیلی مٹی کی ٹھنڈک اُس کے تلووں تک چلی گئی۔ پکلی کے اُلیکے ہوئے بوٹے اور مورتیں کچّی مٹی میں رس بس چکے تھے۔

پکلی انہیں پہاڑی مٹی گیری کو گھول کر بناتی۔ گیری تین رنگ کی ہوتی تھی، کالی، پیلی اور رتّی۔۔ جھجھّر کے پیٹ کی گولائی پر آگے پیچھے مچھلی کے چانے بنے ہوئے تھے، پیپل کے پتّے تھے، ایک رُکھ کی شکل تھی اور اُس پر دو پکھیرو تھے اور ان کے پَر الیکتے ہوئے پکلی کی ٹہنی سے کالی گیری مٹی میں جذب ہونے کے بجائے سارے برتن پر پھیل گئی تھی۔

"پکلی یہ بیل بوٹے تم کیسے اُلیک لیتی ہو؟"

پکلی نے چھپر سے دُور آوے کے گرد بیٹھے اپنے بچّوں کی طرف دیکھا۔ وہ تیز دھوپ اور آگ کی نزدیکی سے بے پروا اُس میں کھرپڑ ڈال رہے تھے۔ سوکھی جھاڑیوں اور لکڑی کے علاوہ آوے میں سُلگانے کے لئے کھرپڑ سے بہتر کوئی ایندھن نہ تھا، یہ وُہ گوبر تھا جو کھیتوں اور راستوں پر پڑا پڑا دھوپ سے سوکھ جاتا تھا۔ وہ ایک چھڑی کے سِرے پر بندھے پتھر سے سلگتے ہوئے ایندھن سے برتنوں کو ڈھک رہے تھے۔ دریا کی طرف سے ہوا شرلاٹے بھرتی ہوئی آتی اور آوے کے سوراخوں میں داخل ہو کر اُپلوں میں سے گزرتی آگ کے چھوٹے چھوٹے بُلبلے بنا دیتی اور ان کے آرپار دکھائی دیتا تھا۔ جونہی آگ کسی جگہ پر شعلے میں بدلتی تو دونوں بچّے فوراً اُسے چھڑی کے ساتھ دبا دیتے کیونکہ برتن بنانے والوں کا کہنا تھا کہ آوا جلے تو گیا اور سُلگے تو بنا۔۔ آوا چڑھے ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی ورنہ ہوا میں اس کی بُو ہوتی۔

"میں نے کیا پُوچھا پکلی۔۔" پاروشنی نے پھر کہا۔

"ہاں یہ بیل بوٹے؟۔۔۔ یہ بیل بُوٹے میرے سر میں نہیں آتے۔ یہ تو ٹہنیوں میں ہوتے ہیں اور آپ ہی آپ جھجھروں۔ صحنکوں۔ چاٹیوں، ڈولوں اور گھڑوں پر بن جاتے ہیں"۔

"مُجھ سے نہیں بنتے۔" پاروشنی نے اپنے سُوجے ہوئے پاؤں کو دباتے ہوئے پکلی کی طرف دیکھا۔

"یہ تمہارا کاج نہیں ہے میرا ہے۔" پکلی ہنس دی۔ اُس کا مُنہ کُھلا تو پاروشنی نے دیکھا کہ اُس کا ایک اور دانت کم ہو گیا ہے "۰۰۰۰ جیسے دریا میں پانی ہے اور بیج میں بُوٹا ہے ایسے ہی جس کا یہ کاج ہوتا ہے اُس کے پنجر میں یہ بیل بُوٹے ہوتے ہیں جو آپ ہی آپ بنتے ہیں"

"اور یہ جھجھروں پر مچھلی کے چانے کیوں بناتی ہو؟"

"تجھے بتایا ہے کہ آپ بنتے ہیں۔ اور مُجھے تو ابھی تک یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ جو میں بناتی ہوں تو مچھلی کے چانے ہیں، تو نے آج بتایا ہے"

"جھجھر اور گھڑے میں پانی ہوتا ہے اس لئے اُس پر پانی کے جنور کی مُورت بناتے ہیں پکلی"

"تجھے زیادہ سمجھ ہے تو پوچھتی کیوں ہے۔۔ کیوں آئی ہے؟"

"جھجھر لینے۔"

"چھپّر کے اندر سے لے آ۔ پکی ہوئی"

دریائی سروٹ اور جھاڑیوں سے بنے ہوئے چھپّر کے نیچے فرش پر پَرالی بچھی ہوئی تھی اور اُس پر گیرو سو رہا تھا۔ آہٹ پر اُس نے ایک آنکھ کھولی اور پھر پاسا پلٹ کر سو رہا۔ گیرو کے چار چفیرے پکے ہوئے برتنوں کی پالیں لگی تھیں۔ پاروشنی نے ایک جھجھر اُٹھائی پر وہ بھاری لگی اُس میں مٹّی زیادہ لگ گئی تھی۔ پھر اُس نے دوسری اُٹھائی تو وہ ہلکی لگی، اُسے ہتھیلیوں میں تھامے وُہ باہر آ گئی۔

"گیرو سے بھی کام کاج لیا کر۔"

"ماتا نے عورت ذات کو زیادہ زور دیا ہے، زیادہ بُوجھ دی ہے۔ مہامیّا بھی تو عورت ہے" پکلی جو ایک صحنک کے درمیان میں بُوٹے اُلیک رہی تھی سر اُٹھا کر بولی "مرد ذات کا کیا ہے، چھوٹے اور نیچ کام کرنا یا بیج ڈالنا بس۔۔۔ تیری طرف چار جھجھریں، تین گھڑے، دو ہانڈیاں، ایک چولہا اور ایک صحنک ہو گئی۔ کنک آنے پر یاد رکھنا" اور پھر صحنک پر جُھک گئی۔

پاروشنی نے پکلی کے ہاتھ میں پکڑی ٹہنی کو دیکھا جو کالے پانی میں ڈوبتی اور صحنک پر چلنے

لگتی آپ ہی آپ۔ درمیان میں گھنے رُکھوں کے دو جنور تھے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے پھنکارتے ہوئے اور ایک بندہ جس کے بال گھنگھریالے اور لمبے تھے اُنہیں پکڑے ہوئے تھا۔ ایک جنور کی ٹانگ کو ایک غراتے ہوئے کُتّے نے پکڑ رکھا تھا۔ اِس ساری مورت کے آسے پاسے مور اور ستارے بنے ہوئے تھے۔ پکلی نے پہلی ٹہنی کو پھینک کر ایک اور ٹہنی کو اٹھایا اور اُسے اپنے بچے کھچے دانتوں تلے چبا چبا کر نرم کیا۔ پھر اسے بڑی احتیاط سے کالے پانی میں ڈبو کر صحنک پر بنے ہوئے مور کے پیٹ میں چند لکیریں کھینچیں تو ایک انسانی شکل بن گئی۔

"می آؤں، می آؤں" رُکھوں کا مور پاروشنی کے اندر بولا۔ وہ جانتی تھی کہ جب پنجر خالی ہو جائے تو اُسے خالی کر دینے والا سانس بیلوں اور موروں میں چلا جاتا ہے اور یہی جنور اُسے دریا کے پار لے جاتے ہیں۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کنک آنے پر یاد رکھنا"

"پر دیکھ لے چھوٹی جھجھر لے جا رہی ہوں اور اسی کو بھر کر کنک دوں گی۔" پاروشنی نے جھکے بغیر اپنے چوڑے کُولہوں پر بڑی آسانی سے جھجھر رکھ لی اور چلنے کو تھی کہ پکلی بولی "تیرے اندر کچھ ہے؟"

پاروشنی کی آنکھیں کچھ اور سیاہ ہو گئیں "کیوں پوچھتی ہے؟"

"تیرے کُولہے چوڑے ہوتے جا رہے ہیں اور اُن پر لُنگی کسی جا رہی ہے اس لئے۔"

"میں ہوں ہی ایسی۔" اور اپنا غصہ دکھانے کے لئے ایک پاؤں زمین پر مار کر وُہ آوے کی طرف چلنے لگی۔

پکلی کے دونوں بچّے پنڈو اور سُکرا اپنے کام میں جُتے ہوئے تھے۔ آوے کے پیٹ میں پکلی کے بنائے ہوئے برتن ایک خاص ترتیب سے اوندھے رکھے ہوئے تھے اور اُن کے بیچ ٹھیکریاں اور راکھ بھری ہوئی تھی۔ برتنوں کے علاوہ بچّوں نے اپنے کھیلنے کو مٹّی کی بیل گاڑیاں بنا کر آوے میں رکھی ہوئی تھیں۔۔۔ کچھ چھوٹے چھوٹے عجیب مُہاندروں والے بُت تھے اور کُچھ منکے بھی تھے۔ پنڈو اور سُکرا اپنے کام میں ایسے گُم تھے کہ اُنہوں نے اپنی طرف آتی پاروشنی کے پاؤں تو دیکھ لئے پر سر اُٹھا کر اُسے نہ دیکھ پائے۔ سلگتے آوے کا دُھواں آسمان کو جاتا تھا۔

"مہامیّا کی کوئی مُورتی نہیں پکائی؟"

"نہیں، وُہ پکلی آپ بناتی ہے اور پھر آپ ہی پکاتی ہے" جانے اُن میں سے کس کے جُھکے ہوئے سر میں سے آواز آئی۔

پاروشنی نے کھسکتی جھجر کو ذرا اُوپر کر کے کمر کے ساتھ لگایا اور دریا کی طرف چلنے لگی۔

اِدھر اُدھر بکھری پکلی کے آوے کی ٹھیکریاں اب اتنی گرم نہ تھیں۔

آدھ کوس چلنے کے بعد اُس کے سامنے سروٹ اور کاہی کے سرسراتے جُھنڈ کی ایک دیوار آئی اور وُہ بلا جھجھک اُس میں داخل ہو گئی۔ ایک رینگتا ہوا کُھوّ اُس کے پاؤں کی آہٹ پر زمین کے ساتھ لگ کر پتھر ہو گیا۔ سروٹ کے باریک اور تیز دھار کے پتّے پاروشنی کی باہوں پر زبانیں رکھنے کی کوشش کرتے جاتے اور کبھی کبھار اُس کے منہ سے درد کی ایک ہلکی سے چیخ نکلتی جب یہ پتّے اُس کی باہوں پر سُرخ لکیر کھینچنے میں کامیاب ہو جاتے۔ پر وُہ اپنے چوڑے تھنوں میں نمی کی باس اُتارتی جاتی تھی اور سروٹ کے پتّوں کی کاٹ سے لاپرواہ جھجھر کو تھامے اور دوسرے ہاتھ سے سروٹ کو آسے پاسے ہٹاتی چلتی جاتی تھی۔ اُس جُھنڈ میں اور کوئی نہ تھا اور اُس کے چلنے سے جو سرسراہٹ پھیلتی تو وہاں آرام کرتے پکھیرو یکدم پُھر پُھر اُڑنے لگتے۔ وُہ اونچے سروٹوں میں سے نکلی تو گھنی جھاڑیوں میں سے ریتلی زمین کے ٹکڑے نظر آنے لگے۔ جھاڑیوں کے خاتمے پر وہ رُکی۔ اُس کے قدموں میں پچھی زمین دھیرے دھیرے اونچی ہو کر ایک ٹیلے کی صُورت اختیار کر رہی تھی۔ آسمان اُس کی آنکھوں کے برابر تک جھکا تھا۔ وُہ جُھکی اور جھجھر کو سنبھالتی ہوئی ایک بُھر بُھری ڈھیم اُٹھا کر پورے زور سے گھما کر ٹیلے کے پار پھینک دی۔ وُہ ایسے ہی تھمی رہی جھجھر پر ہاتھ رکھے، سانس روکے اور۔۔۔ دُور ایک ہلکی سی چھپاک پھیلی، ڈھیم دریا میں گری تھی۔ وہ یہاں سے نظر نہ آتا تھا پر وہاں موجود تھا۔ اِس چھپاک کی آواز سے اتنے کوسوں کی تھکان نے اُس کے پنڈے کو یکدم چھوڑ دیا اور وُہ ہلکی اور بے تھکن ٹیلے پر چڑھتی گئی۔ اُس کی نظروں کے آگے آسمان نیچا ہوتا گیا یہاں تک کہ اُس کی نیلاہٹ پانی کی ایک لکیر میں چلی گئی۔ یہ گھاگرا تھا۔

وُہ پاؤں سنبھالتی ٹیلے سے اُتری اور کنکروں کی گرم تہہ پر چلتی دریا کے کنارے تک آ گئی۔ اُس نے جھجھر کو زمین پر رکھنے کی کوشش کی تو وُہ ایک پاسے لُڑھک گئی۔ اُس نے چند ٹھیکریاں جمع کیں اور اُن کی ٹیک بنا کر جھجھر کو اُن پر ٹکا دیا۔ پانی کو پیاس سے دیکھتے اُس نے آسے پاسے دیکھے بغیر اپنے سینے پر کسا ہوا لیڑا ڈھیلا کر کے کھول دیا، لیڑے کی پکڑ سے چھوٹنے پر اُس کی چھاتیاں پل دو پل کے لئے ایسے تھرتھرائیں جیسے چنکارے ہرن کی پیٹھ پر زہریلی مکھی بیٹھ جائے تو وُہ ہلتی ہے۔ تھرتھرائیں اور پھر اپنے بوجھ کو سہار کر پنڈے کا ایک خاموش حصّہ بن گئیں۔ دریا کی باس کو اُن کی اٹھان نے ایک ناک کی طرح سُونگھا اور اپنے اندر رچایا۔ بستی کی ساری عورتیں

اپنے اوپر والے حصّے کو نہیں ڈھکتی تھیں، صرف وُہ جو بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے ڈھیلی پڑ چکی تھیں یا وُہ جنہیں چلتے پھرتے اُن کے بوجھ کی وجہ سے اُنہی پر تھکان ہو جاتی تھی ایسا کرتی تھیں۔ پاروشنی پر بوجھ بہت تھا۔ پھر اُس نے لونگی کے لڑ کھولے، ہاں وُہ بہت کسی ہوئی تھی، اُس نے کُولہوں کے گرداگرد ہاتھ پھیرا تو ماس یُوں دبا اور ابھرا ہوا تھا جیسے رات اُس حصّے پر کوئی زہریلا برساتی کیڑا چل گیا ہو۔ اُس نے لونگی اُتار کر جھجھر کے ساتھ ٹھیکریوں پر رکھ دی اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔

پاروشنی اپنی نسل کا خاص قد بُت لئے ہوئے تھی۔ ہلکا سیاہی مائل رنگ، گھنگریالے اور بُھورے بال جو ایک سُتھرے گھونسلے کی طرح سر پر رکھے ہوئے تھے۔ بھنویں اُوپر کو اُٹھی ہوئیں، ناک چوڑی مگر اونچی، جبڑا ذرا آگے کو نکلتا ہوا جیسے بُھوکے جنور کا ہوتا ہے، قد بُت ایسا کہ کنک کی فصل میں چلتے ہوئے پہلی نظر پر دکھائی نہ دے اور سروٹوں میں گُم ہو جائے۔ ہونٹ موٹے اور بھرے بھرے۔ اور کُولہے پھنیر سانپ کے پھیلے ہوئے پھن کی طرح۔ اُس نے پہلا قدم پانی میں رکھا تو جھجکتے ہوئے رکھا اور پھر اُس کے پاؤں اُس میں ایسے اُٹھنے لگے جیسے وہ عام زمین پر چلتی ہو۔ دس بارہ کرو کے بعد پانی ذرا گہرا ہونے لگا اور وُہ اِسے اپنے پنڈے پر چڑھتے اور ٹھنڈک اُتارتے محسوس کرتی آگے ہوتی گئی۔ وہاں اتنا پانی تھا کہ وُہ اگر بیٹھ جائے تو گردن تک آئے اور اُس میں اپنے آپ کو دھو سکے تو وُہ اُس میں بیٹھ گئی۔ اُس نے ناک پانی پر رکھی اور پھر سارے چہرے کو پانی میں ڈبو کر اُسے جھٹکتی اور آنکھوں کو زور زور سے بھینچتی رہی۔ یوں اُس نے چہرہ دھویا۔ اب اُسے زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے آنکھیں پانی کے برابر لا کر دریا کو دیکھا جو پہاڑ پاسے سے بہتا آرہا تھا۔ پانی پچھا ہوا برابر تھا۔ کہیں جھاگ نہیں تیرتی تھی جو یہ بتاتی کہ اُدھر مینہ اُتر رہا ہے۔ پانی میں سے کسی پہاڑی بُوٹے کے ڈنٹھل پتّے نہ اُبھرتے گُم ہوتے تھے جو یہ پتہ دیتے کہ اُدھر آس پاس کا پانی دریا میں داخل ہو رہا ہے۔ پاروشنی نے گردن کو بل دے کر اپنا دایاں کان بہاؤ کے قریب کیا اور سُنا، دریا خاموش تھا بول نہیں رہا تھا جو معلوم ہوتا کہ بڑے پانی آنے کو ہیں۔

اس بار بڑے پانی کو دیر ہو گئی تھی۔

اُس نے سُنا تھا کہ بہت پہلے بستی کے بچاؤ کے لئے دریا کے ساتھ ساتھ ایک دیوار بناتے تھے اور پھر بھی پانی ادھر سے چلتا ہوا، کھیتوں میں سے ہو کر، ڈوبو مٹّی میں سے اور رُکھوں میں سے بہتا جھیل تک جاتا تھا اور اُسے پھر سے اُس کی ناک تک بھر دیتا تھا۔ اُن دنوں کھدائی اور بوائی بعد میں

کی جاتی تھی۔ پر اُس کی ہوش میں ایسا نہ ہوا تھا۔ اب تو دریا اتنا نیچے ہو گیا تھا کہ اِس کے کنارے ٹیلوں کی شکل میں خود ہی دیوار بن گئے تھے اور بڑا پانی آتا تو کھیتوں پر ایک دو پوٹے مٹّی بچھا کر اُسی وقت اُلٹے پاؤں دریا کو لوٹتا جیسے اُس کی مدد کو واپس جاتا ہو۔

پاروشنی کے اُوپر پانی کے دو پرندے ہوا میں جیسے ٹھہرے ہوئے تھے۔ وُہ بھی جیسے بہاؤ کو سُنتے تھے پر وُہ تیز آواز میں بولتے جاتے تھے۔

ٹیلے سے پرے سروٹوں کی اوٹ میں سے دھکڑ دھکڑ کی سی آوازیں آنے لگیں اور ساتھ میں ماتی کے پُتروں کی خوشی کا شور مچاتی چیخیں اُس تک پہنچیں۔ وُہ زمین کھودنے کے بعد اپنی بیل گڈ پر بستی کو لوٹ رہے تھے اور بے چارے بیلوں کو کُوٹ کُوٹ کر بھاگنے پر مجبور کر رہے تھے۔ یہ عجیب بات ہے، پاروشنی نے ٹھنڈک سے بدن پر اُبھرتے روئیں پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے سوچا، اگر بیل کا کوہان نہ ہو تو وُہ پوتر سمجھا جاتا ہے اور ساری حیاتی باڑے میں پڑا چین سے جُگالی کرتا ہے اور اگر اُس کا کوہان ہو تو بے چارے کو گڈ میں جوت کر مارتے مارتے ادھ موا کر دیتے ہیں۔۔۔ دھکڑ دھکڑ کی آوازیں دُور ہو رہی تھیں اور ہولے ہولے دُور ہو گئیں۔ سروٹوں کے اُوپر دُھول اُٹھ رہی تھی۔ پاروشنی نے ایک بار پھر پانی کے بہاؤ پر اپنا کان لگایا اور اُدھر دیکھا جدھر سے جھاگ آیا کرتی تھی اور جدھر سے دریا کے بولنے کی آواز آنی چاہیئے تھی۔ بڑا پانی دیر سے آئے گا اور ہم اپنی زمینیں کھود چکے ہیں۔ یہ دریا کہاں سے آتا ہے؟ کدھر جاتا ہے؟ اور کب تک آتا رہے گا؟۔۔ اُس نے دوسرے کنارے کی طرف دیکھا جو اُبھرے ہوئے ٹاپوؤں سے پرے چند ٹیلوں اور لکیر کی شکل میں کچھ کچھ دکھائی دیتا تھا اور اُس کے بدن میں جُھرجُھری سی آگئی۔ مور اور بیل تمہارے پنجر میں سے نکلنے والے سانس کو دوسرے کنارے پر پہنچاتے ہیں۔

رُکھوں والا مور پھر اُس کے ٹھٹھرتے جُسّے کے اندر جہاں ابھی سانس تھی بولا "مِی آؤں مِی آؤں"۔

بُوٹے کی جڑوں میں مٹی کم ہو رہی تھی اور اُسے سانس لینے میں مُشکل پیش آ رہی تھی اور اُس کا وجود کپکپا رہا تھا اور مینہ موسلا دھار برستا جا رہا تھا۔ پتھروں کی اونچائیوں سے بھی اوپر برستے پانی کے ذرّے سفید دُھویں کی شکل میں پھیل رہے تھے اور نیچے بُوٹے، جھاڑیاں اور گھاس اپنے آپ کو ظاہر کر رہے تھے کہ اُن کے آسے پاسے اور بیچوں بیچ پانی بہہ رہا تھا۔ یہاں اِس اونچائی پر رُکھ نہ تھے جو پانی کی راہ میں رکاوٹ بنتے۔ وُہ کہیں نیچے تھے اور وہاں بھی مینہ برس رہا تھا۔ جہاں کہیں چٹانیں تھیں وہاں پانی ایک گہرے شور سے گر رہا تھا مگر جہاں پتّے اور گھاس تھی وہاں اُس کی آواز گُم ہوتی جاتی تھی۔ البتہ گرا ہوا پانی ایک ہلکی گونج کے ساتھ پتھروں اور ٹہنیوں کے بیچ پگڈنڈیاں بناتا بہہ رہا تھا۔ اور ہلکی نم پُر شور تاریکی تھی۔ نہ دن تھا اور نہ رات۔ بس مینہ تھا جو لگاتار گر رہا تھا اور کئی دن اور کئی رات سے مسلسل گر رہا تھا اور بُوٹے کی جڑوں میں مٹی گُھلتی جاتی تھی۔ صرف اِس بُوٹے کو سانس لینے میں مُشکل پیش آ رہی تھی اور اِسی کا وجود کپکپا رہا تھا ورنہ اس کی نسل کے دوسرے بُوٹے اِس بے پناہ بوچھاڑ کو سہار رہے تھے کیونکہ وُہ سب اکٹھے ایک ہجوم میں تھے، قریب قریب، نچڑے ہوئے، اپنی جڑوں میں نمی محسوس کرتے ہوئے اور اپنے وجود کے ساتھ زور لگاتے، دھکیلتے پانیوں کو جُھک کر راہ دیتے ہوئے۔ وُہ سب محفوظ تھے کیونکہ ایک گروہ میں تھے اور اُن کے پاؤں کی مٹی اگرچہ گیلی ہو رہی تھی لیکن اُس کے بہہ نکلنے کا امکان کم تھا۔ اور وہ جس کی جڑوں میں مٹی بہہ نکلنے کو تھی جان بُوجھ کر اپنے گروہ سے الگ نہیں ہوا تھا۔

کوئی پرندہ تھا جو اِن اونچائیوں پر بھی آ گیا اور اُس کی بیٹ ایک بلند چٹان پر گری اور پتھروں کے بیچ ہواؤں نے تھوڑی سی مٹی جمع کر دی تھی اور اُس مٹی میں وُہ بیٹ گری اور اُس میں اُس کا بیج تھا جسے برفوں نے ڈھانکا اور وُہ زندہ رہا مگر سویا رہا اور پھر رُت بدلنے پر اپنی ہی گرمی سے برف پگھلا کر پُھوٹا اور سِرمور کی اُس چٹان پر دکھائی دینے لگا۔ اور شروع میں جب ہر پاسے تاریکی تھی اور تاریکی پانیوں پر تیرتی تھی تو کائناتی طاقت نے کہا کہ روشن ہو جا اور دیکھو وہاں روشنی تھی تو اُس

بُوٹے نے سب سے پہلے روشنی دیکھی جب کہ اُس کی نسل نیچے گہرائیوں میں تاریکی میں تھی۔ اور اب اُس کی جڑوں میں مٹی کم ہو رہی تھی۔ چٹان پر گرتے سارے پانی کا بہاؤ اُس کی طرف تھا اور وہاں مٹی بہت کم تھی اور گُھل رہی تھی اور اُس کا وجود کُملا رہا تھا اور یکدم تاریکی پھر پانیوں پر تیرنے لگی۔ اُس کے پتّوں اور نچڑتی ہوئی ٹہنیوں نے پہلی بار اپنا ماتھا چٹان کی سختی پر گرتا ہوا محسوس کیا اور اس کے بعد جڑوں کے گرد صرف ہوا گردش میں تھی۔ بُوٹا گرا تو رکاوٹ ہوا اور بہتے پانی اُس کے بیچوں بیچ راستے بنانے لگے، پھر اُسے دھکیلنے لگے اور پھر اُس کا اختیار ختم ہوا اور وُہ برستے پانی کے بہاؤ کا ایک حصّہ بن کر اپنے گھر سے نیچے آنے لگا۔ اور اُس ہلکی پر شور تاریکی میں جو نہ دن تھا اور نہ رات اُس نے اپنے آپ کو ڈوبتے محسوس کیا اور پھر اُبھرتے اور پھر بے اختیار ہوتے اور نیچے ہی نیچے جاتے، پتھروں پر اٹکتے ہوئے نیچے اُترتے یا گرتے ہوئے۔ اور پانیوں کی پگڈنڈیاں اُس کے آسے پاسے رواں تھیں جو کبھی اُس راستے میں آ گرتیں جس میں وُہ بہتا تھا اور کبھی اُس سے جُدا ہو کر دُور نکل جاتیں۔ ایک پہر کا سفر پُورا ہوا تو تاریکی ہلکی ہونے لگی مگر شور بڑھتا گیا۔ اور اِس شور میں کوئی بولتا تھا شائد وُہی جس نے کہا تھا کہ روشن ہو جا۔۔ وہ برف کی ایک سفید چٹان کے نیچے سے گزرا جو اُس کے راستے پر یُوں جُھکی تھی کہ ذرا اور جُھکتی تو راستہ روک لیتی۔

اگر یہ راستہ رُک جائے تو کیا ہو گا۔

دوسرے پہر تاریکی پھر گہری ہو گئی اور پانی گھنے رُکھوں کے سفید تنوں کے گرد لپٹتا ہوا بہہ رہا تھا۔ یہ رُکھ صرف اسی اونچائی پر ہوتے تھے اور ان کے تنے اور ٹہنیاں برف ایسے سفید تھے اور ان کے پتّے چھوٹے چھوٹے تھے۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر ان کا جنگل زندہ لگتا تھا اور پانی شور کرتا اس میں سے نیچے آتا تھا۔ اِن سفید رُکھوں کے آخر میں وُہ پہاڑوں سے ہمیشہ کے لئے الگ ہوا اور پانی کی دیوار میں چُنا ہوا ایک بڑی اونچائی سے نیچے ہوا میں گرنے لگا اور دیر تک گرتا چلا گیا۔ جب اُس کا ماتھا ایک بار پھر پتھروں سے ٹکرایا تو اُس کی کومل ٹہنیاں اور بہت سارے پتّے اُس سے الگ ہو کر کسی اور جانب بہہ گئے اور وُہ کُھرچی ہوئی شاخوں اور رگڑ کھائے ہوئے پتّوں سمیت ایک بڑی ندی کا حصّہ بن گیا۔

"سرسوتی، جو بڑے پانیوں کی ماں ہے اور ساتویں ندی ہے اُس کے
پانی آتے ہیں شاندار اور بُلند آواز میں چنگھاڑتے ہوئے۔۔"

مینہ ابھی رُکا نہیں تھا لیکن تاریکی چھٹ رہی تھی اور وُہ اُس ندی میں بے اختیار بہتا جا رہا تھا

جو اونچی چٹانوں سے سر ٹکراتی ایک آندھی کی طرح بہہ رہی تھی۔

"وہ اپنے زور سے کنول کے ڈنٹھل اکھیڑتی ہے اور اپنی طاقت والی لہروں سے پہاڑوں کے کنارے توڑتی ہے۔۔"

یہ بھی جانے کتنے پہروں کی مسافت تھی۔ اور پھر ایک پہر اُسے لگا کہ اُس کے نیچے پتھریلے گیٹوں کی بجائے ریت بچھ رہی ہے اور رگڑ کا شور کم ہو رہا ہے اور اب اُس کے وجود کو پانی دھکیل نہیں رہے بلکہ اپنے ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ تب اُس کی ایک شاخ پانی کی گہرائی میں سے ہلکی ہو کر اوپر بہاؤ میں سے اُبھری اور اُس کے پھیلے ہوئے پتوں پر دُھوپ لشکی۔۔۔ اور دیکھو وہاں روشنی تھی اور اس میں پانی چمکتے تھے۔

"اور وہ ایک زور آور ندی ہے جو پوتر دماغوں کو اپنی روشنی سے روشن کرتی ہے۔۔۔"

اور اس روشنی میں پانیوں کے بہاؤ پر جھاگ پانیوں کے سفید پرندوں کی طرح تیر رہی تھی۔ اُن کے پیچھے وہ جگہیں جہاں سے وہ گزر آئے تھے وہاں سے پانیوں کے بولنے کی ہلکی آواز چلی آتی تھی۔ بُوٹے کے اکڑے ہوئے اور ٹھٹھرتے وجود پر پہلی بار نرم رُت کی ہوا چلی۔ پانی بھی تھکاوٹوں سے شرابور اپنے آپ کو ہموار کرتے ہوئے پھیلا رہے تھے اور پسار رہے تھے۔ یہاں کوئی رکاوٹ نہ تھی اور یہ سفر کئی دن اور کئی رات کا تھا کیونکہ یہاں دن بھی تھا اور رات بھی تھی۔ سورج نکلتا تو مدھم گرماہٹ پانی میں اُترتی اور وہاں تک جاتی جہاں ٹھنڈک اُسے روک نہ دیتی۔ اندھیرا آتا تو ٹھنڈک اٹھتی اور پانی کے اوپر تک چلی جاتی اور وہاں رات ہوتی۔ یوں تو راستے میں بے انت دھارے اُس میں شامل ہو کر اُسے بڑا کرتے رہے لیکن ایک رات پانیوں کے بہنے کی آواز دوچند ہوئی۔ کوئی اور پانی تھے جو اگرچہ الگ تھے لیکن اُس کے قریب اُس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سویر تک وُہ ایسے ہی چلتے رہے اور پھر ایک مقام پر وہ آئے اور ایک دوسرے کے اندر تک چلے گئے اور بُوٹے کے تن کو پتہ چلتا رہا کہ یہاں ملاپ ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد وہ ایک بہت بڑی ندی کا حصّہ تھا جو میدانوں میں پھیل کر بہتی تھی۔ اُس کے کنارے بستیاں تھیں جن کے گھاٹ اُس کے سینے میں اُترتے تھے پر یہ لمبے فاصلوں کے بعد آتی تھیں۔ پھر کئی پہر کی مسافت ہوئی اور ایک بار پھر رُت بدلنے لگی، گرم ہونے لگی۔ ندی کے پانیوں میں ٹھنڈک کم ہوتی چلی گئی نیچے جہاں ریت تھی گرمی وہاں تک پہنچنے لگی اور پانی یوں بھی پہلے سے گھٹنے لگا کیونکہ سُوکھی فضا کے سانس اُسے چُوسنے لگے، سورج کی تپش اُڑانے لگی۔ بہاؤ پر بھاپ دھیرے

دھیرے اُٹھتی تھی اور پانی کم ہوتا تھا۔ ندی کے اونچے کنارے دُور ہوتے جا رہے تھے اور پانی سمٹ رہے تھے۔ بُوٹے کا وجود اب سُکھ چین سے بہتا تھا۔ بُلند کناروں سے پرے چند چھپروں کی ایک بستی تھی اور اُس سمے سُورج ڈوبنے کو تھا۔

پانی کے دو پرندے بہاؤ کے عین اوپر جیسے ٹھہرے ہوئے تھے وُہ تیز آواز میں بولتے جاتے تھے۔

اور بُوٹا اٹکتا ہوا بہتا جا رہا تھا۔

پاروشنی کے پانی میں ڈوبے ہوئے جُثّے کے ساتھ جیسے کوئی سرسراتا سانپ لپٹا اور اُس کی کئی زبانیں اس کے ابھار اور میچ کو چاٹنے لگیں۔ ایک ڈر کی ہچکی اُس کے مُنہ سے نکلی اور وُہ نوکدار کانوں والے سیاہ بلّے کی طرح ٹھٹھکی اور اُس کے ننگے وجود پر خوف سے کانٹے اُبھرے اور وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کے ابھاروں پر ٹھہرا پانی دریا میں شَپ شَپ گرا۔ وُہ سرسراتی ہوئی شے اُس کے پیروں میں لوٹ رہی تھی۔ وہ جھکی اور ڈرتے ڈرتے پانی میں پاؤں کے گرد ہاتھ پھیرا۔ صرف ایک ٹہنی تھی، چند پتّے اور چھلی ہوئی اور کئی دن اور کئی رات کے بہاؤ سے بے جان ہوتی ہوئی۔

"سِلما۔۔" پاروشنی کی آنکھیں خوش خوش پھیل گئیں۔ سِلما۔۔۔ اُس نے ادھر کو جدھر سے یہ بُوٹا آیا تھا آنکھیں میچ کر دیکھا، دریا کسی بڑھیا کے سینے کی طرح ہموار تھا۔ پاروشنی منظر میں جمائے کھڑی رہی اور دیکھتی رہی اور بہت دیر تک دیکھتی رہی اور تب اُس نے بہت دُور مُٹھی بھر سفید جھاگ کو دیکھا جو ڈولتی ڈولتی، اُس کی طرف آ رہی تھی۔ اور اُس کے پیچھے دو مٹھی جھاگ تھی اور اُس کے پیچھے۔۔۔ وہ فوراً نیچے بیٹھی اور کان پانی کے بہاؤ کے ساتھ لگا کر پُورے بدن سے سننے لگی۔ ہاں مدھم سی آواز تھی، دریا بول رہا تھا۔۔۔ بڑے پانی آ رہے تھے۔

وہ ایک سیاہ ہرن کی طرح پانی کو کُود کُود کر پھلانگتی کنارے پر گئی۔ لُنگی کو کولھوں پر پھنسایا، سینے کو ڈھک کر جھجھر اُٹھائی اور سروٹوں والے راستے پر چلتی ہوئی بستی کی طرف مُنہ کر لیا۔ پانی مٹّی پر اُس کے پاؤں کے نشان بناتا تھا اور وُہ چلتی تھی۔

سمرو نے انگوٹھے اور اُنگلی میں بھنچے پیپل کے پتّے ایسی شکل کے سفید منکے کو دیکھا جس پر سیاہ دھبّوں کی گول اور ترچھی لکیریں تھیں۔۔۔ یہ منکا میں نے سمرو نے بنایا ہے۔ اُس پتھر

کے ڈھیر میں سے ایک ٹکڑا لینے کے لئے میں نے کتنے دن پسینہ ٹپکایا اور دھوپ میں جُسّہ جلایا جو پکلی کے آوے سے پرے رُکھوں کے قریب کھڑا ہے۔ وہ پتھر کا ڈھیر وہاں نہ ہوتا تو میں کیا کرتا۔ میں یہ ٹکڑا وہاں سے توڑ کر لایا اور پھر اسے آری سے کاٹا، تیز دھار سے اس کی شکل بنائی، کُھرچنے سے اِسے رگڑا۔ پھر اِسے کھار میں ڈبو کر گرم کیا تو یہ سفید ہوا۔ اور اس کی سفیدی پر میں نے کتنے سانس روک کر سوئی کی مدد سے آگ پانی کے ساتھ سیاہ شکلیں بنائیں۔ یہ کس کی شکلیں ہیں۔ یہ کیا صُورتیں ہیں جو میں اِن پتھر۔ مٹّی اور سونے چاندی کے منکوں اور چوکور مُہروں پر بناتا ہوں۔ یہ کہاں سے آتی ہیں۔ یہی شکلیں، یہی مُورتیں اس بستی میں کب سے بنتی آئی ہیں، جب سے میں ہوں جب سے میرا بیج اس زمین میں اُگا۔ لیکن میرا بیج سب سے پہلے پہل اس زمین میں کس نے اُگایا۔ پہلا کون تھا۔ اُسے کون لایا۔ اُسے یہ مُورتیں کس نے سکھائیں۔۔ نانکو نے؟ کس نے؟ اور جب میرے اندر کا سانس ہمیشہ کے لئے باہر جاکر دریا پار ہو گا اور میں ٹھنڈا ہو جاؤں گا اور مُجھے بھی ایک مرتبان میں ڈال کر زمین میں رکھ آئیں گے تو پھر یہ شکلیں اور مُورتیں کوئی اور بنائے گا۔ کب تک۔ کب تک۔۔ یہ منکا اِس بستی میں رہے گا، پھر کہاں جائے گا، میری طرح مٹّی میں؟ اور پھر بے اَنت رات دن بعد جب سُورج تو ہو گا، یہ دریا بھی ہو گا، بستی بھی شائد ہو تو ہو سکتا ہے کوئی بڑے پانی آنے سے پہلے اپنی زمین کھودے تو نیچے میری طرح دبا ہوا یہ منکا اُسے ملے۔ وُہ کیسا ہو گا جسے یہ منکا ملے گا میرے جیسا یا کوئی اور۔ اور وہ کیسے جانے گا کہ منکا جس پر میں نے اتنے پسینے بہائے ہیں اور دُھوپ جلاہوں میں نے بنایا ہے، سمرو نے بنایا ہے۔

سمرو نے پتھر کے ایک ٹکڑے کو آگ پانی میں ڈبویا اور منکے کے ایک کونے میں ایک شکل بنا دی۔ اب جو کوئی بھی دیکھے گا وُہ جان جائے گا کہ یہ سمرو لکھا ہے اور اُسی نے یہ منکا بنایا ہے۔

پاروشنی مگن چلتی تھی اور سُورج ڈوبنے کو تھا اور سمرو کی آنکھوں نے اُسے دیکھا۔ یہ رُکے گی۔ وُہ جھجھر کُولہے پر اٹھائے چلتی رہی، رُکی نہیں۔

"ہے پاروشنی۔" سمرو نے ہیک لگائی "رُک۔۔۔ تیرے پیچھے تو جیسے بڑے پانی آتے ہیں ایسے چلتی ہے"۔

پاروشنی رُکی۔۔

سمرو اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ پاروشنی کا، ڈوبو پانی ایسا تھا۔۔ اوپر سے ہموار اور نیچے

سے گہرا اور ڈوبو۔۔ پتہ نہیں اُس کی گہرائی میں کیا تھا۔ وہ اُس کے پاس ہوئی اور جھجھر رکھنے کے بعد لونگی کو گُھٹنوں پر کھینچتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اُس کے لیڑے ابھی تک خشک نہیں ہوئے تھے اور جس جگہ وُہ بیٹھی تھی گیلی ہونے لگی۔

"میرا جی کہتا ہے کہ میں بھی کھیت کا کام کرتا۔ اب تک کھود کے بیج ڈال اپنے جُسّے کو ڈھیل دیتا اور چین سے کام کاج کے بغیر رہتا تیری طرح۔۔"

"جو کام تُو کرتا ہے وہ ہم میں سے کون ہے جو کر سکتا ہے۔" پاروشنی مدھم ہو کر بولی۔

"پر اس بار تو دیر ہو رہی ہے۔ پانی نہ برسا ہے اور نہ اُدھر سے آیا ہے۔" سمرو نے دریا کو وہاں تک دیکھا جہاں تک دیکھ سکتا تھا "بڑے پانی نہ آئے تو کیا ہو گا"؟

"پتہ نہیں۔" پاروشنی بولی۔

"پر اُس نے تو آنا ہے۔۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ نہ آئے"

"نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا"

اور تب سمرو نے دیکھا کہ اُس کی مٹّھی ایک گیلی اور چھلی ہوئی ٹہنی پر بند ہے جسے وُہ کُچھ چُھپا کر پیٹھ پیچھے رکھتی ہے "یہ بُوٹا کیسا ہے؟"

"پکلی کے لئے ہے" وُہ شتابی سے کہنے لگی "مُورتیں اُلیکنے کے لئے ٹہنی ہے"

بڑے پانی ایسے نہیں تھے کہ کسی کو سُن گُن ہو، پتہ چلے کہ آ رہے ہیں اور وہ دوسروں کو بتاتا پھرے، بستی میں بولتا پھرے۔۔ اس طرح تو وہ واپس چلے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جسے بھی پتہ لگتا تھا وُہ چُپ رہتا تھا۔ اور جب وُہ آتے تھے اور کناروں سے نکل کر کھیتوں کو بہتے تھے تب سبھی کو آپو آپ پتہ چل جاتا تھا اور پھر بستی میں کوئی ایک کہتا تھا کہ اس بار سب سے پہلے میں نے جانا کہ یہ آ رہے ہیں پر میں چُپ رہا۔ اور اس بار پاروشنی کی باری آ گئی تھی، اُس نے تب تک نہیں بولنا تھا۔

"پانی کا بُوٹا ہے؟" سمرو نے آگے ہو کر پھر پُوچھا۔

"نہیں۔" پاروشنی اُٹھنے لگی۔

"ورچن پتہ نہیں آئے کہ نہ آئے"

پاروشنی بیٹھ گئی۔

"یہ منکا میں نے ابھی بنایا ہے۔ تجھے چاہیئے تو رکھ لے"

پاروشنی نے کچّی دیواروں اور سروٹ کی چھت والے اُس چھپر کو دیکھا جو سمرو کا گھر تھا اور کام کاج کا ٹھکانہ بھی۔ وہ صرف منکے اور موتی نہیں بناتا تھا بلکہ مُہریں بھی گھڑتا تھا اور دریا کی سِپیوں پر بیل بُوٹے بھی کھودتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کسی دُور کی بستی سے کوئی عورت آئی جو ہنستی بہت تھی اور وُہ ادھر آئی اور آکر کہنے لگی کہ سمرو کہاں ہے؟ کون ہے؟ میں اُس سے سیپیّوں کے گہنے لُوں گی۔ ہاں سمرو جیسا بستی میں اور کوئی نہ تھا۔ اُس کی مُہروں پر پرندے، ہرن اور دریا کے جنور جیسے کروٹیں لیتے اور اُڈاریاں مارتے تھے، وہ سچ مچ کے دِکھتے تھے۔ بستی کے لوگ اِن مُہروں کو بازؤوں پر باندھتے اور اپنے چھپروں کی دیواروں کے ساتھ لگا کر دیکھتے۔

وُہ کھیتی کرنے کے لئے پتھّر سے کُدالیں اور کسیّاں بھی بنا لیتا تھا۔

سمرو کی ہتھیلی اُس کے سامنے کُھلی تھی اور اُس پر وُہ سفید منکا دھرا تھا جس پر سیّاہ دھبوں کی گول اور ترچھی لکیریں تھیں۔ "رکھ لے" سمرو نے پھر کہا۔

"فصل پکنے پر میں خود لے لوں گی۔۔" وہ بولی۔

"فصل تو پک گئی۔۔" سمرو نے کہا اور اُس کا چہرہ بھی ڈوبُو پانی ایسا ہی ہونے لگا، اُوپر سے سُکھ چین اور نیچے پتہ نہیں یَم کے کِتنے مُنہ کھولے ہوئے۔ سمرو ہمیشہ عجیب عجیب باتیں کرتا تھا، وہ کہتا کُچھ تھا اور اُس کے اندر کُچھ اور ہوتا تھا۔ اور یہ کُچھ اور اُس کے چہرے پر ہوتا تھا اور یُوں پاروشنی اُسے سُنتی کم تھی پر دیکھتی زیادہ تھی۔ اُسے وُہ اتنا ہی اچھا دِکھتا تھا جتنا کہ ورچن۔۔ اُس کے بیچ میں گرمی اور نمی دونوں کے دیکھے سے آتی تھی۔

"تُو ورچن کے لئے دن گزارتی ہے اور رات سوتی ہے پر وُہ بھی تو میں ہوں"

"ہاں تم وُہی تو ہو۔۔۔ پر وُہ آجائے تو"

"پینڈا بہت بڑا ہے پاروشنی۔ پہلے تو اُسے گھاگرا کے ساتھ ساتھ شتُدری دریا تک جانا تھا اور پھر جہاں یہ ملاپ کرتے ہیں وہاں سے شتُدری کے دوسرے پاسے جا کر سندھو کی طرف اور موہن جوڈورو۔ واپسی پر شائد وُہ ہری یوپیا بھی جائے"

"یہ بہت بڑی بستیاں ہیں، ہری یوپیا اور موہن جوڈورو۔۔"

"ہاں۔"

"کتنی بڑی؟"

سمرو نے پہلی بار اپنے موٹے ہونٹوں کو ڈھیل دی تو اُس کے دانت لِشکے "میں تو گیا نہیں پر وُہ ضرور ہم سے بہت بڑی بستیاں ہیں اور بُہت دور ہیں۔ اور میں جاؤں گا بھی نہیں۔ جو بُوٹا اکھڑ گیا وہ سُوکھ گیا۔ میری ہریالی یہیں پر ہے۔۔"

"اور ورچن۔۔"

"وہ تو لوٹے گا۔ اُس کے اندر امن نہیں۔ وُہ ایک جگہ رہے تب سُوکھتا ہے۔۔"

"لیکن سمرو تو نے اُسے بھیجا تھا، تُو نے آپ۔"

"نہ۔۔۔ نہ۔۔" سمرو مسکرایا سر ہلاتا ہوا "میرا تو بہانہ تھا۔ میں تیرے لئے وہاں سے ایسی چیزیں لاؤں گا جن سے منکے اور مُہریں ایسے بنائے گا جیسے کبھی نہ بنائے ہوں۔۔ میرا تو بہانہ تھا۔ کہتا تھا کہ سمرو میں تیری مُہریں اور سِپیاں اُدھر کو لے کر جاتا ہوں اور اُنہیں بتاتا ہوں کہ ہمارے پاس تُو ہے۔۔۔ اور ایک پوٹلی بھر کر لے گیا۔۔"

"ہماری بستی کا کوئی نام کیوں نہیں؟" پاروشنی شائد کہیں اور تھی۔

"جہاں بھانت بھانت کے لوگ ہوں۔ اندر کے، باہر کے اور جہاں امن نہ ہو وہاں نام رکھتے ہیں۔ اور جہاں لوگ بستی نہ ہوں وُہ نام رکھتے ہیں۔ ہم تو خود بستی ہیں۔ ہم یہاں نہ ہوں تو وہاں ہوں تو وہاں بستی ہوگی، تو نام کیوں رکھیں۔۔"

"اور یہ بستیاں بڑی کیسے بن جاتی ہیں"

"اِنہیں ہم بڑا بناتے ہیں، چھوٹی بستیوں والے۔۔ ہم نے گھاگرا کے کنارے پر جو کُچھ بنایا اُنہوں نے اِس کی سُن گُن پا کر وہاں یہی کُچھ بڑا کر کے بنا دیا۔ یہ چوکور مُہریں۔۔ وُہ کہاں بناتے تھے، ادھر گھاگرا کی بستیوں کے میرے جیسے وہاں گئے تو اُن کو سکھایا۔ یہ برتن اور کھیتی کرنے کے ڈھنگ ادھر سے گئے۔۔ بیج یہاں کا تھا اور پُھوٹا وہاں جا کر اور رُکھ اُن کے سروں پر چھایا بنا۔۔ پر اُن بستیوں والے ہم جیسے نہیں پاروشنی۔ سندھو میں بڑی بڑی کشتیاں تیرتی آتی ہیں بہت دُور کی بستیوں سے۔ جدھر سُورج ڈوبنے کو جاتا ہے اُدھر کے لوگ وہاں آتے ہیں اور موہنجو والے ایسی چیزیں پاس رکھتے ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے"

"اور اگر ہم نہیں جانتے تو کیا ہے۔۔" پاروشنی یکدم بپھر گئی "جو کُچھ یہاں ہے، ہمارے پانیوں، کھیتوں اور رُکھوں میں ان کے سوا میرا جُبتہ تو اور کُچھ نہیں مانگتا۔ کیا سب کُچھ جاننا ضروری ہے؟ جتنا جانو گے اتنا اکھڑو گے۔ میں بھی اِس بستی سے پَرے کبھی نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوں گی۔ میرے گھر میں جو کُنواں ہے اُس کُنویں سے میٹھے اور ٹھنڈے پانی اور کہاں ہوں گے سمرو۔"

"ہوں بھی تو وُہ ہمیں میٹھے نہیں لگیں گے۔۔" سمرو نے ہڈیوں کے ٹکڑوں، پتھروں اور

مٹّی کے ڈھیلوں میں سے ایک اور منکا اٹھایا اور اُسے وہاں رکھ دیا جہاں پاروشنی کی بھاری پیٹھ پر کَسی لُنگی میں سے پانی نُچڑ نُچڑ کر زمین میں بیٹھتا جاتا تھا۔ منکے نے ایک پیاسی زبان کی طرح نمی کو چوسا اور اُس کا رنگ دھیرے دھیرے سُرخ ہونے لگا۔

"یہ کیا کرتا ہے؟" پاروشنی ڈری اور کھڑی ہو گئی۔

"سمرو نے منکا اُٹھا لیا" بہت دن ہوئے، اتنے دن کہ ابھی تو بھی نہیں تھی اور میں بھی نہیں تھا تو ادھر بیلوں پر سوار کچھ لوگ آئے تھے جن کے پاس ایسی چیزیں تھیں جو ہم نہیں جانتے۔ میری میّا نے سُرخ سالو دے کر اُن سے یہ منکا لیا تھا۔ پانی میں ڈالنے سے رنگ بدلتا ہے"۔

"تو اِسے پرے رکھ میرے پاس نہ لا۔۔"

سمرو نے اُسے پرے رکھ دیا اور اُس منکے کو اُٹھایا جس پر وُہ کام کر رہا تھا" پر یہ والا تو میں نے خود بنایا ہے۔۔ یہ رکھ لے"

"فصل پکے گی تو رکھ لوں گی۔۔"

"نہیں اس کے لئے مجھے تیری ٹوپا بھر کنک نہیں چاہئیے۔ یہ تُو ویسے رکھ لے۔ بازو پر باندھ لے ڈھولی کے طور پر۔۔ پر باندھوں گا میں۔۔"

پاروشنی نے اُس کا زور والا سیاہ ہاتھ اپنے بازو کی طرف بڑھتے دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں پُورے بدن کے ڈھے جانے کا سندیسہ سیاہ ہوا۔ سمرو نے سلما کے ریشوں سے بٹی ہوئی رسّی کے ساتھ منکا اُس کے بازو پر کس دیا" ورچن آجائے گا۔" سمرو مسکرایا۔

"میں جاتی ہوں۔" وہ منکے پر ہتھیلی رکھ کر بولی، رسّی ماس میں کُھب رہی تھی۔

"پتہ نہیں بڑے پانی کب آئیں گے۔" سمرو پاروشنی سے پرے دریا کے بہاؤ پر تھا۔

"پتہ نہیں۔"

وُہ جانے لگی تو رُکی "سمرو تو اب بھی سوتے میں چلتا ہے، دیکھتا ہے؟"

سمرو کا چہرہ پھر سے ڈوبو پانی کی طرح سلوٹوں کے بغیر پدھرا ہو گیا" ہاں۔۔ پر سچ مُچ تو نہیں چلتا۔ لیکن سچ مُچ دیکھتا ہوں بہت کچھ۔۔"

"اِس رات کیا دیکھا؟"

"اِس رات تو کُچھ نہیں دیکھا۔ نیند میں ایسا ڈوبا ایسا ڈوبا کہ سویرے باہر آیا۔ جو کُچھ دیکھتا ہوں تجھے بتا دیتا ہوں"

پاروشنی مُڑی اور اُس کی پیٹھ سمرو کی طرف تھی۔

"ٹھہر۔۔" سمرو نے اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔ پاروشنی رُکی، وُہ جانتی تھی کہ اب سمرو وُہ کہے گا جو کوئی اور نہیں کہتا۔ سمرو نے آنکھیں جُھکا کر زمین کو دیکھا جیسے وہاں سے کچھ جان رہا ہو اور کہنے لگا" جیسے ایک سفید سانپ جنگل کے جانور پر حملہ کرتا ہے ایسے اُس نے جس کے دانت سفید کونپلوں کی طرح لشکتے ہیں اور اُس کی کہنیوں میں چُوڑیاں ہیں اور کنگن ہیں اُس نے مُجھ پر وار کیا ہے۔۔"

پاروشنی کے ہونٹ کُھلے اور اُس کے دانت سفید کونپل ہوئے۔ اُس نے مُڑ کر سمرو کو دیکھا نہیں اور باہر راستے پر آگئی۔ وُہ ماتی کے پُتروں کی گڈ کے نشانوں پر پاؤں دھرتی چلنے لگی۔ سمرو منکوں اور مُہروں پر شکلیں بناتے ہوئے گُم ہوتا تھا اور ایسی عجیب عجیب باتیں سوچتا تھا اور پھر پاروشنی سے کہتا تھا۔ اور اُسے یہ باتیں بھلی لگتی تھیں۔

بستی پاروشنی کے قریب آتی گئی، پہلے چھپر کی کچّی دیوار کے ساتھ لیٹے تین کُتّوں نے آہٹ سُن کر کان کھڑے کئے، گلے میں سے خُر خُر کی آوازیں نکالنے کا ارادہ کیا، دُمیں زمین پر پٹخیں، اگلی دونوں ٹانگوں پر اپنے آپ کو سیدھا کیا اور پھر اُس کی باس کو اپنا جان کر پھر سے لیٹ گئے۔

آج دوپہر پرندے کی سُرخ سُوکھتی آنکھوں نے اسی بستی کو دیکھا تھا اور دیکھا تھا کہ دریا کے ساتھ سیدھی دیواروں اور پدھری چھتوں کے چند چھپّر ہیں جن میں دو بڑی گلیاں پہاڑ پاسے سے سیدھی جاتی تھیں اور ان چھپروں کے پیچھے دو چھوٹی اور تنگ گلیاں ہیں اور وُہ بھی سیدھی ہیں جیسے کسی بچّے نے کھریا مٹّی سے سیدھی لکیریں کھینچ دی ہوں۔ اِن گلیوں کے بیچ میں پکّی اینٹوں کی نالیاں تھیں پر گھروں اور گلیوں کا رنگ مٹّی تھا جو ہر طرف اُڑتی تھی اور پاروشنی اس مٹّی پر پاؤں دھرتی ایک تنگ گلی میں داخل ہوئی۔ گھروں اور گلیوں کا رنگ مٹّی تھا صرف اس لئے کہ اب کے پانی برسے دیر ہو گئی تھی۔ گھاگرا کنارے اس بستی کے لوگ ویسے ہی تھے جیسے اس کے کناروں پر کھڑی اُن بستیوں کے تھے جدھر سے پانی نیچے آتے تھے۔ اُن بستیوں میں سے سُوتھی، بنجور اور مِسوال کے نام لوگوں نے سُن رکھے تھے پر کوئی بھی آج تک اُدھر گیا نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ادھر سے کبھی آیا تھا۔ ان میں سے ایک بستی کا نام ویارنا سُنا گیا تھا جو سندھو کے موہنجوڈارو اور پاروشنی کنارے کے ہڑپّا جتنی ہی تھی اگر اُن سے بڑی نہیں تھی۔ یہ بھی سُنا تھا کہ وُہ لوگ بھی اس بستی کی طرح بڑے پانی آنے سے پہلے پہلے کھیت کھود کر اُن میں کنک، مٹری اور کُسنبے وغیرہ کے بیج ڈالتے تھے اور جب بڑے پانی اُن کے کھیتوں پر چل کر واپس دریا کو جاتے تھے تو اُن کی چھوڑی ہوئی سیاہ مٹّی کی تہہ بیجوں کو گرمی دیتی تھی اور وتّر آنے پر وُہ چاند چکر سے

پہلے پُھوٹ پڑتے تھے۔ اور جب پانچ سے سات چاند چکرّ پُورے ہوتے تھے تو کُسنبہ تیار ہو جاتا تھا جو جنوروں کے کام آتا تھا۔ چھٹے چکرّ کے بعد کنک میں دانہ پڑتا اور ساتویں پر اُسے کاٹ لیتے تھے۔ اُس کے فوراً بعد باجرے کا سخت جان بیج لگاتے تھے جس پر سے اگر بڑے پانی گزر جائیں یا اُس پر ٹھہر جائیں تو بھی وُہ گلتا سڑتا نہیں زندہ رہتا ہے۔ کُسنبے کے کیسری رنگ کے ساتھ وُہ سالُو اور سُلاریاں رنگتے جو بیاہ پر لڑکی کمر کے ساتھ یُوں باندھتی کہ اُس پر سُرخ دھبّے نظر نہ آتے۔ بستی کے سارے کھیت سانجھے تھے اور چھپر اپنے اپنے تھے جو عورت ذات کے ہوتے تھے۔ دریا میں سُروٹوں سے بنائے ہوئے تُلّے تھے جو بے حد ہلکے تھے اور جس کا جی چاہے وُہ ان پر بیٹھ کر دریا کے بیچ جا کر مچھلی پکڑ سکتا تھا پر بستی کے لوگ مچھلی پکڑنے والوں کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ بستی کے ہر باسی کے ذمّے کوئی نہ کوئی ایسا کام ہوتا تھا۔ جس کا فائدہ سانجھا ہوتا تھا۔ اس بستی میں تانبے کو پگھلانے کی کوئی بھٹّی نہ تھی اور جب کبھی وہاں سے بیلوں پر سوار پھیرے والے گزرتے وُہ اِنہیں یہ دھات دیتے اور ان سے کھانے پینے کو کچھ لے لیتے۔ بستی سے باہر پکلی کے آوے سے پرے وہ میدان تھا جس میں مرے ہوؤں کے برتن تھے۔ ساتھ میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کا ایک راستہ تھا۔ جس کا جو کوئی بھی ٹھنڈا ہو کر ہمیشہ کے لئے دریا کے پار چلا جاتا وُہ اُسے مٹّی میں رکھنے کے بعد اُس راستے پر ایک اور پتھر رکھ کر گھر لوٹتا۔ راستے کے سارے پتھر اتنے تھے جتنے اس بستی میں آ کر جانے والے تھے۔ بستی کے شروع میں لِنگ کا ٹیلا تھا، یہیں دریا کے ساتھ بھکشو ٹیلا بھی تھا جو اپنی جگہ بدلتا رہتا۔ مٹّی اور ریت کا یہ ڈھیر سُست کچھوے کی طرح ہوا کے راستے میں پڑا سرسراتا رہتا، آلتی پالتی مارے بیٹھا رہتا۔ پھر بڑے پانی کے بعد ہوائیں چلتیں اور دھیرے دھیرے اُس کی مٹّی اور ریت اٹھاتی رہتیں اور اُنہیں راستے کے دوسری طرف ڈالتی رہتیں اور یُوں کچھ دنوں میں پورا ٹیلا جگہ بدل لیتا، تبھی اِسے بھکشو ٹیلا کہتے تھے، ایک جگہ سے اُٹھتا تھا اور دوسری جگہ جا بیٹھتا تھا۔ اور اگلی رُت میں وُہ پھر وُہیں واپس آ بیٹھتا۔ اِس اُٹھک بیٹھک میں اُس کی مٹّی اور ریت گھٹتی بڑھتی نہیں تھی، اتنی ہی رہتی تھی۔ لِنگ کے ٹیلے پر سرسوں کا تیل اور گیندے کے پُھول پڑے رہتے تھے۔ جس کسی نے یہاں آنا ہوتا تھا وہ رات کو آتا تھا اور چڑھاوا چڑھا کر چُپکے سے چلا جاتا تھا۔ بستی والے صرف ایک دوسرے کے ساتھ ہی نہیں بلکہ رُکھوں اور جنوروں سے بھی باتیں کرتے تھے کیونکہ اُن میں بھی تو وہ سانس ہوتا تھا جو انانکو نے سب میں پھونکا تھا۔ اور پانی تو خود بولتے تھے پر اُن کی بولی سب نہیں صرف لِنگ ٹیلے کے قریب آلکس سے لیٹا گیرو ہی سمجھتا تھا۔ جب کبھی بڑے پانیوں کے آنے میں دیری

ہوتی تو بستی والے ایک چنگیر میں مچھلی اور گیندے کے پُھول لے کر اُس کے پاس جاتے اور وُہ مچھلی کھا کر اور پُھول سونگھتے ہوئے دریا میں اُترتا اور پانیوں پر مُنہ رکھ کر کچھ کہتا اور پھر کان لگا کر سنتا اور واپس آ کر بتاتا کہ پانیوں نے یہ کہا ہے۔ پر بستی کے سارے لوگ اُس کی باتوں کو مانتے نہیں تھے، وُہ یہ سب کچھ صرف اس لئے کرتے کہ اُن سے پہلے یہی کچھ ہوتا چلا آیا تھا۔ دوسری بستیوں کے بارے میں اُنہوں نے یہ بھی سُنا تھا کہ اُن کے آس پاس کھیت کم ہو رہے ہیں اور ریت آگے آ رہی ہے اور اُن کھیتوں سے پرے کوئی رُکھ نہ تھے۔ اسی لئے اُنہیں سُوکھتی جھیل کے گرد اور ڈوبو مٹّی کے ساتھ پھیلے گھنے رُکھوں کا بڑا خیال تھا۔ اُنہیں یہ بات بھلی لگتی کہ اُن کے جنگل میں ایسے ایسے جنور تھے جو کسی نے کہاں دیکھے ہوں گے۔ ہرنوں، نیولوں اور سیہوں وغیرہ کے علاوہ وہاں منہ زور بھینسے اور بھینسیں بھی تھیں مگر اُن کے قریب جانے والے کم ہی بستی کو لوٹتے تھے۔ اور یہ جنور بھی بستی سے دُور ہی رہتے تھے کیونکہ درمیان میں ڈوبو مٹّی تھی جو اُن کے بھاری جُثّے کو سہار نہیں سکتی تھی اور اُنہیں اپنے اندر گُم کر لیتی تھی۔ ایک بار ورچن اور سمرو نے ڈوبو مٹّی میں پھنسی ایک بھینس کو وہاں سے نکال لیا تھا اور بستی میں لے آئے تھے۔ پر اُسے نکالنے سے پہلے اُنہوں نے اُس کا گلا تیز پتھر سے کاٹ لیا تھا۔ انہی رکھوں کے اندر ایسا گُمار رہتا تھا کہ اُن کے اندر جانے سے بدن پسینے میں بھیگتا تھا اور یہیں پر پاروشنی تھی۔

گھروں اور گلیوں کا رنگ مٹّی تھا جو ہر طرف اڑتی تھی اور پاروشنی اِسی مٹّی پر پاؤں دھرتی ایک تنگ گلی میں داخل ہوئی اور یہیں پر اُس کا گھر تھا، اُس کا چھپّر تھا۔ باہر سے لگتا کہ بس کچّی دیواریں ہیں اور ان کو ڈھک دیا گیا ہے۔ بڑے بوڑھوں نے کہا تھا کہ گھر کو نظر اور سُورج سے بچاؤ اور اسی لئے روشنی کا ایک چوکور سوراخ تھا اور یا پھر اندر جانے کو ایک چھوٹا سا راستہ۔ پاروشنی ایسے راستے سے پہلے چھوٹے کمرے میں آئی۔ اُس کا گھر بھی بستی کے دوسرے گھروں کی طرح سرُوٹ اور گارے سے بنا تھا لیکن ایک فرق تھا۔ اُس نے دیواریں کھڑی کرنے سے پہلے پکلی سے پکّی ٹھیکریاں لے کر گارے میں ملا دی تھیں۔ یُوں جب مینہ برستا تو دیواریں کھڑی رہتیں اور تھوڑی بہت مٹّی گُھل جاتی۔ چھوٹے کمرے کے ساتھ ایک راہداری تھی جو پانی کے کمرے میں جاتی تھی اور وہاں کنواں تھا۔ پاروشنی اپنے اسی کنوئیں کے پانی کو ہر سویر چکھتی اور پھر بڑی جھجھر میں بھر کر بستی کے سارے چھپروں میں باری باری آتی جاتی اور وہاں مٹّی سے بنی ہوئی گڑاونی پر رکھے گھڑوں اور جھجھروں میں ڈالتی۔ اور وہاں چھپر بھی بس اتنے ہی تھے جتنی ہاتھ پاؤں کی اُنگلیاں ہوتی ہیں۔ پاروشنی پانی یُوں بھرتی کہ یہ کام اُسی کا تھا۔ جیسے بستی کے دوسرے باسی ایک

دوسرے کے لئے کام کرتے تھے ایسے پاروشنی کے حصّے میں جھجروں اور گھڑوں کو بھرے رکھنا تھا۔ کنویں والے کمرے کے کونے میں پکّی اینٹوں کا کُھرا تھا نہانے دھونے کو اور اُس کے ساتھ بدن سے پھوک نکالنے کو مٹّی کی ایک بیٹھک تھی۔ کُھرے اور بیٹھک میں سے پانی اور پھوک کو نکالنے کے لئے سُرخ مٹّی کی ایک گول نالی تھی جو بڑی گلی میں زمین کے نیچے بنے ہوئے ایک گڑھے میں جاتی تھی۔

کنویں والے کمرے میں صرف راہداری آتی تھی اور اُس میں روشنی کے لئے کوئی سوراخ نہ تھا اور یہاں پہنچ کر پاروشنی کی آنکھیں دیر تک دیکھتی رہیں اور تب جا کر نیم سیاہی میں اُنہیں منڈیر پر رکھا بوکا اور اُس سے بندھی ہوئی سلما کی رسّی دکھائی دی۔ پاروشنی کے بدن کے روئیں پانی کی نزدیکی کو سُونگھتے تھے۔ اُس کا سارا جُسّہ تھرتھرایا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے بوکا اٹھایا تو جان لیا کہ اُس میں پانی ہے اور وُہ ہمیشہ اس کمرے سے جانے سے پہلے ایک بوکا نکال کر منڈیر پر رکھتی تھی۔ اُس کے ہاتھ اوپر ہوئے اور اُس نے بوکا مُنہ سے لگایا اور ٹھنڈا پانی کچھ تو اُس کے گلے میں بہا اور زیادہ اُس کی وراچھوں سے نکل کر اُس کی چھاتیوں کو ٹھنڈا کرتا فرش پر گرا۔ اُس نے سویر سے کچھ نہیں کھایا تھا اور جہاں پانی نے اُسے ٹھنڈک دی وہاں اُسے پیٹ کے خالی ہونے کا احساس بھی ہوا۔ اُسے شام کے لئے کچھ اَن پانی کرنا تھا۔

وہ چھوٹے کمرے میں واپس ہوئی جہاں ایک کونے میں کنک سے بھری ہوئی کلھوٹی تھی۔ اُس نے کلھوٹی میں ہاتھ ڈالا تو اُس کی اُنگلیاں کنک پر رکھی پتھر کی ٹوپی پر ٹھہر گئیں جو کنک کے ماپنے کے کام آتی تھی۔ اُس نے یہاں سے ٹوپی بھر کنک نکالی اور پھر دونوں کمروں کے درمیان میں اُس کھلی جگہ پر آ گئی جہاں سے اُسے آسمان دکھائی دیتا تھا۔

اُس نے اوپر دیکھا، شائد وہ جو مرنے کے لئے آیا تھا اُس نے بھی اوپر سے میرے چھپر کو دیکھا تھا۔ اِس ویہڑے کے آدھے حصّے پر چھاؤں کے لئے چھپر پڑا ہوا تھا اور دوسرے حصّے میں ایک جانب ایک بڑے پاٹوں والی چکّی تھی اور اُس کے ساتھ ایک اوکھلی تھی جس کے کونے میں موہنگلی دھری تھی۔ یُوں تو سب لوگ ایک بار ہی کئی دنوں کے لئے آٹا پیس کر رکھ لیتے تھے لیکن پاروشنی اس بارے بڑی وہمی تھی، وہ اپنے کھانے کو ہر روز آٹا پیستی اور کہتی کہ پرانے آٹے کی روٹی کا سواد تو جنوروں کے لئے ہے اور ویسے بھی جن دنوں بڑے پانیوں نے آنا ہوتا ہے اُن دنوں آٹے میں سُسری اور کیڑا بننے لگتا ہے۔ پہلے تو وہ چکّی کی طرف گئی لیکن پھر کچھ سوچ کر اُس نے اوکھلی میں پھونک مار کر کنک اُس میں اُنڈیل دی۔ کبھی کبھار جب وہ باریک آٹے کی روٹی

بنانا چاہتی تھی تو وُہ چکّی کو چھوڑ کر اُسے اوکھلی میں جی بھر کے کُوٹ لیتی۔ پر یہ صرف اُن دنوں میں ہوتا جب وہ رُکھوں کی طرف جاتی، جھیل سے ہو کر آتی، اُن دنوں اُس کے اندر چین کم ہوتا اور اُس کے بازو اور ٹانگیں جیسے پتھرانے لگتے اور تب وُہ اوکھلی میں کنک ڈال کر اُسے موہنگلی سے خوب کُوٹتی اور ہلکی ہو جاتی۔ آج بھی اُس نے کونے میں دھری لکڑی کی موہنگلی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اوپر اٹھایا تاکہ کنک کُوٹ سکے پر سینے پر بندھے اُس کے لیڑے کی پکڑ نے اُس کا سانس روکا۔ اُس نے موہنگلی نیچے رکھی اور اپنے آپ کو سینے کے لیڑے اور لُنگی سے الگ کر لیا۔ یوں اُس کا سانس اور جُسّہ دونوں آزاد ہوئے۔ اُس نے موہنگلی اُٹھا کر سر کے اوپر تک اُٹھائی اور پھر پُورے زور سے اوکھلی میں پڑی کنک پر دے ماری۔ کنک کے چند دانے اوکھلی میں سے نکل کر اُس کی ٹانگوں پر تیز کانٹوں کی طرح آ لگے۔

وُہ موہنگلی کو ایک خاص ٹھہراؤ کے بعد اٹھاتی، اُسے سر سے اوپر لے جانے کے دوران ایک گہرا سانس اندر کو کھینچتی اور پھر اُسے نیچے لاتے ہوئے مُنہ سے سانس نکالتی ہوئی ایک لمبی "ہوئ" کرتی کنک پر دے مارتی۔ موہنگلی کنک پر پڑتی تو ایک گہری "دھم۔۔" کی آواز پیدا ہوتی۔ اور یوں موہنگلی کی۔ دھم۔ اور اُس کے سانس کی۔۔ ہوئ۔۔ مل کر ایک ایسی سُر بناتے جو بستی سے باہر ہو کر رُکھوں تک پہنچتی اور بتاتی کہ یہ پاروشنی ہے جو شام کی روٹی کے لئے کنک کوٹتی ہے۔ ہاں اس میں اِس۔۔ ہوئ۔۔ دَھم۔ میں ایک اور آواز بھی تھی جو باہر نہیں جاتی تھی صرف اندر سنائی دیتی تھی اور یہ کھنک تھی اُس کی کہنیوں تک چڑھے ہوئے کنگنوں کی۔۔ وہ موہنگلی اٹھاتی تو کنگن کھن، کھن کہنیوں پر گرتے اور اُسے کنک پر مارتی تو کلائیوں پر اُن کا بھار گرنے لگتا، ان کی کھنک اُسے پریشان کرتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے آدھے کنگن اتار دیئے، کھنک کم تو ہوئی پر ابھی تھی۔

ہوئ۔۔ دَھم۔۔ ہوئ۔۔ دَھم۔۔

وُہ گھاگرا کی بیٹی تھی اور اُسے ماتی نے پالا تھا۔ اُسے پتہ نہیں تھا پر اُس نے سُن رکھا تھا کہ ایسا ہے۔ ماتی کا گھر والا جب پانیوں کے پار ہوا اور یَم کے کُتّے اُسے اُٹھا لے گئے تو ماتی پانیوں سے باتیں کرنے کے لئے سات دن اور سات رات گھاگرا کے کنارے بیٹھی رہی اور ساتویں رات اُس نے سروٹوں میں ایک بچّے کے رونے کی آواز سُنی۔ وُہ اُسے اٹھا کر گھر لے آئی اور کہا کہ پانی جو زندہ ہوتے ہیں اُنہوں نے اسے جنم دیا ہے اور اب میں اِسے پالوں گی۔ اُس کا نام ایک راہگیر نے رکھا تھا جو کہتا تھا کہ ہری یوپیا ایک بستی ہے جو پاروشنی دریا کے کنارے ہے اور چونکہ اسے

دریا نے جنم دیا ہے اس لئے اسے پاروشنی کہو۔ ماتی کی چھاتیوں میں اتنا دودھ تھا کہ تینوں پُتروں کو رَجھ پلانے کے بعد بھی پاروشنی کے جُثّے کو بڑا کرنے کے لئے بہت تھا۔ اور وُہ بڑی ہو گئی۔

اور جب وُہ اتنی بڑی ہو گئی کہ اپنا کام کاج خود کر سکے تو اُس نے اپنے ہاتھوں سے یہ گھر بنایا اور ماتی سے الگ ہو گئی۔ ایک ہی چھپر تلے چار جوان جُثّے سُکھ سے نہیں سو سکتے۔ اب وُہ بستی کا ایک انگ تھی جس کے ذمّے سویرے سویرے پانی بھرنا تھا اور اپنے حصّے کی زمین کھود کر اُس میں بیج ڈالنا تھا اور بڑے پانی کی راہ دیکھنا تھا۔ سب کی طرح۔ پر اس بار بات اور تھی۔ صِرف وُہ جانتی تھی کہ پانی آ رہے ہیں اور باقی لوگ راہ دیکھ رہے تھے۔

ہوؤ۔۔ دَھم۔۔ ہوؤ۔۔ دَھم۔

ورچن کے ماں باپ بھی کب کے رُکھوں کے اندر جا چکے تھے۔ اور اُس نے اُنہیں ایک بار دیکھا بھی تھا۔ اُنہیں تو نہیں پر اُن کے پنجروں کو۔ جب کوئی بوڑھا ہوتا تھا اور اُس کے ہاتھ پیر جواب دینے لگتے تھے تو جیسے سُوجھ بُوجھ ہوتی تھی وُہ جان جاتا تھا کہ اب اُسے یہ بستی اور یہ سب کچھ چھوڑنا ہے۔ ان گنت دنوں اور راتوں کے بوجھ نے اُس کے جُثّے کو پھوک کر دیا ہے اور اُسے جانا ہے اور ایسے لوگ کسی رات اپنی سروٹ کی چٹائیوں سے اُٹھ کر چُپ چاپ رُکھوں میں چلے جاتے تھے اور پھر وُہیں رہ جاتے تھے۔ اور جو نہیں جاتے تھے یا جن کو یَم کُتّے ٹھنڈا کر دیتے تھے اُن کے لئے پکلی بڑے مرتبان بناتی تھی جن میں ڈال کر اُنہیں زمین میں رکھ دیا جاتا تھا۔ اور یُوں ورچن بھی پاروشنی جیسا تھا، نہ کوئی آگے اور نہ کوئی پیچھے۔

ہوؤ۔۔ دَھم۔ ہوؤ۔۔ دھم

اور سمرو۔۔ وہ بھی ورچن تھا۔ اور ورچن سمرو تھا۔ اور دونوں کے ناموں سے وُہ گیلی ہوتی تھی۔

ہوؤ۔۔ دَھم۔۔ ہوؤ۔

اُسے یوں لگا جیسے باقی جو آدھے کنگن رہ گئے ہیں اُن کی کھنک بڑھتی جاتی ہے، اُس کے ماتھے پر لگتی ہے۔ اور شور بہت ہے۔

اُس کا سارا بدن پسینے میں نہاتا تھا اور جہاں وُہ کھڑی تھی اُس کے پاؤں سے پسینہ گرتا تھا اور زمین میں پیاسی زمین میں گم ہوتا تھا۔ جب بھی وُہ موشکلی کو نیچے لا کر کنک پر مارتی تو پسینے کے چھینٹے اُس کے بدن سے اُڑتے۔

اور شام گہری ہو چکی تھی۔

کنگنوں کی کھنک اب اُس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ اُس نے موشکلی رکھ کر باقی کنگن بھی اُتار دیئے جو پسینے کی وجہ سے پھسلتے ہوئے آسانی سے اُتر گئے۔۔ اب کھنک ختم ہوئی۔ صرف ہوؤ۔۔ دَھم کی آواز تھی۔ اور کوئی شور نہ تھا۔ جو کچھ پہن لو، جتنا پہن لو اتنا زیادہ شور۔۔ کنگن بندھن ہیں جو بندہ آپو آپ پہنتا ہے، اپنی من مرضی سے۔۔ ایک کنگن ورچن ہے، دوسرا سمرو ہے، تیسرا وُہ چیزیں جو بدن مانگتا ہے، چوتھا اچھی فصل، پانچواں اُن چیزوں کی آس جن کے بغیر گزارہ ہو جاتا ہے پر جن کے لئے جی کرتا ہے۔۔ اور یہ سارے کنگن مل ملا کے بازو بھر دیتے ہیں اور بھار ہوتے ہیں اور کھنکتے رہتے ہیں اور شور کرتے ہیں۔

۔۔ جتنے کم ہوں گے شور بھی کم ہو گا۔۔ نہ ہوں گے تو سُکھ ہو گا شور نہ ہو گا۔۔ پر بندہ کون کون سا کنگن اُتارے؟

پاروشنی کا پسینے میں بھیگا ہوا سیاہ جُثّہ بستی میں اُتری ہوئی شام میں بہت دیر تک دکھائی دیتا رہا۔

ہوؤ۔ دَھم۔۔ ہوؤ۔ دَھم۔ ہوؤ۔ دَھم۔۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں وُہ بیٹھتی تھی۔

گاگری جُھک گئی۔ ریتلی زمین پر اُس کے پنجوں کے نشان تھے اور اُن کے بیچوں بیچ اِدھر اُدھر سفید سنہری مائل بیٹ تھی۔ وُہ یہیں واپس آئے گی۔ گاگری سیدھی ہوئی۔

پورا آسمان رُکا ہوا تھا اس لئے کہ اُس سارے میں کوئی شے بھی ہلتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی بس خالی تھا اور رُکا ہوا تھا۔ گاگری نے ایک لمبا سانس کھینچا تو اُس کی ناک کا پوپا لرزنے لگا اور پھر اپنا چھوٹا سا سر گھٹنوں میں چُھپا کر جیسے آسمان کی طرح رُک گئی۔۔ اب اُسے اُڈیکنا تھا۔ اُس کے کانوں نے اُسے بتانا تھا کہ وُہ آگئی ہے۔ اُس کی گردن کے گرد کسی ہوئی ہنسی اُس کے گھٹنوں کو لگی تو اُس نے اپنا ماتھا آگے کر کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

وُہ سویرے سے ہی بستی سے باہر ادھر چلی آئی تھی۔ اِدھر جہاں سے ڈوبو مٹی شروع ہوتی تھی اور جہاں سے اِکا دُکا رُکھ دکھائی دیتے تھے۔ اُسے پہلے تو اُس جگہ کو تلاش کرنا تھا جہاں وُہ بیٹھتی تھی اور اُس کے پنجوں کے نشان اور بیٹ پڑی ملتی ہے اور پھر سانس روک کر بیٹھنا تھا تاکہ وُہ واپس آئے تو اُسے بھی کوئی جھاڑی سمجھ کر نیچے آنے سے نہ کترائے۔ یُوں تو سب لوگ کنک پھلیاں اور پھوگ کا ہی کھانا پینا کرتے تھے اور کبھی مچھلی کا ماس بھی کھا لیتے تھے لیکن اُن کے تالُو میں کبھی کبھار پرندوں کا سواد بھی پُھوٹتا تھا اور ساری بستی میں نِری گاگری تھی جو اُن کو قابو کرنا جانتی تھی۔ ویسے تو نت نئے رنگوں اور نسلوں کے پکھیرو اُن کے چھپروں کے آسمان پر سے اور دریا پر سے گزرتے رہتے تھے اور کبھی اُن میں سے کوئی تھکان سے نیچے آجاتا تو وُہ اُسے ڈھیمیں مار مار کر گرا لیتے۔ پر یہ تو کبھی کبھار ہی ہوتا اور جب کبھی اُن کے تالُو میں سَواد پُھوٹتا تو وُہ گاگری کا مِنت ترلا کرتے کہ دیکھ جب پچھلا بڑا پانی آیا تھا تب تُو نے اُس کا ماس ہمیں کھلایا تھا۔ فصل پکنے پر ہم تجھے ایک ایک ٹوپی کنک دیں گے تو آج پھر اُس کا ماس کھلا دے۔ بستی میں اور بھی ایسی تھیں جن کے مُجسّوں میں پُھرتی پھڑکتی تھی پر یہ صرف گاگری میں تھا کہ وہ ہاتھ

میں ڈنڈا لے کر جب پرندے کے پیچھے لپکتی تو وُہ اُڑان کرنا بُھول ڈنڈے کی چوٹ کھا پھڑ پھڑ اُس کے ہاتھوں میں آجاتا۔ گاگری نے کئی مرتبہ چاہا کہ کوئی دوسرا بھی یہ کام سیکھ لے پر کوئی نہ سیکھ پایا۔ ویسے اُسے پرندے کو مارتے ہوئے کچھ ہوتا تھا، شائد دُکھ ہوتا تھا۔

ہاں گاگری جنگل میں بے ڈرے جاتی تھی اور وہاں جو کُچھ ملتا مار لیتی تھی پر کبھی کبھار پاروشنی وہاں کیا کرنے جاتی تھی؟

وُہ گھٹنوں میں سر دیئے سانس روکے، کان لگائے سُنتی تھی۔

وُہ، اُس کی بھین کواسی اور چھوٹا بھرا گُٹّا بستی کے باقی لوگوں کی طرح کھیت کھود کر اُن کے گِرد کچّی دیواریں اُسار کر اب بڑے پانیوں کی آس میں تھے۔ اُس کی میّا میں اب زور نہیں تھا کہ کھیتوں میں جا کر جُھکے۔ وُہ شائد کسی رات آپو آپ رُکھوں میں جانے والی تھی لیکن آج اُس نے کہا تھا کہ گاگری بڑوں نے کہا ہے کہ اُڑنے والی ذات کے ماس میں گرمی ایسی ہوتی ہے کہ پُرانی اور جھڑتی ہڈیوں کو بھی جوڑ دیتی ہے، تو جا کر ہاتھ پاؤں مار خورے کچھ قابو میں آجائے۔ وُہ جب کبھی اس کام کے کرنے کو ادھر آتی تو کر کے جاتی، کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتی، اُس کی اُنگلیاں لکڑی کے موٹے ڈنڈے پر کسی مکوڑے کی طرح رینگتیں۔

کواسی اُس سے بڑی تھی اور اُس میں آلکس بھی بڑی تھی۔ وہ اپنی چٹائی سے اُٹھتی تو پیٹ بھرنے کو یا خالی کرنے کو، نہیں تو ٹانگیں پھیلائے لیٹی رہتی اور گُٹّا اُس کا جُثہ دباتے دباتے تنگ آجاتا۔ کواسی ایک دو بار بیاہی گئی پر زیادہ دیر نباہ نہ کر سکی اور مرد کو گھر سے باہر کر دیا۔ ادھر یہی ہوتا تھا مرد تو بیج ڈالنے والا تھا۔ اب یہ عورت کی مرضی کہ اُس کے ساتھ لیٹے یا نہ لیٹے اُسے کھانے کو دے یا نہ دے۔ کواسی کی آلکس سے تنگ آکر اب مرد اُس کے پاس سے گزرتے بھی نہیں تھے کہ کوئی کام کہہ دے گی۔ یُوں بھی شائد اُس کے اندر کچھ نہ تھا، جو ہوتا تو بیج پڑنے سے پھوٹتا۔ اب وہ چٹائی پر پاسے پلٹتی گھر میں رہتی۔ میّا کو پیاس لگتی تو اُٹھ کر پانی نہ دیتی، خود بھی بُھوکی پیاسی پڑی رہتی۔ گُٹّا گاگری آتے تو اُن دونوں کا کچھ بندوبست کرتے۔

اور اب وُہ بستی والوں کے تالُو کے لئے اور میّا کی پُرانی ہڈیوں کے لئے گھٹنوں میں سر چھپائے کان لگائے سُنتی تھی۔

وُہ خود تو خالی نہیں تھی، اُس میں بیج پڑا، پُھوٹا اور پھر ختم ہو گیا۔۔۔ اور کس کا بیج۔۔۔ وُہی جس کے اندر بس شک ہی شک ہے۔ جس میں آلکس تو ہے پر اُس کے سَر میں رَت یوں دوڑتی ہے کہ اُس کی بات سب سے الگ ہوتی ہے۔ نہ وُہ کھیت پر جائے نہ کوئی اور کام کرے چیوا

توبس باتیں کرتا جائے سوجھ بُوجھ کی اور اچنبھے کی باتیں۔ بستی میں پانیوں کی بات ہو، کھیتی کی کوئی کہانی ہو، کوئی ایسی انہونی ہو جو کوئی بُوجھ نہ سکے تو سب یہی کہتے تھے کہ چیوا بات کرے گا اور وُہ کرتا اور سب کہتے کہ ٹھیک کرتا ہے۔ اُسی چیوا کا بیج اُس نے پالا، پر جب وُہ باہر آیا تو جہاں اُس کا ناک مُنہ ہونا چاہیئے تھا وہاں بھی ماس تھا۔ ناک مُنہ کی شکل ہی نہ تھی تو وہ سانس کہاں سے لیتا، مرگیا اور گاگری اُسے ایک چھوٹے سے برتن میں دبا آئی اور پتھروں کے راستے میں ایک چھوٹا سا پتھر بھی رکھ آئی۔ چیوا کے پاس وُہ اب بھی جاتی تھی پر جب جُسّہ تنگ کرنے پر آجاتا تھا تب۔

رُکے ہوئے آسمان کے ایک حصّے میں سرسراہٹ ہوئی جو اُس کے کانوں میں آئی۔ اور حرکت کی ایک آواز نیچے اُتری۔ اُس نے دھیرے سے گھُٹنوں سے سر اُٹھایا اور سانس روکے اوپر دیکھا، بھوکڑ تھی۔

وُہ ایک لاپرواہ کیفیت کا آنکھوں میں اُتر جانے والا پرندہ تھا اور آسمان میں ٹوٹتے تارے کی طرح تیزی سے جیسے جلتا ہوا تیرتا تھا۔ اُس کے پھیلے ہوئے پروں پر سفید اور بُھورے دھبّے بھلے لگتے تھے اور گاگری جانتی تھی کہ اب وُہ اُس ریتلے ٹکڑے پر اُترے گی جہاں اُس کی سبزی مائل سفید بیٹ اور پنجوں کے نشان ہیں۔ تب تک اُسے، گاگری کو دم روکے بیٹھنا تھا۔ بھوکڑ کے بارے میں کہتے تھے کہ اس پرندے کو پکڑ کر صرف کھایا جاسکتا ہے اِسے پنجرے میں بند نہیں کیا جاسکتا وہاں یہ مرجاتا ہے، دانہ نہیں چگتا، پانی نہیں پیتا اور مرجاتا ہے۔ ہاں ایسا ہے کہ اُسے بند کرنے والا اگر اُس کی طرف پیٹھ کرلے، اُسے دیکھے نہ تو وُہ کھالیتا ہے۔ وُہ نہیں چاہتا کہ اُس کی مجبوری کو اُسے بند کرنے والا دیکھے۔

بھوکڑ نے خالی آسمان میں دو تین چکّر لگائے اور پھر چونچ نیچی کرکے سیدھی زمین کو آنے لگی۔ گاگری نے کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ وُہ نیچے آئی اور اُس نے اپنے پاؤں آگے کردیئے جیسے اُن کی مدد سے اپنی اُڑان کو روکنا چاہتی ہو اور پھر پَر پھیلا کر زمین پر پنجے اس طرح رکھے جیسے رکھ نہ سکتی ہو اور اُن میں گہرے زخم ہوں اور اُن پر اپنا پُورا بوجھ نہ ڈال سکتی ہو۔ اُس نے اپنی بیٹ کو دیکھا اور پنجوں کے نشانوں کو دیکھا تو اُسے اطمینان ہوا اور وُہ پَر سمیٹ کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔۔

بس یہی وُہ گھڑی تھی۔۔ گاگری کی مہین آنکھیں بھوکڑ پر جمی تھیں، اُس کی اُنگلیوں نے ڈنڈے کو بھینچا، اُس پر سخت ہوئیں اور پھر وُہ اپنے پنجوں سے زمین کو کُریدتے ہوئے یکدم اُٹھی اور بھوکڑ کی طرف لپکی۔ بھوکڑ نے قدموں کی دھمک سُنی تو سُن ہوکر رہ گئی اور پھر آنکھیں

جھپک کر اُڑان کرنے کی بجائے اندھا دھند دوڑنے لگی، گاگری اُس پر دھاوا بولنے کو تیار اُس کے پیچھے اُڑتی چلی گئی۔۔ بہت بھاری بھوکڑ ہے، ساری بستی کے حصّے میں اس کا ماس آئے گا، پکڑ گاگری، مار۔۔ وُہ ڈنڈا اٹھائے اُسے سر پر دے مارنے کو تیار لپکی چلی جارہی تھی کہ بھوکڑ نے اپنی پیٹھ بھینچی اور پھر اُسے یکدم کھول کر بیٹ کی بوچھاڑ گاگری کی آنکھوں کی طرف دے ماری۔۔ اور وُہ اس کے لئے تیار تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بھوکڑ اپنے بچاؤ کو یہی کرے گی اور اُس کی نظریں اُس کی پیٹھ پر تھیں اور جونہی وُہ بھینچی گئی اُس نے جان لیا کہ اب اُس میں سے زہریلی بیٹ نکلے گی اور اُس نے فوراً اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔۔ اور یوں بچاؤ ہوگیا تھا۔

اُسے ہر صورت اب اُس کے سر کے اوپر ہونا چاہیئے تھا ورنہ وہ چند قدم اور دوڑنے کے بعد اُڑان کرجانے کو ہوگی۔ گاگری نے ہانپتے ہوئے سانس اندر کھینچا اور دانت پیستے ہوئے پُورے زور سے بھاگتی اُس کے سر پر جا پہنچی اور اُسی وقت اُس نے پر کھولے اور اُڑان کے لئے اونچی ہونے لگی اور اُسی وقت گاگری نے ڈنڈا ہوا میں بلند کیا۔۔ بھوکڑ کی گردن ڈنڈے کے عین نیچے تھی۔ وُہ بدن کے زور کو ڈنڈے میں لائی اور اُسے نیچے اُس کے سر پر لانے کو تھی کہ۔۔ بھوکڑ رُکے ہوئے آسمان میں تیزی سے تیرتی تھی ایک ٹوٹتے تارے کی طرح۔۔۔

گاگری ہانپتی ہوئی وہیں گر پڑی اور اُس کے پسینے سے نچڑتے جسم پر مٹّی چمٹ چمٹ کر کیچڑ ہونے لگی۔۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، اس بار ایسا کیونکر ہوا، اُسے پتہ نہیں تھا۔ جب ڈنڈا بھوکڑ کے سر پر تھا اور وُہ اپنے پروں کو سمیٹتی اپنے آپ کو بچانے کو بھاگتی تھی تب شائد اُس کے بھاگنے میں کُچھ تھا جو گاگری کے اندر گیا اور وہاں دُہائی دی کہ مت مارو۔۔ اور اُس نے جان بُوجھ کر ہاتھ روک لیا تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ چھاتیوں پر لیڑا نہیں باندھتی تھی کہ وہ بہت چھوٹی اور سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھیں سو اُس نے اپنی لُنگی اُتاری اور اپنے جُسّے کو پسینے اور کیچڑ سے صاف کیا۔ لُنگی باندھ کر وُہ پھر کھڑی ہوگئی۔ تھوڑی دُور ڈوبو مٹّی کے بیچ میں پندرو اپنی دُم جھاڑتا آنکھیں جھپکتا تھا اور اُس کا مٹیالا سُنہری رنگ سویر کی ہلکی روشنی میں نتھرا ہوا تھا اور وُہ جانتا تھا کہ ابھی ابھی جو عورت زمین پر پڑی ہونکتی تھی پارو شنی نہیں گاگری تھی جو جنوروں اور پکھیروؤں کی بیری تھی اور وُہ اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی کیونکہ اُن دونوں کے بیچ ڈوبو مٹّی تھی اور یہ جانتے ہوئے وہ لاپروائی سے دُم کو زیادہ زور سے جھاڑتا تھا اور آنکھیں جھپکتا تھا۔۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے تھوتھنی اوپر کرکے نتھنے پھلائے جیسے ہوا سونگھتا ہو اور ہوا میں کچھ ہو اُس نے ٹانگوں کو جھٹکا اور پھر پلانگیں بھرتا رُکھوں کے اندر چلا گیا۔۔ جونہی پندرو نے

تھوتھنی اُٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھا تھا گاگری کے نتھنے بھی پھڑپھڑائے تھے کہ ہوا میں کچھ ہے۔ پھر اُس نے اپنے بازوؤں پر پُھوٹتے پسینے پر ہاتھ پھیرا تو اُس پر اُنگلیاں پھسلتی تھیں، اُس میں چکنائی تھی۔ پانی برسے گا۔ گاگری نے آسمان دیکھا جو بھوکڑ کے جانے کے بعد اب پھر رُکا ہوا تھا۔ اُس نے ہوا کو اپنے اندر کھینچ کر روکے رکھا کہ شائد کچھ پتہ چلے کہ کیا ہو گا۔ پر وہاں کچھ نہ تھا۔ نہیں جُسّے میں سے چکناہٹ پُھوٹے تو پانی ضرور گرتا ہے، مینہ دُور نہیں ہوتا۔

گاگری پسینہ پونچھتی، کبھی آسمان کو دیکھتی اور اپنے گلے کی ہنسی پر ہاتھ پھیرتی بستی کو چلنے لگی۔ اس کے ڈنڈے کا بھار بہت ہو رہا تھا پر وُہ اُسے اٹھائے ہوئے تھی ایسے کہ اُس کے بغیر جیسے وُہ پُوری نہ ہو۔ اُس کی اُنگلیاں اُس کی گولائی پر تنگ ہوتی تھیں، پھسلتی تھیں اور پھر تنگ ہوتی تھیں اور گاگری کی آنکھیں اُن کے ساتھ بند ہوتی جاتی تھیں اور وُہ اُس نِکے بوجھ کو اٹھائے اُس کی گولائی محسوس کرتی ہانپتی چلتی تھی۔ اُس کے ایک طرف رتّے ٹبّے تھے جن پر پھوگ اور لانا کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ٹیلے سدا وُہیں رہتے تھے جہاں وہ اب تھے، وہاں سے کہیں نہیں جاتے تھے اور دوسری طرف گگّے ٹِبّے تھے جن پر کچھ نہ اُگتا تھا کیونکہ یہ اُگنے یا پھوٹنے سے پہلے اِدھر اُدھر جگہ بدلتے رہتے تھے بھکشو ٹیلے کی طرح۔ ان ٹبوں میں کہیں کہیں پرم ڈنڈی۔ کترن۔ گورکھ پان اور چھپری وغیرہ کی بوٹیاں نظر آتی تھیں۔ چھپری کی سفیدی مائل سبز بُوٹی کا بیج ناک میں پہننے والے بوپے کی شکل کا ہوتا ہے اور اپنے اندر اتنی گرمی اور زور رکھتا ہے کہ مرد اُسے کھا کر پھر سو نہیں سکتا۔ گاگری نے اپنے ڈنڈے پر گرفت مضبوط کی اور چھپری کی بُوٹی کو دیکھ دیکھ کچھ مسکرائی اور چلتی رہی۔ اُس کے مُنہ میں پیاس خشک ہونے لگی، وُہ کترن کی بوٹی کے پاس رُکی اور اُس کے نیچے زمین کو کھود کر اُس کی ایک جڑ نکال لی۔ جڑ کو صاف کر کے اُس نے اُسے مُنہ میں رکھا تو جیسے پیاس کم ہونے لگی اور وُہ اُسے چباتی چلتی رہی۔

پاروشنی نے چٹائی پر لیٹے لیٹے اپنا بازو ہوا میں اوپر کیا تو اُس کے کنگن ایک ہلکے شور کے ساتھ اُس کی کہنی پر گرے۔ کونسا کنگن فالتو ہے؟ اُس کی چھاتیوں کے درمیان جہاں وُہ مل کر ایک ہوتی تھیں وہاں پسینہ اُنہیں بھگوتا تھا۔ پاروشنی نے اُنہیں ہاتھ سے پونچھا اور اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہاں پسینے میں چکناہٹ کا شُبہ تھا۔ پانی۔ بڑے پانی تو آ رہے ہیں، اُسے معلوم تھا لیکن کیا وہ آسمان سے بھی اُتر سکیں گے۔۔ اگر ایسا ہوا تو سب سُوکھا اور خُشک وتر میں آ

جائے گا اور اُس وتر میں جو کچھ ہو گا پُھوٹ پڑے گا۔ ورچن بھی وتر تھا۔ اُس کے بیچ کچھ گرم ہوا اور پھر بہا۔

ہر پاسے دن رات کا عجب چکّر ہے۔ نہ کوئی شے جاتی ہے نہ آتی ہے۔ جو ہوتی ہے وُہی رہتی ہے یا اُس کی جگہ پر اُسی طرح کی کوئی اور آ جاتی ہے۔ رُکھوں میں مور ہیں، ہرن اور سیہے ہیں اور بھینسیں ہیں اور ہمیش سے ہیں۔ ادھر بستی میں ہم سب ہیں اور زمانے سے ہیں۔ ایک جاتا ہے تو دوسرا آ جاتا ہے۔ حیاتی کا یہ چکر کہاں سے چلا یہ پتہ نہیں پر یہ پتہ ہے کہ یہ ختم نہیں ہو گا، بیج اُسے آگے آگے لیے جاتا ہے۔ دریا کے پانی بھی ہمیش اتنے ہی رہتے ہیں، ختم نہیں ہوتے، کم ہو جاتے ہیں اور پھر اتنے ہی ہو جاتے ہیں تو پھر حیاتی تو ہمیش کی ہوئی یہ مٹّی تو نہیں ہوتی۔ رہتی ہے وُہیں پر۔ اور پانیوں میں بسنے والے بھی اتنے ہی رہتے ہیں، مچھلیاں، کچھو، مگرمچھ اور دُوسرے۔ مچھلیاں جو پکلی اپنے گھڑوں اور جھجھروں پر اُلیکتی ہے اور مگرمچھ جو میں سمرو انہی مُہروں پر بناتا ہوں۔ میں بناتا ہوں یا وُہ جنور خود بنتے ہیں؟ میں اگر نہ ہوں تو بھی بنتے جائیں گے۔

اور یہ بڑا پتھر جو گھاگرا کے کنارے پر ریت کے اندر پتہ نہیں کہاں تک دھنسا ہوا ہے اِسے میں تب سے توڑتا آیا ہوں جب سے میرا باوا اتنا تھا جتنا میں اب ہوں اور تب میں دو ہاتھ اونچا تھا۔ اور اُس سے پہلے اُس کا باوا تھا جو اُسے لے کر یہاں آتا تھا۔ وُہ مجھے یہاں لا کر پانی کے پاس بٹھا دیتا اور پھر بانس پر سلمای رسّی سے بندھے ہوئے سخت پتھر کو اس ریت کے اندر رہی اندر پھیلی چٹان پر مارنے لگتا۔ میں، سمرو پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھا رہتا اور وُہ اپنے بازو کا زور اپنے ہاتھ میں پکڑے بانس والے پتھر میں ڈال کر چٹان کو توڑنے میں لگا رہتا۔ اس چٹان کو جسے میں اب توڑ رہا ہوں اور کل کوئی اور سمرو توڑے گا۔ پر میرا تو آگے ابھی کوئی نہیں تو اِسے کل کون توڑے گا۔ میں جو منکے مُہریں اپنے باوا سے سیکھا ہوں دیکھ دیکھ کر تو مجھے اب دیکھنے والا کوئی نہیں تو کل اِنہیں کون بنائے گا۔ نہیں بنائے گا تو۔۔ چٹان کے گرم جسّے میں ایک باریک دراڑ پھیلی جسے سمرو نے اپنا پتھر مار مار کر بڑا کیا اور پھر چٹان سے ایک بڑا ٹکڑا الگ ہو کر اُس کے پاؤں پر آ گرا۔ سمرو کے دانت پاؤں کی چوٹ سے بھنچے پر وہ خوش تھا۔ بس ایک اور ٹکڑا۔ تب میں بہت سارے دنوں تک بڑے سُکھ سے اُنہیں کاٹ کاٹ کر اور بنا کر اُن میں سے منکے اور گہنے گھڑتا رہوں گا۔ آس پاس رُکھوں میں یا اُن کے پار کہیں بھی کوئی چٹان نہ تھی، صرف یہاں

دریا کے ساتھ ریت کے اندر یہ پھیلی ہوئی تھی شائد صرف سمرو کے لئے۔ پہلے سمرو کے لئے جس نے اِسے پہلی بار دیکھا اور آخری سمرو کے لئے جسے شائد وہ دیکھے گی۔ ان دنوں سمرو کے پاس بہت لوگ آتے تھے۔ بستی والے جب بیج ڈال کر ہاتھ بالکل خالی کر کے بیٹھ رہتے تھے تو پھر اُن کا جی ادھر کو آنے کو کرتا تھا اور وُہ سارا سارا دن سمرو کے چھپر تلے بیٹھے رہتے تھے اور اپنی من مرضی کی مہریں اور منکے بنواتے تھے، انہیں گلے میں ڈالتے تھے یا بازو پر باندھتے تھے۔ بازو پر باندھنے کے لئے ہر کوئی مگر مچھ والی مُہر پر سر ہلاتا تھا۔

سمرو کی پیٹھ پسینے سے بھیگتی تھی اور وہ چٹان میں سے اپنا حصّہ توڑنے کو زور لگاتا تھا۔

اس وقت پُورا جُسّہ بھیگ رہا ہے، پر پسینہ ہے زور لگتا ہے تو بھیگتا ہے۔ پر یہ رات کو سوتے میں کیوں بھیگتا ہے؟ میں رات کو کہاں جاتا ہوں اور کیا دیکھتا ہوں کہ میرے لیڑے اور میری چٹائی اُٹھتا ہوں، جاگتا ہوں تو ایسے جیسے دریا مُجھ پر سے گزر کر واپس گیا ہو۔ میں کہاں ہوتا ہوں اور کیا دیکھتا ہوں؟ اور کبھی جو یاد رہے تو پاروشنی کو بتا دیتا ہوں۔ ساری بستی جب نیند میں اُترتی ہے تو کہیں اور جاتی ہے اور دریا پار جاتی ہے اور میں پتہ نہیں ادھر ہی رہ جاتا ہوں جو آنکھیں بند ہونے پر بھی دیکھتا ہوں۔

سمرو کی بھیگی ہوئی پُشت پر ہوا نے ہاتھ رکھا اور اس میں ٹھنڈک تھی۔

یہ ٹھنڈک کچھ زیادہ ہے، سمرو چٹان پر جھکا ہوا تھا اور اُس کے سر میں یہ بات آئی کہ ٹھنڈک کُچھ زیادہ ہے۔ وُہ سیدھا ہوا تو اُس کے پاؤں تلے کی ریت میں نمی تھی اور اور۔ دریا آگے آیا ہوا تھا۔ سمرو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ بڑے پانی؟۔ بس اسی لئے۔ بس اسی لئے۔ آج دریا کنارے کی سُوکھی ریت اتنی گرم نہیں تھی۔ اُس میں نمی تھی اسی لئے۔ اور جو ہوا ٹھنڈی ہو رہی تھی تو اسی لئے کہ دریا پھیل رہا تھا اور وُہ اُس پھیلاؤ پر ہو کر آتی تھی۔ بڑے پانی، انہیں تو آنا ہی تھا۔ اُس نے اپنا بانس اور پتھر ایک طرف رکھا اور جلدی سے چٹان مین سے توڑے ہوئے دو تین بڑے ٹکڑے گھسیٹ کر اُدھر لے گیا جہاں ابھی خشکی تھی اور جدھر پانی نے آنا تو تھا پر ابھی ٹھہر کے۔ وہ واپس آیا اور چٹان کے قریب کھڑے ہو کر اُس نے اپنا زور اور اپنی اُمید آنکھوں میں بھر کر دیکھا۔ ہاں دریا چڑھ رہا تھا۔ اُس پر جھاگ تیرتی تھی اور بڑا پانی آ رہا تھا۔ اُس کے دیکھتے دیکھتے پانی اُس کے پاؤں میں آیا اور پھر آگے آگے ہوتا گیا۔ تب اُسے وُہ بُوٹا یاد آیا جو کل شام پاروشنی کے ہاتھ میں تھا اور وُہ اُسے چُھپاتی تھی اور کہتی تھی کہ یہ دریائی بُوٹا نہیں ہے۔ اسی لئے۔ وہ جانتی تھی۔ کہ پانی آ رہے ہیں اور بتاتی نہیں تھی کیونکہ وُہ بتا نہیں سکتی تھی ورنہ یہ واپس ہو جاتے۔ پاروشنی جانتی تھی۔ اب اگلے تین چار روز میں پانی نے پھیلنا تھا جیسے بیج پیٹ میں پھیلتا ہے اور پھر کھیتوں میں اور وہاں سے ڈوبو مٹّی پر جو سخت ہونے کو تھی پر اب پھر کیچڑ میں بدلے گی اور پھر اسے رُکھوں میں جانا ہے اور جھیل تک پہنچنا ہے۔ اب جھیل تک پانی جاتے ہیں یا نہیں جاتے۔۔۔ یہ پتہ نہیں۔ پاروشنی جانتی ہے پر اُس نے کبھی جھیل کی بات نہیں کی۔ اور ان پانیوں نے پھر پانچ چھ روز رُکا رہنا ہے اُس جگہ جہاں وُہ ہوں گے اور اُس کے بعد پچھلے پاؤں پھر واپس آنا تھا ادھر دریا کے اندر۔ کھیتوں کے گرد کچّی دیوار بس کچھ دن اور اُسے روکے رکھیں گی اور پھر وُہ زمین میں چلے جائیں گے اور بس وَتر نے باقی رہنا تھا اور مٹّی کی تہہ نے جو بیجوں کو ڈھک کر اُنہیں گرم کرتی ہے۔

سمرو نے دریا پر ایک بہتی نظر ڈالی۔ اُس کا جی چاہا کہ اُس سے کُچھ کہے۔ پر کیا کہے؟۔ اور پانی اُس کے قدموں میں بچھ رہا تھا۔

کترن بُوٹی کی جڑ گاگری کے مُنہ میں نرم ہوتی تھی پر اُس کی ٹھنڈی باس ناک میں جا کے پُورے جُسّے میں پھیلتی تھی۔

بستی سے دو کرو اُدھر چیوا کا چھپّر تھا اور چھپر کے آسے پاسے اُس کی بھیڑیں اور بکریاں زمین پر تھنے پُھلاتی منہ مارتی تھیں۔

چیوا چھپّر میں ہو گا۔

آلکس کا مارا ہوا اور کہاں ہو گا۔ گاگری کی ہتھیلی میں پسینہ تھا اور اسی لئے وُہ ڈنڈے کو اچھی طرح پکڑ نہ پاتی تھی اور وُہ پھسلتا تھا اور گاگری اُس کو جانے نہ دینا چاہتی تھی اور دو کرو اُدھر بستی میں اُس کی میّا مُنہ میں بھوکڑ کا سواد لئے اُس کی راہ دیکھتی تھی اور بھوکڑ جو تھی وُہ رُکے ہوئے آسمان میں تیزی سے تیرتی جاتی اب جانے کہاں تھی اور بستی کے دُوجے سارے لوگ بھی آج روٹی ٹکّر بھول بھوکڑ کا شوربہ بنانے کو ہانڈیاں چولہوں پر رکھے اُپلوں میں پھونکیں مارتے ہوں گے اور اُن سب کو پتہ تھا کہ گاگری جب آئے گی تو خالی ہاتھ نہیں ہو گی پر آج وُہ تھی اور وُہ نہیں جانتے تھے۔ اور وُہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیسے ہو گیا ہے کہ ڈنڈا اُس کے سر پر تھا اور وُہ اُس سمے مہامیّا تھی جو بھوکڑ کا سانس اُسی دم مار کے ختم کر سکتی تھی یا۔۔ ہاں ایسے ہی ہوا تھا اس کے اندر مہامیّا نے کہا تھا کہ جانے دے اور اُس نے جانے دیا تھا۔ اُسے یہ بھی پتہ تھا کہ وہ آج کے بعد کسی پرندے کو کبھی نہیں مارے گی۔

چیوا کی آنکھیں نیند سے موٹی ہوئی تھیں اور بند ہوتی تھیں اور وُہ اپنے چھپر سے باہر کھڑا کب

سے گاگری کو اپنی طرف آتا دیکھ رہا تھا جو جانے کب سے آسمان کو گھورتی تھی اور دیکھتی تھی اور اُس کے ہاتھ میں وُہ ڈنڈا تھا جس سے وُہ پرندوں کو کُوٹ کر گھر لاتی تھی۔

"آج آسمان خالی ہے۔"

گاگری ایک سیہے کی طرح ٹھٹکی "ہاں ـــــ"

"تو ادھر کیا کرتی ہے۔۔ کیا دیکھتی ہے۔ کچھ مارنے کو جاتی ہے؟"

"نہیں۔۔" گاگری نے چیوا کو دیکھا جس کی آنکھیں نیند سے موٹی ہوتی تھیں اور بند ہوتی تھیں اور گاگری کی آنکھوں کو بھی کچھ ایسے ہی ہوا "میں گئی تھی پر آ گئی ہوں"

"خالی ہاتھ؟"

گاگری پھر ٹھٹھکی جیسے جنگلی بلّے کے دانت اُس کی سانس کی نالی میں گڑ گئے ہوں۔ اور چیوا نے جانا کہ گاگری آج وُہ نہیں جو پہلے تھی اس لئے وُہ چُپ رہا اور وُہ بھی چُپ رہی اور پھر وُہ آسمان کو دیکھتی رہی اور دیکھ کر نظریں جھکا کر کہنے لگی "چیوا! تو جانتا ہے کہ میں نے بہت ساری بھوکڑیں ماری ہیں پر اُن سب کا مُجھے کُچھ پکّا پتہ نہیں ہوتا تھا کہ میں اُن کو مار لُوں گی یا نہیں، یہی ہوتا تھا کہ بس وہ قریب ہے اب اگر ڈنڈا دے ماروں تو شائد لگ جائے۔ پر آج یہ ہوا کہ جس طرح میں جانتی ہوں کہ ہم سب کو اور مُجھ کو بھی ایک روز یَم کے کتّے لے جائیں گے اور یہ خالی پنڈا برتن میں بند مٹّی میں دبے گا تو بس اسی طرح میں یہ بھی جانتی تھی کہ ڈنڈا اُس کے سر پر ہے اور اگر میں ماروں تو وُہ مرے گی۔ ضرور مرے گی۔ اور اُس کے پَروں میں بھی موت کا خوف تھا وُہ اس طرح اُنہیں پُھلاتی بھاگتی تھی۔۔ تو میں نے اُسے نہیں مارا"۔

گاگری سروٹ کی چھت والے چھپر کے اندر چلی گئی۔ اور لیٹ گئی۔

"جونسا جنور بوجھ اُٹھاتا جائے سہارتا جائے بس سبھی اُس پر بوجھ، ڈالتے ہیں۔ کواسی میّا اور گُٹّا اپنے اپنے بوجھ مُجھ پر لادتے ہیں۔ چل گاگری چل۔ اور گاگری سر جھکائے چلتی رہتی ہے"

"میرا بوجھ بھی؟"

"نہیں تیرا بوجھ تو میں آپو آپ مانگتی ہوں کبھی کبھی۔ ہاں بس یہیں رہ جہاں اب ہے، ادھر اُدھر مت ہو، بس یہاں۔۔ چیوا اِس گھاگرا کنارے اور بستیاں بھی تو ہوں گی؟"

"ہاں۔ میں چھوٹا تھا تو بھیڑوں کے پیچھے پیچھے گیا تھا اور گُم ہو گیا تھا تب میں نے ایک اور بستی دیکھی تھی۔"

"اور اُس بستی سے پرے۔"

"تجھے کیا کہ اُس بستی سے پَرے کوئی اور بستی ہے یا نہیں۔ تجھے کیا"۔

"چیوا یہ سارا کھیل گھاگرا کے کنارے پر ہی ہے یا کہیں اور بھی ہے۔ کہاں ہے؟۔ اور کہیں ہو گا تو سہی۔ نہیں اِدھر۔ مُجھے اچھا لگتا ہے"

"تو بھی یہیں رہ۔ اونچی۔ یہ کھیل تو بہت جگہ ہو رہا ہے اُدھر سپت سندھو کی طرف، وہاں شتدری ہے، سندھو ہے، پاروشنی ہے۔"

"پاروشنی؟"

"ندی ہے۔ اُدھر ہری یوپیا کے پاس۔۔ جہاں جہاں ندیاں ہیں وہاں وہاں ہم جیسے لوگ ہیں جو زمین کھود کر بیج ڈالتے ہیں اور پانی کی اُڈیک میں بیٹھے رہتے ہیں اور ساری حیاتی یہی کرتے رہتے ہیں اور پھر اُس برتن میں جو اُن کی اُڈیک میں ہوتا ہے جا گرتے ہیں۔ سارا پانی کا کھیل ہے۔ مہامیّا بھی پانی بِنا ہری نہیں ہوتی۔"

"اور جہاں پانی نہیں ہوتا؟"

"وہاں تو بس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یَم کے کتّے ہوتے ہیں یا زمین کے اندر رینگنے والے مکوڑے کِرلے اور ڈنک بچھّو۔ پانی بغیر کیا ہو گا۔ تیرا پانی آیا؟"

"نہیں ابھی نہیں۔ ہوں۔۔۔"

چیوا کی ہانپتی پُشت پسینے سے نچڑتی تھی جو گاگری پر گرتا تھا۔

چھپر کے اندر، یہاں وہاں جو دھوپ کی کرنیں اندر آتی تھیں وہ مدھم ہوئیں اور پھر تھوڑی دیر بعد ہولے ہولے بادل بولنے لگے جیسے دریا کے بہاؤ پر کان لگاؤ تو وُہ بولتا ہے۔

"ڈوبو مٹّی پر کھڑے ایک چتکبرے ہرن نے تھوتھنی ہوا میں اُٹھا کر جیسے سُونگھا تھا تو میں جان گئی تھی اور جیسے میرے پنڈے میں سے چکناہٹ نکلتی تھی تو میں جان گئی تھی کہ پانی آئیں گے۔ برسیں گے۔ ہاں پانی بغیر تو کُچھ نہیں ہو سکتا۔ میں بھی اگر اندر سے سُوکھ جاؤں تو پھر تُو کیا کرے، کُچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ پر اب میرے پانی آنے کو ہیں۔"

بادل ہولے ہولے بولتا ہوا جیسے یکدم چھپر کے اندر آ کر گرجنے لگا۔

"ہاں۔ آں۔ پانی آ رہے ہیں۔ آ رہے ہیں۔ اور آ گئے۔۔ ہُوں۔ اور میرے ماتھے پر جو بوند گری ہے وُہ تمہارے پسینے کی نہیں، پانی کی ہے جو باہر برس رہا ہے۔"

باہر پانی برس رہا تھا۔

"بس ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ میرے اندر اور چھپّر کے باہر اور میرے ماتھے پر جو بوندیں

گرتی ہیں۔ چیوا۔۔ "گاگری اُسے دھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئی" پتہ ہے میں نے بھوکڑ کو کیوں نہیں مارا؟ جب ڈنڈا اُس کے سر پر تھا اور وُہ اُس کے پرّوں میں بھی موت کا خوف تھا وُہ اس طرح اُنہیں پُھلاتی میرے آگے آگے بھاگ رہی تھی تب میں اُسے مارنے لگی تو وُہ مُجھے میرا ساپن دکھائی دی۔ جیسے وُہ اپنے ہاتھ پاؤں پر میرے گھر میں بھاگتا پھرتا تھا۔ جب میں اُس کے پیچھے جاتی تھی تو وُہ کلکاریاں مارتا آگے آگے بھاگتا تھا۔ میں اپنے اور تمہارے ساپن کو ڈنڈے سے کیسے مار دیتی۔ کیوں چیوا؟"

باہر مینہ دھاروں دھار برس رہا تھا اور بڑے پانی دریا سے نکل کر کھیتوں میں پھیلتے تھے اور یہی پانی چیوا کے چھپر میں بھی دبے پاؤں داخل ہوئے جہاں گاگری پہلے سے ہی بھیگتی تھی، اندر سے بھی اور باہر سے بھی اور شائد سب سے زیادہ پانی اُس کی آنکھوں میں تھے جو ان سے ڈوب رہی تھیں۔

چھپر کی چھت برستا پانی چُوس رہی تھی اور سُروٹ کا سُنہرا رنگ نیم سیاہ ہو کر ہولے ہولے پھیل رہا تھا۔ پاروشنی کی آنکھیں چھپر کے اُس حصّے کو تکتی تھیں جو گیلا ہو ہو کر اب ٹپکنے کو تھا۔ وُہ سر کے نیچے کنگنوں والا بازو رکھے اُسے دیکھتی رہی اور برستے پانیوں کا شور سنتی رہی۔ یہ شور گلی میں بہت تھا کیونکہ وہاں پانی کھڑا ہو چکا تھا اور مینہ اُس پر برستا تھا اور یہ شور ویہڑے میں ابھی کم تھا کیونکہ لیپا پوتا ہوا فرش جس میں اگرچہ چیکنی مٹّی تھی پانی کو شتابی سے چُوستا جاتا تھا۔ اُوپر سُروٹوں کی چھت پر تو وُہ جیسے بے پاؤں چلتا تھا، بس ہولے ہولے اُس میں گرتا اور پیاسے ہونٹوں کی طرح چُوستا جاتا اور پاروشنی اُس کے نیچے لیٹی کنگنوں والے بازو پر سر رکھے اُسے دیکھ رہی تھی۔

سویرے گاگری بھوکڑ مارنے کو گئی تھی اور بول کر گئی تھی کہ لاؤں گی پر لائی نہیں۔ پہلے تو ایسا نہیں کرتی تھی۔ آج کدھر چلی گئی؟ پر اُس کے پاس تو کُوٹی ہوئی کنک کے دو ٹوپے ابھی رکھے تھے بھڑولے کے اندر، پانی اور گیلاہٹ سے پرے۔ اُسے کیا کہ گاگری آئی کہ نہیں۔ پر وُہ آئی کیوں نہیں۔ چیوا کے پاس رہ گئی شائد۔۔ چیوا جس نے اُسے دو جی وئیے تھے۔ ایک تو آیا اور بنا سانس چلا گیا اور دُوجا اُس کے ویہڑے میں کھیلتا رہا اور پھر ایک سویر وُہ نیلا ہوا پڑا تھا۔ اُس کے سر میں چوٹ تھی جیسے کسی نے اُسے ڈنڈے سے مارا ہو۔

پاروشنی کی ننگی پُشت میں چٹائی دُکھنے لگی تو وُہ پاسا پلٹ کر اوندھی ہو گئی اور کنگنوں والا بازو

سر کی بجائے گالوں کے نیچے رکھ لیا۔ اب وُہ چھت کی بجائے ویہڑے میں برستی بارش اور گیلی زمین کو دیکھتی تھی اور اُس کی باس اُس کی چپٹی ناک میں آتی تھی۔

اُدھر بڑے پانی آجائیں اور ادھر ساتھ میں اوپر سے بھی برس پڑیں تو زمین تو پیچ گئی، اتنی پیچ گئی کہ کہیں سے کھودتے چلے جاؤ، اور جہاں تک کھودو وہاں تک نمی ہو۔ تب بیج کیوں نہ پُھوٹے۔ اب کے سارے بیج پُھوٹ پڑیں گے، کنک، مٹری، کُسنبہ۔ بڑے پانی کھیتوں میں داخل ہوتے تو ساری لوکائی بستی کو آجاتی، اپنے ڈیرے چھوڑ کر وُہ واپس اپنے چھپروں تلے آجاتے اور پھر وُہیں تب تک بیٹھے رہتے جب تک کہ پانی ڈوبو مٹّی سے پرے رُکھوں کے اندر جا کر پلٹ نہ آتے اور واپس دریا میں نہ اُتر جاتے۔

یہ آلکس اور آرام کے سمے ہوتے۔ نہ کوئی کھیتوں کو جاتا اور نہ دریا میں اُترتا۔ ڈوبو مٹّی یُوں بھی تازہ پانیوں میں ڈُوب کر بالکل پانی ہو جاتی اور اُس کے پکّے راستے بھی نرم پڑ جاتے، اُدھر کوئی نہ جاتا۔ ادھر گلیوں میں اور باہر کھیتوں کے آس پاس پانی گھٹنوں تک آجاتا اور جب اُترتا تو پاؤں کیچڑ میں دھنستے۔ سب لوگ آلکس سے اپنے اپنے گھروں میں آنکھیں موندے ویہڑوں کے چھپروں تلے لیٹے رہتے کیونکہ اندر کوٹھڑیوں میں تو نرا گُماں ہوتا، ہوا گم اور اُس میں سانس خالی خالی۔ بڑے پانیوں کے ساتھ مینہ برسنے لگتا تو پھر لوگ بالکل ہی بند ہو جاتے۔ عورتیں مرد ذات سے پرے ہو کر بیٹھتیں کہ ان دنوں پنڈے چکنے ہو ہو جاتے تھے اور کام کاج کے بغیر دھیان بس اسی طرف جاتا۔

ننگی پیٹھ پر پانی کی ایک بوند گری اور اُس کا ایک حصّہ اُس کے کُولہوں پر سے دھیرے دھیرے ایک گیلا راستہ بناتا نیچے اُترا اور اُس کی کمر تک پہنچتے ہوئے ختم ہو گیا اور دوسرا حصّہ دوسری طرف سوچ سوچ کے اُترا اور دونوں پاٹوں کے بیچ میں جذب ہونے لگا۔ پاروشنی کو اچنبھی سی ہوئی اور اُس نے بدن کے اُس حصّے کو ایسے ہلایا جُلایا جیسے کان میں پانی پڑ جائے تو سر کو ہلاتے ہیں۔ اُوپر چھپر، پیچ گیا تھا اور اب اُسے ٹپکتے رہنا تھا۔ اُس کے بازو اور کولہے کی ہڈیاں دُکھنے لگیں اور وُہ پھر سیدھی ہو کر لیٹ گئی اور چھپر کو تکنے لگی جس میں سے اب بار بار پانی ٹپکتا تھا، اُس نے اپنا مُنہ کھولا اور تھوڑی دیر بعد ایک بوند کو گلے میں گرتے محسوس کیا۔۔۔ ورچن جانے آتا ہے کہ نہیں؟ گھاگرا کی اِس بستی اور اُدھر سندھو کے ساتھ جو بڑی بستیاں ہیں ان کے درمیان تو کئی چاند چکروں کی مسافت ہوگی اور ان کے راستے میں جانے کیا کیا تھا جو ہم نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے وہ

راستے میں کہیں رہ گیا ہو اور اب کہیں ریت میں گلتا ہو یا مٹی میں دبا مٹی ہوتا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے اُس نے وُہیں کسی بستی میں ٹِک رہنے کا سوچ لیا ہو اور وُہ گھاگرا کو بھول چکا ہے۔ وُہ بھلکڑ تو تھا، ایسا ہی تھا۔ سمرو اور وُہ بڑے بیلی تھے اور وہ اُن دونوں میں فرق نہ کر سکی۔ اُس کو پکّا پکّا اندر سے سندیسہ نہیں آتا تھا کہ ان دونوں میں سے وُہ کون ہے جو اُسے چاہیئے۔

ورچن یا سمرو۔ سمرو یا ورچن۔ کس کے دیکھے سے اُس کا پنڈا ہولے سے تپتا ہے اور بیچ میں وُہ نرم ہوتی تھی۔ کس کے دیکھے سے۔ اور وُہ فرق نہ کر سکی۔ یُوں تو اُس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو فرق کرتی بھی نہ دونوں کو دیکھ لیتی، دونوں اُس کے گھر والے ہو جاتے اور ایسا ہوتا چلا آیا تھا پر پاروشنی فرق کرنا چاہتی تھی۔ پھر ورچن نے پوٹلی باندھ لی۔ وُہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ جیسے ساری بستی پانی کے دنوں میں گھروں میں بیٹھ جاتی ہے اور لوگ سوتے ہیں کھاتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔ وُہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وُہ چلنا پھرنا چاہتا تھا اور تبھی وُہ پانی کے دنوں میں بھی باہر نکل جاتا۔ اُس کے تلووں میں کھُجلی تھی جو اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ اُدھر کبھی کبھار تیرڑی واس آتے جو گھر نہیں بناتے اور سدا سفر میں رہتے ہیں۔ وُہ اپنی چیزوں کے بدلے بستی والوں سے کنک اور منکے لیتے تھے۔ ان کے ڈیرے پکّی کے آوے کے پاس والے رڑھے میدان میں ڈالے جاتے اور ورچن اُن کے پاس کھنچا چلا جاتا اور پھر وُہیں کا ہو رہتا۔ ادھر ہی اُن کے پاس ہی رہتا۔ اُن کے چلے جانے پر بھی وُہ جلی ہوئی لکڑیاں اور راکھ کو دیکھتا رہتا اور کئی دن اُسی میدان میں پڑا رہتا اور پھر پاروشنی اُس کے پاس جا کر کہتی "چل" اور وُہ لیڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ بستی میں آکر بھی وُہ کئی کئی دن چُپ بیٹھا رہتا، زبان نہ ہلاتا اور پھر کسی دن اُسے کہتا "دیکھ پاروشنی، رُکھوں۔ جنوروں اور پانیوں میں ہماری طرح ہی سانس ہے اور جان ہے پر وُہ ہماری طرح اپنی من مرضی سے چل پھر نہیں سکتے۔ تو ہم جو چل پھر سکتے ہیں ہمیں ایک جگہ ایک بستی میں ایک کنارے پر نہیں بیٹھنا چاہئے، چلنا پھرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے۔ پتہ نہیں کیا کیا ہے دیکھنے کو اور ہم نہیں دیکھتے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" اور پاروشنی کہتی "تو دیکھ۔ دیکھ پر یہ بھی دیکھ کہ جنور بھی اپنے جنگل سے، اپنے چارے کی جگہ سے دُور نہیں ہوتے، رُکھ اور بُوٹے بھی اپنی زمین میں اپنی جگہ میں ہی ہرے رہتے ہیں چلتے پھرتے نہیں تو بندے نے ضرور چلنا پھرنا ہے، نہیں ورچن ہم، جنور اور رُکھ اور بُوٹے سب ایک دوجے کے پاس پاس رہیں تو جیتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی دُور ہو جائے تو باقی کے سانس کم ہو جاتے ہیں۔ یہ سارے باٹ ہیں ہم جنور اور رُکھ اور بوٹے مل کر برابر رہتے ہیں نہیں تو ایک کے دُور ہونے سے ہلکے ہو جاتے ہیں اور ہمارا بھار نہیں رہتا۔ ہم جنور اور رُکھ اور بُوٹے۔۔ مینہ زور کا ہو گیا۔

چھپّر میں سے بوندوں کی بجائے پانی کی ایک موٹی دھار گرنے لگی اور پاروشنی اُس سے بچاؤ کے لئے پاسا پلٹ کر پرے ہو گئی۔

"بندہ بھی گُتن کرنے جوگا نہ رہے تو گھاس پھونس اور سروٹ ہو گیا، کسی نہ کام کا، کسی نہ کاج کا۔" دُھروا نے پیشاب ملے گوبر پر گرتے پانی میں اُٹھتی سفید سفید بھاپ میں اُکھڑا ہوا سانس لیا اور بیلوں کی جانب دیکھا جو بارش سے مُنہ موڑے ایک بڑی کوٹھڑی میں بیٹھے جوگالی کر رہے تھے۔

بڑے پانی دریا سے باہر آکر جب پھیلتے تو بیلوں کے اِس باڑے تک پہنچنے میں ایک دن یا ایک رات لگاتے اور جب یہ کوٹھڑیوں میں داخل ہوتے تو بیل ہنکارتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے جیسے اُن پر کسی دشمن نے حملہ کر دیا ہو۔ وُہ پانی میں پاؤں مارتے، دُمیں گھُماتے اور ایک دوسرے کو اپنے جُثّوں سے دھکیلتے کہ شائد ایسے یہ پانی اُن کی کوٹھڑی سے نکل جائیں اور وُہ ایک مرتبہ پھر صاف اور سوکھی زمین پر بیٹھ کر اپنی ہی لید میں دُمیں چلا سکیں۔ اتنے میں دُھروا بھی اپنی لنگی سر پر باندھے زور لگاتا اور پانی کو مُشکل سے دھکیلتا اندر آجاتا اور اُسے دیکھ کر وُہ سب شانت ہو جاتے اور آرام سے کھڑے ہو جاتے۔ اور اگلے چند روز اسی حالت میں کھڑے کھڑے گزار دیتے۔ ہاں اِس بار پانی اتنا چڑھا نہیں تھا اور وُہ کھڑے رہنے کی بجائے اس میں بیٹھ گئے اس طرح کہ اُن کی تھوتھنیاں اور ریڑھ کی ہڈیاں پانی میں سے اُبھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

"گھاس پھونس اور سروٹ۔" دُھروا نے جانے کیوں غُصّے سے تھوکا۔ وہ دیوار کے ساتھ پکّی اینٹوں کے ایک چبوترے پر بیٹھا پانی کی اُس چمکتی چادر کو دیکھ رہا تھا جو دریا میں سے نکل کر پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ وُہ جانے کب کا اس باڑے کی رکھوالی کر رہا تھا۔ کب کا؟ اُس نے اپنے آپ سے پُوچھا۔ پتہ نہیں کب کا! اُس نے سر ہلایا۔ گھاس پھونس کا کیا ہے کب سے پڑا ہے۔

اُس کے بیج میں سے کوئی پچتا نہ تھا۔

ہر برس ناگری اُس کا بیج رکھتی، بال بچے کی آس لگتی اور جو کچھ بھی ہوتا، پیدا ہوتا اور مر جاتا۔ جیسے بیج میں سے کونپل پھُوٹے اور پھُوٹتے ہی جُھلس جائے۔ کئی برس تک یہی ہوا۔ اور پھر وُہ گھاس پھونس ہونے لگا، کبھی کچھ ہو جاتا اور اکثر کچھ نہ ہوتا اور یہ وُہی دن تھا جب وُہ بالکل رہ گیا تو ناگری نے اُسے کہا تھا، دُھروا تو اب گھاس پھونس ہو گیا سروٹ ہو گیا، مرد نہ رہا۔ اور وُہ اُٹھ کر چلی

گئی اور پھر نہیں آئی۔

بہت دن ہوئے اور بہت راتیں گزریں اس بات کو، دُھروا نے بارش سے بھیگی ہوئی داڑھی کو ہتھیلی سے ٹھوڑی کے ساتھ جمانے کا چارا کیا۔ اب تو اُسے ناگری اور اپنے گھر میں ہونے والے بچّوں کی شکلیں بھی یاد نہ تھیں صرف بیلوں کی تھوتھنیاں اُس کے سامنے آتی تھیں، بیل جو لیٹے رہتے اور جوگالی کرتے رہتے۔ چارے کا بندوبست سب کا سانجھا تھا پر اُسے کاٹ کر بیلوں کے آگے ڈالنا دھروا کا کام تھا اور اُن کی لید کو صاف کرنا اور اگر وُہ ڈھیلے پڑ جائیں تو اُن کو خاص بُوٹیاں کھلا کر پھر سے ہٹا کٹا کرنا یہ سب اُس کا کام تھا۔

مہینے میں ایک آدھ بار کوئی اپنی گائے کو آگے لگائے آ جاتا۔ "دُھروا" اور دُھروا فوراً کہتا "لو بھلا میں تمہارا کام نہ کروں گا۔ ادھر لے آؤ۔ یہاں پر اِدھر"۔ وُہ فوراً باڑے کے اندر جا کر ایک نظر سب بیلوں پر ڈالتا اور اُن میں سے ایک کی پُشت تھپکتا۔۔ "اور وُہ اُسے چمکارتا ہوا باہر لے آتا۔ اکثر تو یہ ہوتا کہ گائے والا اور دھروا دُور ہو کر بیٹھ جاتے اور بڑے پانی، ڈوبو مٹّی میں ڈوبنے والوں یا گاگری اور پاروشنی کے جُثوں کی باتیں کرتے رہتے پر کبھی ایسا ہوتا کہ بیل تھوتھنی اُٹھائے کھڑا رہتا۔۔ اُسے دلچسپی ہی نہ ہوتی تب دُھروا کا تجربہ کام آتا "اور وُہ اپنے ہاتھ سے سب کچھ نپٹا دیتا "لو بھئی اب کچھ ہونے پر دُودھ کی ٹوپی مجھے بھیج دینا"۔ وُہ یہ کام پُوری توجہ سے کرتا اور جب یہ کام ہو رہا ہوتا تو وُہ بڑے اطمینان سے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتا، اپنے ہونٹوں کو چُوستا اور عجیب نظروں سے مصروف بیل کو دیکھتا جاتا اور انجانے میں ہولے ہولے ہلتا جیسے وُہ اُس سمے گھاس پھونس اور سروٹ نہ تھا۔ اور جب زیادہ دن بیت جاتے اور کوئی اپنی گائے کو لے کر نہ آتا تو دُھروا جیسے سُست ہو جاتا، اور بوڑھا ہو جاتا، وُہ آنکھیں موند کر اونگھتا رہتا۔ بستی والے چارے کے گٹھے دیوار کے ساتھ لگا کر چلے جاتے اور وُہ اونگھتا رہتا۔

"دُھروا" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "تو کیا اور تیری حیاتی کیا۔ تجھ سے یہ جنور اچھے جن کی تُو رکھوالی کرتا ہے"۔

اُس نے اپنے بیٹھنے کو جو پکا چبوترہ بنا رکھا تھا وُہ دس اینٹ اُونچا تھا۔ پانی آنے پر وُہ اُس پر چڑھ کر بیٹھ جاتا۔ اُس نے ذرا آگے ہو کر نیچے دیکھا، اس بار پانی پچھلے برس سے ایک اینٹ نیچے تھا، شائد ابھی چڑھے گا۔

"دُھروا" اُس نے پھر اپنے آپ سے کہا "تجھے کئی راتوں سے یم کے کُتّے دکھائی نہیں دیتے۔ کیوں دُھروا؟"

وُہ اُن کُتوں کی شکلیں بھی پہچاننے لگا تھا۔ کئی برسوں سے وُہی دکھائی دیتے تھے اور سب کو پتہ تھا کہ وُہ اُسے کسی نہ کسی دن اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پر اُسے پریشانی تھی کہ وہ گئے کہاں۔ رات کو سوتے میں دکھائی کیوں نہیں دیتے۔

"دُھروا۔ تو گھاس پھونس اور سروٹ ہو گیا، کسی نہ کام کا، کسی نہ کاج کا۔" اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور دریا کی طرف سے بچھی آتی پانی کی چادر کو دیکھا جو اُسی کی جانب بڑھتی آتی تھی اور جس پر مینہ برستا تھا اور بُوندیں سوراخ ڈالتی تھیں۔

وُہ تینوں مُنہ کھولے، ایک دوسرے میں پروئے ہوئے اس طرح سوتے تھے کہ الگ الگ نہیں لگتے تھے کوئی دریائی جنور لگتے تھے جو چھ ٹانگوں اور چھ ہاتھوں والا ہے اور خشکی پر آکر سو رہا ہے۔ ماتی اُن کے پاس بیٹھی بیل کی پُونچھ سے اُن پر بیٹھنے والی برساتی مکھیاں اُڑاتی تھی جو اُڑتی کہاں تھیں اُن کے جُثوں سے چپکی رہتی تھیں۔ ماتی کی شکل وجہ پر کہیں کوئی رنج تھا یا دُکھ کی کالک تھی جو اُس کے مہاندرے کو سیاہ کرتی تھی۔ ماسا کا بھیگا ہوا سر جب اُس کے ویہڑے کی دیوار پر دکھائی دیا تو وہ اندر ہی اندر جان گئی کہ کچھ ہوا ہے۔

"کیا ہوا ماسا؟"

بُوڑھا ماسا بستی کا باسی نہ تھا، اب نہ تھا شائد کبھی تھا پر کسی کو پتہ نہ تھا۔ اگر وہ تھا تو کب تھا۔ بہت پہلے کی بات ہے کہ وہ کبھی اُدھر آ نکلتا اور کنک اور جوار مانگ تانگ کر چلا جاتا پر یہ بہت پہلے کی بات تھی۔ اب وُہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا تھا، پتہ نہیں وہ کہاں تھا اور پتہ نہیں وہ تھا بھی یا نہیں۔ کُچھ پتہ نہیں۔ ایک بار پاروشنی نے اُسے رُکھوں کے اندر جنوروں کی طرح کُودتے دیکھا تھا اور اُس نے اُسے بُلایا تھا "مامن ماسا۔ مامن ماسا" پر ماسا نے شائد سُنا نہیں یا اُس سمے وُہ کچھ اور تھا ماسا نہیں تھا۔ اور ایک بار پھر جب وُہ جھیل سے لوٹتی تھی اور پیپل اور املی کے رُکھوں کی چھاؤں میں چلتی تھی تو ایک اور چھاؤں اُس کے اُوپر اُوپر چلی اور یہ ماسا تھا ایک رُکھ سے دوسرے پر کُودتا ہوا اور وُہ کہتا تھا "سُن پاروشنی۔۔۔ تو جب نہیں تھی تو میں بھی بستی میں رہتا تھا۔ پھر میرے جی میں چلنے پھرنے کی خواہش آئی۔۔۔ اُس بستی سے پرے، اِس جنگل کے پار جانے کو جی چاہا کہ دیکھوں پار جا کر کیا دِکھتا ہے، اُدھر کیا ہے اور میں چلا گیا۔"

"پھر مامن ماسا؟" پاروشنی نے رُکھوں سے کہا۔

"پھر میں نے دیکھا کہ پار کیا ہے، اُدھر کیا ہے پر میں بتا نہیں سکتا۔ ہاں میں بتا نہیں سکتا۔

اور پھر میں چلا گیا۔"

"پر کہاں مامن؟"

"پتہ نہیں پر میں وہاں نہ رہا جہاں پہلے تھا اور میں چلا گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ پار کیا ہے، اُدھر کیا ہے۔"

"کیا ہے؟"

ماسا اتنے زور زور سے ہنسا تھا اپنے بچے کھچے دانت نکالتے ہوئے کہ اوپر رُکھوں میں بہت سارے پکھیرو ڈرے اور پھڑپھڑائے اور پاروشنی بھی خوف کے مارے تیز چلنے لگی اور ماسا کی آواز پیچھے رُکھوں میں رہ گئی، یہی کہتی کہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ پار کیا ہے۔ اُدھر کیا ہے۔۔۔ اور وُہ، وُہیں رہتا تھا رُکھوں کے اندر کہیں اپنی من مرضی سے۔

"کیا ہوا ماسا؟" ماتی نے ویہڑے کی دیوار پر اُس کا بھیگتا ہوا سر دیکھ کر کہا وہ جانے کتنے برسوں بعد بستی کی طرف آیا تھا۔

"ماتی، تُو ادھر آ"۔ اُس کی گہری آواز برستے پانیوں کے شور میں بھی الگ تھی۔ وُہ چھپّر کا بچاؤ چھوڑ کر دیوار کے قریب آ گئی اور بھیگنے لگی "۔ ہاں"۔

"ماتی تیرے کھیت سُوکھے ہیں۔"

ماتی کا سارا ماس ہنسنے سے چھل چھل ہلنے لگا اور وُہ ہنستی گئی "ماسا تو رُکھوں میں رہ کر جنور ہو گیا۔ پانی برستا ہے اور تو کہتا ہے کہ کھیت سُوکھے ہیں۔ ہاہا۔ ہاہا"

"میں اُدھر سے اپنے ٹھکانے سے جو نکل کے ادھر آج آیا ہوں تو ذرا تجھے بتانے کو آیا ہوں"۔ وہ اُسی ٹھہری ہوئی گہری آواز میں بولا "اُوپر کا پانی تو پڑ رہا ہے پر وُہ پانی جس سے بیج پُھوٹے گا جو دریا کی مٹّی کو ساتھ لاتا ہے اور جس مٹّی کی کوکھ میں زور ہے وُہ پانی نہیں پہنچا وہاں پر۔"

"بڑے پانی؟"

"ہاں۔ دریا کے پانی۔ تیرے کھیتوں کے آس پاس جا کر ٹھہر گئے ہیں اور ابھی تک وُہیں ہیں اور آج کل میں واپس چلے جائیں گے۔ تمہارے کھیت سُوکھے رہ جائیں گے"

ماتی کی شکل پر جو دُکھ کی کالک تھی وُہ اور گہری ہوئی۔ اُسے بھی رات کو سوتے ہوئے شک ہوتا تھا پر وُہ کہتی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بڑے پانی آئیں اور اُس کے کھیتوں میں چلے بغیر واپس ہو جائیں۔ پچھلے برس ایسا ہوتے ہوتے بچا تھا۔ پانیوں میں اب وُہ زور نہیں تھا۔ بس وُہ آتے تھے اور اُس کے کھیت میں ٹھہر کر آگے نہیں گئے تھے، ڈوبو مٹّی کو، نہ رُکھوں کو اور نہ جھیل کو اور ابھی

کل کی بات ہے کہ وُہ وہاں تک جاتے تھے۔

ماتی نے ماسا کو دیکھا اور وُہ سر ہلا کر بارش میں گُم ہو گیا۔

وُہ چھپّر تلے واپس آئی اور وہاں گھڑولی پر رکھے ایک گھڑے کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر اُسے اُن تینوں پر اُلٹا دیا جو گُچھا مُچھا ہو کر سو رہے تھے۔ وُہ ہڑبڑا کر اُٹھے تو ایک دریائی جنور کی بجائے تین الگ الگ مرد نظر آنے لگے۔

"ماسا آیا تھا۔ پانی ہمارے کھیتوں کے اندر نہیں گئے۔ جاؤ"

وُہ تینوں اُٹھے اور باہر نکل گئے۔

"اِسے ہاتھ لگا۔"

"نہیں"

"کچھ نہیں کہے گا ورچن اسے ہاتھ لگا"

اور ورچن کانپتا تھا اور اُس کے مہاندرے پر سرسوں پیلی ہوتی تھی اور اُس کی کچھوں میں پسینہ آتا تھا۔۔۔

پورن ہنسا اور زور سے ہنسا اور سندھو کے کنارے پھیلی ڈوبومٹّی میں سے دو بگلے ٹھٹک کر اُڑے اور ہوا ہوئے۔۔۔

"اِسے ہاتھ لگاؤ ورچن۔"

"پرے کرو اس جنور کو جس کا ڈر میرے اندر اندھیر کرتا ہے۔ پرے کرو"

"یہ جنور نہیں ورچن ہمارا بیلی ہے جو ہمیں تمہارے پاس لایا۔" پُورن نے اُس کی تھوڑی تھوڑی دیر بعد کپکپاتی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور ورچن کو دیکھا" اِس سے ڈرو نہیں۔ یہ یہاں کا جنور ہے جیسے میں یہاں کا ہوں ویسے یہ ہے اور تمہیں اب یا کچھ دیر بعد اس کے پاس آنا ہوگا، اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنا ہوگا۔ اب یا کچھ دیر بعد"۔

"نہیں۔ اِسے پرے رکھو" ورچن کے پیلے پڑتے مُہاندرے پر بے بسی تیرتی تھی "اِس کا ڈر میرے بس میں نہیں۔ یہ کہیں بہت اندر ہے میرے میں کہیں ناڑوں میں اور رَت میں گُھلا ہوا۔ یہ نرا جنور ہوتا تو میں اس کی پیٹھ میں دانت گاڑ کر اس کی ساری رَت پی جاتا۔ میں یُوں تو ڈرا کل نہیں ہوں پُورن، میں نے گھاگرا سے یہاں تک کی ریت اور رُکھوں میں اکیلے سفر کیا ہے، مین ڈرا کل نہیں لیکن یہ جنور یہ جسے ہم اسوا بولتے ہیں، لمبی تھوتھنی اور گردن پر مٹی رنگ لمبے بالوں والا جس کی پیٹھ تھرکتی رہتی ہے ہماری سمجھ سے بھی تیز چلتا ہے۔ اس کے سُم پکی اینٹ پر آئیں تو چنگاریاں نکلتی ہیں۔ یہ نہ ہوتا تو تم یہاں نہ ہوتے"۔

"ہو۔ ہو" پُورن نے گھوڑے کی پیٹھ تھپک کر باگ سمیٹ کر اُس پر ڈال دی اور ورچن کے پاس چلا آیا۔ "تمہاری مَت ماری گئی ہے"

"ہم تمہارے داس جو ہوئے۔ ہم تو آناسا ہیں تمہارے جن کی ناک نہیں ہے اور اسی لئے ہماری مَت بوجھ بھی کم ہے تم سے"

"میں نے کبھی تمہیں داس کہا؟"

"تمہارے بھائی بند جو کہتے ہیں۔"

"کبھی آناسا کہا؟"

"وہ تو میں ہوں۔" ورچن کی سیاہ رنگت پر جیسے ڈھلتا سُورج بُجھنے لگا" اور میری نسل ہے آناسا۔ ہماری ناک ویسی ہے جیسی ہماری زمین ہے پدھری اور ہموار۔ اور تمہاری ناک ویسی ہے جدھر سے تم آئے ہو، اونچی اور ٹھنڈی۔ اس میں کوئی شرم نہیں ہم آناسا تو ہیں بغیر ناک والے"۔

سندھو اور موہنجو کے درمیان پھیلے کھیتوں میں کنک ابھی ہری تھی اور اس کے سِٹّوں میں پہلا دانہ پڑا تھا۔ سِٹّوں کے اِدھر سندھو پھیلتا تھا اور اُدھر ہرے بھرے کھیتوں کے ساتھ موہنجو کی پدھری چھتیں دُور تک جاتی تھیں۔ کھیتوں کے ساتھ اینٹوں کے بھٹّوں کے قریب ویران میدان میں ورچن کھڑا کانپتا تھا، اُس سے تھوڑی دُور پُورن بازو سمیٹے سر جھکائے زمین کو دیکھتا تھا اور اُن کے درمیان ایک مٹّی رنگ کا لشکیلا اور زور والے پٹھ پیر کا جنور کھڑا دُم ہلاتا تھا اور ڈوبو مٹّی پر پلنے والی زہریلی مکھیوں کو اپنی پیٹھ پر سے جھاڑتا تھا۔ اور سُورج نیچے ہو رہا تھا۔

"اگر یہ نہ ہوتا تو ہم یہاں نہ ہوتے" پُورن نے جیسے خود سے کہا اور پھر ورچن کو یُوں دیکھا جیسے دشمن کو دیکھتے ہیں۔ "میں کہیں سے نہیں آیا ورچن میں یہیں کا ہوں اِس زمین کا۔ تم بار بار یہ مت بولو کہ تم جدھر سے آئے ہو اور تم اِس جنور پر بیٹھ کر آئے ہو۔ میری جَم پَل یہاں کی ہے موہنجو کی۔ یہی میرا دیس ہے۔ میں کہیں سے نہیں آیا"

"اور تمہاری میّا اور تمہارا باوا؟"

"میری میّا تمہاری نسل کی تھی اور ہری یوپیا میں مٹّی کے گھگھو گھوڑے بناتی تھی اور میرا باوا اُدھر جب رُتوں کی تیزی اور خشکی سے گھبرا گیا اور اُس نے سُنا کہ ادھر سات ندیوں کی اس زمین پر موسم جُثّے کو نہ سکیڑتے ہیں اور نہ جلاتے ہیں اور یہاں کی زمینوں میں سے کنک اور جوار ایسے اُبلتی ہیں جیسے پہاڑوں کی ندیوں میں پانی۔ تو وُہ اپنے جنور کی پیٹھ پر سوار ہوا اور ادھر آ گیا۔"

"اور تم جیسے گوری رنگت کے اور اونچی اور ٹھنڈی ناکوں والے جو پچھلے کئی برسوں سے اُدھر سے اِدھر آ رہے ہیں اور اُن کا ریلا ختم ہونے میں نہیں آتا جو ہمارے کھیتوں کی سرسبزی روندتے آتے ہیں اور ہماری عورتوں میں۔۔۔"

"میرا باوا اُن کے ساتھ نہیں تھا وُہ تو اکیلا آیا اِدھر۔ دیکھ لو" اُس نے ہتھیلی اُلٹ کر اُس کی آنکھوں کے سامنے کی"۔ ابھی سے فرق پڑ گیا ہے۔ میرا رنگ میرے باوا جیسا نہیں تم جیسا ہونے کو ہے میں آدھا اپنی ماں کا ہوں۔ اور میں بھی تم میں سے کوئی اپنے بیج کے لئے چُنوں گا اور یُوں ہولے ہولے ہماری آل اولاد ایک ہو جائیں گی اور ہم۔۔۔"

پُورن نے گھبراہٹ میں سر اُٹھایا کہ جب ورچن نے "کبھی نہیں۔" کہا تو اس کی آواز میں لرزش تھی"۔ تم باہر والے ہو اور باہر والے ہی رہو گے۔ تمہارا رنگ مٹّی ایسا کبھی نہ ہو گا۔ تمہاری ناکیں ہمارے کھیتوں اور پانیوں کی باس سے اونچی ہی رہیں گی۔ تم کبھی نہیں جانو گے کہ کنک کے سِٹّے میں پہلا دانہ پڑے تو وُہ کیسے مہک کر اپنے آنے کا بتاتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ تم نے ہمارے موہنجو کو کیا سے کیا کر دیا ہے؟ یہ کیا تھا اور اب کیا ہے؟"

پُورن خاموشی سے پر بدن میں جڑیں پکڑتے غصّے کے ساتھ اُسے تکتا رہا اور اُس کی سُنتا رہا اور پھر بھی اُس کا جی چاہا کہ یہ بول لے اور وُہ بولتا رہا "ہم اپنے چھپروں میں اپنے گھر میں اپنی حیاتی کرتے تھے۔ بُرے بھلے جیسے بھی تھے اپنے گھر میں تھے اور حیاتی کرتے تھے۔ پھر ہمارے کانوں میں تمہارے جنوروں کے سُموں کی دھمک آئی اور ہماری زمین ہلنے لگی اور اتنے برس ہو گئے پھر بھی ہم ابھی تک اُس دھمک کو سنتے ہیں اور ہم سو نہیں سکتے، ہمارا چین کھو چکا ہے۔ موہنجو کو جو ہاتھ مہاندرہ دیتے تھے، اسے سنوارتے تھے وہ تم نے کاٹ دیئے کیونکہ تم ہاتھ سے کام کرنے والے لوگوں کو نیچ سمجھتے ہو۔ تم یہ جو موہنجو دیکھتے ہو جس کی چھتیں تمہیں دکھائی دے رہی ہیں تو یہ وُہ نہیں جو کبھی آج سے ہزار برس پہلے تھا۔ یہ تو اب مٹّی ہو رہا ہے"

"بازار بھرے ہوئے ہیں، سندھو میں کشتیاں ہیں اور گوداموں میں کنک بھری ہوئی ہے تو مٹّی کیسے ہو رہا ہے؟"

"جس سمے کوئی شے ہمیشہ کے لئے ڈھے جانے کو ہو تو اُس سے پہلے بازار بھر جاتے ہیں اور دریا میں کشتیاں ہوتی ہیں اور گوداموں میں کنک بھر جاتی ہے۔ ڈھے جانے سے ذرا پہلے۔" ورچن نے سر جھکایا اور تھکاوٹ کے قدم اٹھاتا کھیت کے کنارے تک گیا۔ کنک کے اِس کھیت میں سے شام آنے کی ٹھنڈک آتی تھی اور اس کے دوسرے کنارے سے ڈوبو مٹّی شروع ہوتی تھی اور اُس سے

پرے سندھو تھا اور اُس میں دُور دیس سے آنے والی ایک بڑی کشتی تیرتی تھی۔

"تو پھر تم اس کی پیٹھ پر نہیں بیٹھو گے؟" پُورن نے چیخ کر کہا اور ڈوبو مٹّی میں سے ایک اور بگلا ٹھٹک کر اُڑا۔

ورچن پیچھے نہیں مُڑا کھیت کو دیکھتا رہا۔

"ورچن تم جانتے ہو کہ ہم ادھر کو کیوں آئے"۔ پورن ایک بار پھر چیخا "اس لئے کہ تم نکمّے اور سُست تھے۔ نہ تمہاری شکل کام کی تھی اور نہ تم میں کوئی سمجھ بُوجھ تھی، تم بودن تھے بودن سارے کے سارے۔ اپنی زمین پر کام کم کرتے تھے اور سوتے زیادہ تھے اسی لئے ہم تمہیں "پانی" بھی کہتے ہیں، کنجوس اور چھوٹے دِل والے۔ دیوی دیوتاؤں کو نہ ماننے والے، اُن کی تعریف نہ کرنے والے۔۔ اور ہم؟ ہم تو اپنے اُڑتے ہوئے گھوڑوں پر بیٹھے اُن سے بھی آگے نکلتے تھے۔ ہمارا رنگ رُوپ دیکھ کر تمہارے پنکھ پکھیرو اُڑنا بھولتے تھے۔ اور ہم اپنے ساتھ کیا کیا لے کر آئے، کالی دھات جو تمہارے تانبے سے زیادہ سخت تھی اور کھوپڑی میں اُترنے سے جھجکتی نہیں تھی۔ رتھیں جو تمہارے بیل گاڑیوں کو دکھائی نہیں دیتی تھیں اور پھر ہمارے زور والے دیوی دیوتا جو ہم ساتھ لے کر آئے۔"

ورچن کی گردن گھومی اور اُس نے پیچھے دیکھا اور اُس کا چہرہ اور سیاہ ہوتا تھا "ہر شے یہاں کی تھی جسے تم نے نیا نام دے کر اپنا بنا لیا۔ ہمارے دیوی دیوتا۔ ہماری بولی مردھراوچ۔ اور تو اور ہمارے دریا اور ندیاں، وُہ تو تم ساتھ نہیں لائے پر اُن کو بھی اپنے نام دے کر اپنا کہتے ہو۔ پُورن اگر میں نکمّا ہوں اور سُست ہوں اور میرا رنگ رُوپ اچھا نہیں تو کیا ایک پُھرتیلے اور سوہنے بندے کو میرا کھیت زور سے لے لینا چاہئیے؟ وہ کھیت جو اُس کی زمین پر ہے اور زمین اُس کی ساری نسلوں کی ہڈیوں سے بنی ہے؟۔"

پُورن نے ورچن کو گھورا۔ پھر اپنے بالوں میں کُھجلی کی اور گھوڑے کے پاس جا کر اُس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔

"اور اگر کوئی بندہ تم سے۔ پُورن سے زیادہ جان والا ہے، اُس میں زور بہت ہے تو کیا وُہ پُورن کے گھر کا مالک بن جائے تو ٹھیک ہے۔ اگر وُہ اس گھوڑے کو تم سے چھین کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر چلا جائے تو ایسا ہی ہونا چاہیئے؟۔"

گھوڑے کی چمکیلی جِلد ہلکی سی تھرائی، ہوا میں ٹھنڈک بڑھتی تھی، سُورج ڈوب چکا تھا۔

ورچن کھیت پر جُھکا اور کنک کے ایک بُوٹے کو اکھاڑ کر اُس کے کومل سِٹّوں کو دانتوں میں

رکھ کر چوسنے لگا۔ اُس نے ایک ہرا سِٹّہ مُنہ سے نکال کر اُسے ہتھیلی پر رکھ کر انگوٹھے سے مَسلا۔ سبز چھلکے میں ایک ہرا اور گیلا دانہ تھا"۔ پُورن" وُہ لمبی لمبی پلانگیں بھرتا اُس کے پاس جا پہنچا۔ "دیکھ پُورن دیکھ۔ کنک کے سِٹّے میں دانہ پڑ گیا ہے، اِسے ہم ہری کنک کہتے ہیں۔" خوشی سے ورچن کے دانت مُنہ میں نہیں آتے تھے۔

پُورن مسکرایا اور سر جھٹک کر بولا "اتنی چھوٹی سی بات پر کتنے خوش ہوتے ہو"

"اس لئے کہ میں آناسا ہوں" ورچن نے دانہ ہتھیلی پر رکھ کر اُسے سُونگھا"۔ اور میرے لئے پہلی خوشی بیج کا پھوٹنا ہے اور پتے نکالنا ہے۔ دوسری خوشی سِٹّے میں دانہ پڑنا ہے اور تیسری اور سب سے بڑی خوشی اس دانے کے پکنے پر اِسے جھاڑ کے گھر لانا ہے۔"

"اور پاروشنی؟"

ورچن نے دانے پر سے نظریں ہٹا کر پُورن کو دیکھا جو گھوڑے کی گردن میں باہیں ڈالے کھڑا تھا۔ "وُہ بھی ایک خوشی ہے۔"

دونوں کے جسموں میں جو گرمی تپنے لگی تھی وہ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ وہ جیسے گرم ہوئے تھے ویسے ہی ٹھنڈے ہو گئے اور ایک دوسرے سے کچھ نظریں چُرانے لگے کہ دونوں یونہی بھڑک اُٹھے تھے۔

"اب جو میں اِدھر سندھو کے کنارے کھڑا ہوں تو اب اس سمے ہماری بستی کے کھیتوں میں بھی کنک میں دانہ پڑ چکا ہو گا اور پاروشنی سِٹّوں کو مسل کر اُنہیں سُونگھتی ہو گی۔ اگر میں کل سویرے یہاں سے چلوں تو شائد کنک کے پکنے پر پہنچ جاؤں۔ شائد!"

پُورن اُس کے پاس آیا اور وُہ ورچن سے کم سے کم ایک ہاتھ اونچا تھا۔ "دیکھ تو میرا جنور لے جا اِس پر سوار ہو کر جاؤ، کٹائی سے بہت پہلے تو اُدھر ہو گا، جتنی دیر میں یہ ہوا وہاں ہو گی اتنی دیر میں"

"نہیں۔" ورچن بدکا "میں اسوا کو اپنی بستی میں لے کر نہیں جاؤں گا۔"

"اچھا اچھا" پُورن نے سر ہلایا اور باگ کے چمڑے کو ہتھیلی کے گرد لپیٹ کر زمین پر بیٹھ گیا "تم کیسے اور کدھر سے جاؤ گے؟"

ورچن آلتی پالتی مار کر بیٹھا اور زمین پر ایک لکیر کھینچ دی۔ پُورن اُس پر جُھکا کیونکہ روشنی کم ہو رہی تھی "اِدھر موہنجو ہے۔ اور یہ سندھو۔ اِسے میں کشتی سے پار کر لوں گا اور دوسری طرف جا اُتروں گا۔ پھر یہاں سے سرسوتوں کے اِس جُھنڈ میں" اُس نے دو چار اور لکیریں کھینچیں۔

"اور پھر یہ رُکھ۔ اور یہ ریت اور اِدھر شتندری آئے گا اور اس کے پار جانا ہو گا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ وہاں تک جہاں یہ گھاگرا میں جا ملتا ہے۔"

"سرسوتی میں۔" پُورن جھکا ہوا بولا۔

"نہیں گھاگرا میں۔"

"رِگ وید میں تو یہی آتا ہے۔"

"یہ رِگ وید سے پہلے تھا اور گھاگرا تھا۔ اور ہے۔ اِسے دریا ہی رہنے دو دیوی بنا کر دُور مت کرو۔"

"ہاں تو پھر؟" پُورن نے سر جھٹکا۔

"پھر میں گھاگرا کو چھوڑ کر ریت میں جاؤں گا اور تین دن اور تین رات کے بعد اُن رُکھوں میں جا پہنچوں گا جو ڈوبو مٹّی کے ساتھ ہیں۔"

"تم اِس گھاگرا کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"

"یہ سیدھا نہیں ہے، بل کھاتا ہے اور پینڈا زیادہ ہو جاتا ہے اور اس لئے۔۔۔"

"ہاں شائد تم کٹائی تک پہنچ ہی جاؤ۔۔۔ آؤ گھر چلتے ہیں"

ورچن کے مُنہ میں ہرے دانے کی تازگی اور کچا پن گُھلتا تھا۔ وُہ لنگی جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھیتوں سے پَرے اینٹوں کے کئی بھٹّے تھے جن میں سے دھواں نکلتا تھا اور نیم سیاہ آسمان میں کالے رُکھوں میں جاتے ہوئے کسی گھوڑے کی طرح گُم ہوتا تھا۔ یہاں سندھو کے ساتھ کے رُکھ بھٹّوں میں کام آ رہے تھے اور کم ہو رہے تھے۔ اُدھر بڑے بڑے کنک گھر تھے جو ابھی خالی پڑے تھے اور جو اگلے ماہ بھرنے والے تھے، دُور نزدیک سے واہکوں نے آنا تھا اور یہاں کنک دے کر موہنجو کے بازار سے بہت کُچھ لینا تھا۔ بھٹّوں سے پرے سندھو کا وُہ حصّہ تھا جو کہتے تھے کہ پاتال سے بھی گہرا ہے اور اس کے ساتھ پکّی اینٹوں کے چبوترے بنا کر کشتیاں کھڑی کرنے کے لئے جگہ بنائی گئی تھی۔ یہیں پر سمندر سے سندھو میں آنے والے لوگ اُترتے تھے اور اُن کے تھیلوں میں سے سونا، چاندی، تانبہ، سبز پتھر اور دوسری ان دیکھی چیزیں نکلتی تھیں۔ اِسے کشتی گھر بھی کہتے تھے اور اس کے عین سامنے ایک اونچا دروازہ موہنجو کی ایک سیدھی اور دُور تک جاتی گلی پر کُھلتا تھا۔ اس گلی میں بیل گڈ کھڑے رہتے تاکہ کشتیوں سے اُترنے والے بدیسی مال کو موہنجو کے اندر لے جا سکیں۔ یہ بیل گڈ کئی کئی دن تک کھڑے رہتے اور ان کے بیلوں کے سروں پر دریائی پرندے آرام کرتے۔ کشتی گھر کے سامنے دریا میں کھڑی ایک کشتی پر بہت سارے

پرندے اُڑتے تھے، شائد اُس میں مچھلیوں کا ڈھیر تھا اور کشتی والا کہیں گیا ہوا تھا۔ پانی تک جانے والی لکڑی کی سیڑھی پر ایک آناسا بچہ بانس کے ساتھ باریک رسّیوں کا ایک جال باندھے اُسے پانی میں ڈبو کر باہر لاتا تھا لیکن اس وقت مچھلی ادھر نہیں تھی۔

ورچن اور پُورن کشتی گھر والے دروازے میں سے گزر کر موہنجو کے اندر گئے۔

بڑی گلی میں لوگ بہت تھے اور کھیتوں سے واپس آنے والوں کی بیل گڈّیں اُس میں شور کرتی چلتی تھیں۔ وہ دونوں گلی کے پچھواڑے میں ہو گئے جہاں گھروں کے دروازے تھے اور پکّی اینٹوں کی چُنی ہوئی دیواروں میں کُوڑا باہر پھینکنے والے ترچھے سوراخ تھے۔ گلی کے بیچ گندے پانی کے لئے نالیاں تھیں جو سُرخ اینٹوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

"تم تھک گئے ہو تو اس پر بیٹھ جاؤ۔" ورچن نے دیکھا کہ وہ تھک رہا ہے۔

"نہیں میں تمہارے ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔" پُورن بولا پر اُس کے کہنے میں گرمی نہیں تھی۔

دونوں چُپ چلتے گئے۔ گھوڑے کے سُم نالیوں کی ڈھکنے والی اینٹوں پر پڑتے تو اندر کی کھوکھلی آوازیں باہر آتیں۔

پُورن۔۔ میں جانتا نہ تھا کہ جونہی میں گھاگرا کے کنارے سے الگ ہو کر سندھو کی زمین پر آؤں گا تو اُدھر تم ہو گے۔ پہلے میں نے تمہیں دیکھا اُسی میدان میں کھڑے ہوئے اور تمہیں دیکھ کر میں نے آنکھیں جھپکیں کہ تم اپنی نسل کے پہلے تھے جو میری آنکھوں کے سامنے آئے۔ تمہاری رنگت اور ناک اور قد بُت کو دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا۔ اور پھر میں نے تمہارے اِس جنور کو دیکھا جو سر جھکائے اس وقت موہنجو کے مکانوں کے پچھواڑے میں نالیوں کو ڈھکنے والی پکّی اینٹوں پر چلتا ہے تو میرا اندر اُلٹ گیا کہ بھاگ ورچن اپنی بستی کو جا۔ پر ساتھ میں یہ ڈر بھی پھیلا کہ یہ دونوں مجھے واپس ہوتے دیکھیں گے تو شائد میرے پیچھے پیچھے چلتے آئیں گے، یہ جو یہاں ہماری زمینوں پر، ہمارے پانیوں پر پھیلتے ہیں اور ان کے مالک بنتے ہیں تو یہ وہاں میری بستی میں بھی پہنچ جائیں گے۔ ان کا اسوا ہمارے بیلوں سے تیز اور ترِکھا ہے۔ ان کے پاس کالی دھات ہے، جو ماس کاٹتی ہے اور یہ اونچے ہیں قد کے اور ناک کے اور ان کی رنگت گوری ہے اور اکھیاں نیلیاں ہیں۔ یہ ہر بات میں دیوی دیوتاؤں کی بات کرتے ہیں اور انسانوں پر کالی دھات چلاتے ہیں۔ ان کے جُسے ہم سے زور والے ہیں اور ترکھے ہیں اور یہ ہولے ہولے ہمیں زمین سے اور پانیوں سے اور کھیتیوں سے دھکیلتے جاتے ہیں۔

ایک گھر میں سے کچھ کوٹنے کی آواز آئی دَھم۔ دَھم۔ اور اُس کے ساتھ میں کُہنی تک آئے کنگنوں کی کھنک بھی سنائی دی۔ پُورن نے ورچن کو دیکھا جو اپنے آپ میں گُم تھا۔

میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں اس زمین کا جم پَل ہوں۔ میری رنگت ہولے ہولے بدل جائے گی اور میں تم جیسا ہو جاؤں گا۔ تم مجھے غصّے کی آنکھ سے مت دیکھو۔ میں جانتا ہوں کہ میرے بھائی بند تمہیں نفرت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں، تمہیں داسُو، داس اور آناسا کہتے ہیں پر میں اُن کے ساتھ نہیں کہتا۔ وُہ مُدتوں سے ہر برس پہاڑوں سے اُترتے ہیں اور سندھو کے میدانوں میں پھیلتے ہیں اور اُن میں سے کچھ کالی دھات سے تمہارے سَروں میں دراڑیں ڈالتے ہیں، تمہاری عورتیں اُٹھا لے جاتے ہیں اور تمہاری بستیاں اُجاڑتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وُہ ایسا کرتے ہیں اور ایسا ہونا تھا ورچن۔ تمہارے جسموں میں آلکس ہے اور تمہاری آنکھوں میں نیند ہے۔ اور تمہارے دریا سُست ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی زمین کا پُتر نہیں ہوتا، نرا اُس زمین پر پیدا ہونے سے وُہ تمہاری نہیں ہو جاتی جب تک کہ تم اُس کی خدمت نہ کرو، اُس کی چاکری نہ کرو۔ تمہاری باہوں میں تو زور ہی نہیں رہا تم کیا خدمت کرو گے۔ پہلا دن یاد ہے!

دو برس پہلے اُسی میدان میں سندھو کے کنارے اینٹوں کے بھٹّے کے سامنے کشتی گھر کے پاس میں اپنے اِسی گھوڑے کو سدھاتا تھا کہ یہ نیا نیا پہاڑوں میں سے آیا تھا اور اِس کے سُم ہموار زمین پر پڑتے تھے تو لڑکھڑاتا تھا۔ اِسے میں نے اُدھر سے آنے والے ایک بھائی بند سے لیا تھا۔ اور آج شام کی طرح سُورج نیچے ہو رہا تھا اور تم دوسری طرف سے موہنجو کو آنے والی اور سندھو پر تیرتی ایک کشتی میں سے باہر آئے تھے، باہر آئے تھے اور اپنے سامنے تم نے دیکھا تھا اور اپنے سامنے تم نے موہنجو کو دیکھا تھا اور تم نے بار بار اپنا سر جھٹکا تھا جیسے تم دیکھ نہیں سکتے اندھے ہو گئے ہو۔ تمہاری آنکھوں سے یقین چلا گیا تھا اور وہاں ڈر پھیلا تھا کہ ہیں یہ کیا ہے، میرے سامنے انسانوں کی اتنی بڑی بستی۔۔ تم نے مجھے خود بتایا تھا کہ تم نے جب پہلی بار موہنجو پر نظر ڈالی تو تم آنکھیں جھپکتے تھے کہ یہ اب وہاں نہیں ہو گا، یہ اب وہاں نہیں ہو گا اور وُہ وہاں رہا۔ اور تب اُس شام جب سُورج زمین کو جُھکتا آتا تھا اُدھر میں اپنے گھوڑے کو تھپکتا تمہیں دیکھتا تھا اور تمہاری آنکھوں میں تیرتی بے یقینی کو سمجھتا تھا۔ تم تو کسی ایسی بستی سے آئے تھے جسے صرف تم جانتے ہو اور جو پتہ نہیں کہاں ہے اور اگر ہے تو اُس میں چند گھر ہوں گے پر اُدھر تو وہ لین دین کرنے والے جو بدیسوں سے آتے ہیں اور موہنجو سے بھی بڑی بستیوں سے آتے ہیں وُہ جب سمندر سے کشتی گھر میں آتے ہیں اور سندھو سے پہلی بار موہنجو کو دیکھتے ہیں تو

اُن کا بھی یہی حال ہوتا ہے اور وُہ اِس بستی کو تمہاری طرح بے یقینی سے دیکھتے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ موہنجو تمہاری نسل نے بنایا اور بسایا پر اس کا وقت پورا ہو گیا۔ اب سندھو سے بڑے پانی نکلتے ہیں تو کھیتوں پر سے گزر کر گلیوں اور گھروں کے اندر تک مار کرتے ہیں اور اُن کو کمزور کرتے ہیں اور اُن کی تہوں میں بیٹھتے ہیں۔ دیکھو یہ کلّر جو موہنجو کی اینٹوں اور دیواروں میں سے پُھوٹتا ہے، بڑے تالاب کے آس پاس اور کُنک گھر کے فرش میں سے نکلتا ہے۔ اور اس کلّر کی وجہ سے ایسا ہے کہ جیسے ایک پرندہ جو اونچی اُڑان کرتا ہے پر ایک روز وُہ نیچے آتا ہے کیونکہ اُسے نیچے آنا ہوتا ہے۔ ایسے موہنجو بھی اُڑان کے بعد اب نیچے آرہا ہے۔ ایسا ہونا تھا ہم نے نہیں کیا، اس کی اینٹیں جو اب مٹّی ہو رہی ہیں اُنہوں نے کیا اور بڑے پانیوں نے کیا۔ اور تمہاری آلکس اور نیند سے بوجھل آنکھوں نے کیا۔ ہاں تو تم کشتی سے باہر آتے تھے، باہر آتے تھے اور پھر تم نے اپنے سامنے دیکھا تھا اور اپنے سامنے تم نے پہلی بار موہنجو کو دیکھا تھا اور اُس لمحے میں اس مُنہ زور کو جو اب نالی کو ڈھکنے والی پکّی اینٹوں پر سنبھل سنبھل کر چلتا ہے، سدھاتا تھا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر پیار کا ہاتھ رکھا اور پھر سندھو کے کنارے تک گیا جہاں تم آنکھیں کھولے بُت کھڑے تھے۔ تم نے مجھے دیکھا اور میری رنگت اور میری ناک کو دیکھا تو تمہاری آنکھیں اور کُھلیں کہ تم نے اس سے پہلے مجھ ایسا کوئی نہ دیکھا تھا، ہم جو گھوڑوں پر سوار پہاڑ سے اُترے تھے تم نے نہ دیکھے تھے۔ میں تمہیں ان جان سمجھ کر اپنے گھر لے گیا اور پھر تم کو بتایا کہ موہنجو کیا ہے اور ہم کیسے آئے اور کہاں سے آئے۔ میں نے تمہیں بتایا اور تم مجھ سے سیکھتے رہے، سر جھکا کر سنتے رہے اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اچھا جانا۔ اور اب تم مجھ سے جھگڑتے ہو اس موہنجو کے لئے جو تم نے پہلے دیکھا نہ تھا اور جس میں میں پیدا ہوا تھا۔ اِسے تم اپنا کہتے ہو اور میرا حق نہیں مانتے۔ تمہاری اس بستی میں ساری دیوارں اندھی ہیں اِن میں ہوا کے لئے راستے نہیں ہیں کیونکہ تم کہتے ہو کہ گھر کو سُورج کی روشنی اور پرائے کی نظر سے بچاؤ اور ہم روشنی میں رہنا چاہتے ہیں اور پرائے کی نظر سے نظر ملاتے ہیں۔۔ یہ فرق ہے۔

رات ہو چکی تھی۔

وُہ عمارتوں کے پچھواڑے سے نکل کر گلی میں آئے، اُنہیں پہلی گلی کی طرف جانا تھا اور وُہ دونوں چُپ چلتے تھے اور اُن کے ساتھ گھوڑے کے چار سُم چلتے تھے۔ پہلی گلی کے دائیں ہاتھ پر تنگ اور نیچی چھتوں کی وُہ کوٹھڑیاں تھیں جن میں باہر سے آنے والے رات گزارتے تھے اور ان کے ویہڑے میں کئی بڑے بڑے تنور گرم ہوتے تھے اور اُن میں روٹی پکتی تھی۔ یہ سرائے

مُردہ آدمی کی گلی کے بائیں ہاتھ پر تھی۔ وُہ تینوں اُدھر سے گزرے اور پھر پہلی گلی میں سے ہو کر اُس گھر کے اندر چلے گئے جس کا دروازہ موہنجو کے تمام گھروں کی طرح پچھواڑے میں تھا اور پہلی گلی کی طرف اُس کی سیدھی دیوارں تھیں جن میں کوئی کھڑکی نہ تھی اور وُہ بالکل سیدھی چلی جاتی تھیں اور اُن کے آخر میں روشنی کے لئے دو تین ترچھے سوراخ تھے۔

رات ہو چکی تھی۔

پُورن جُھکا اور سیدھا ہوا۔۔ اُس نے گھوڑے کو باندھا تھا۔ ”آؤ اوپر چھت پر چلتے ہیں“

”رات گرم تو نہیں جو اوپر چلنا ہے اِدھر ویہڑے میں ہی سو جائیں گے“

”تم ہمیشہ اندر ہی اندر اور چُھپ کر رہنا چاہتے ہو۔“ پُورن ہنسا اور اُس کی ہنسی ویہڑے کے چاروں طرف بنی کوٹھڑیوں میں گئی اور گونج کر باہر آگئی کہ اُن کی دیوارں اندھی تھیں اور اُن میں کوئی سوراخ نہ تھا ”آؤ کل تم نے چلے جانا ہے“

وُہ جُھک کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

ہلکی تاریکی میں موہنجو کی ہموار چھتیں وہاں تک جاتی تھیں جہاں کھیتوں کی ہریاول کی سیاہی تھی اور اُس کے ساتھ کہیں سندھو تھا جو اب دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بڑے تالاب کی منڈیروں کا ایک حصّہ چھتوں کے اس پھیلے ہوئے میدان میں ذرا اونچا تھا ورنہ یہاں سے وہاں تک پُورے موہنجو کی چھتیں ایک ہی سطح پر ایسے تھیں جیسے ایک ہی چھت ہوں یہاں سے وہاں کھیتوں اور سندھو تک۔ ہاں بیچ میں کہیں کہیں گلیوں کی دراڑیں تھیں اور اردگرد بچاؤ کی بڑی دیوار تھی کہیں سے اونچی اور کہیں سے نیچی۔

”سارے موہنجو ڈارو میں ایک بھی رُکھ نہیں، کیا یہ اچنبے کی بات نہیں ورچن؟“

اور ورچن نے ایک نظر اُن چھتوں کو دیکھا جنہیں وُہ کئی بار دیکھ چکا تھا اور اُن ویہڑوں کو دیکھا جن میں کسی میں روشنی تھی اور کوئی اندھیرے میں تھا اور اُس نے جانا کہ اِس سے پہلے اُسے کبھی خیال نہیں آیا کہ موہنجو کی کسی گلی میں، کسی گھر میں کوئی رُکھ نہیں ہے۔۔ موہنجو سارے میں ایک بھی رُکھ نہیں تھا۔ ”ہاں۔“ ورچن حیرت میں بولا۔ ”لیکن ایسا کیوں ہے؟“

”تم رُکھوں اور ہریاول اور پانیوں سے دُور ہو چکے ہو اس لئے۔ تم جانتے ہو کہ ہم میں سے بہت کم لوگ تمہاری بستیوں میں رہتے ہیں۔ ہم اِدھر رہ نہیں سکتے۔ ہمارے نتھنے ان کی ہوا میں کام نہیں کرتے اور ہمارا دم چھوٹا ہوتا ہے۔ ہمیں کُھلی ہوا اور کُھلی رات چاہیئے اور اسی لئے میں یہاں بہت دن نہیں رہوں گا اور اُوپر ہری یوپیا کے ساتھ میدانوں میں جا کر کھیتی باڑی کروں

گا۔"

پُورے موہنجو کے بیچ ایک بڑی گلی پہاڑ پاسے سے سمندر کی طرف جاتی تھی اور دوسری اُس کو سیدھی آر پار کاٹتی تھی۔ یُوں ساری بستی چوکور اور لمبے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جدھر سورج ڈوبتا تھا اُدھر بچاؤ کی عمارتیں تھیں، پر کس سے بچاؤ؟ وُہ تو آچکے تھے اور بہت برسوں سے آچکے تھے اور یہیں تھے اِس موہنجو کے اندر۔

ورچن نے چھتوں سے نظر ہٹا کر پُورن کو دیکھا اور ہولے ہولے ہنسا "میں کہاں رُکھوں اور ہریاول اور پانیوں سے دُور ہواؤں، میں تو اُن میں رہتا ہوں، کُھلی ہوا اور کُھلی رُتوں میں رہتا ہوں۔"

"جو ہونا ہوتا ہے وُہ اِن بڑی بستیوں میں ہوتا ہے، اِن میں رہنے والوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تم تو پتہ نہیں کہاں کس چھوٹی سی نالی کے کنارے آباد دو چار گھروں کی بستی میں رہتے ہو"

"تم نے گھاگرا دیکھا نہیں اس لئے اُسے چھوٹی نالی کہہ رہے ہو۔" ورچن یکدم بُجھ گیا اور اُس کا دل ترسا اُس کے پانیوں کے لئے اور اُن کی باس کے لئے اور اُس بستی کے لئے جس میں پاروشنی تھی "تم کیا جانو کہ گھاگرا کتنا بڑا ہے"۔

"سرسوتی۔"

"نہیں" ورچن کھاٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا "گھاگرا۔"

"ایک ہی بات ہے۔ ہم اُسے ساتویں ندی کہتے ہیں اور سرسوتی کہتے ہیں، اپنے ویدوں میں اُس کی تعریف کرتے ہیں۔"

"اور تم اُسے چھوٹی سی نالی بھی تو کہتے ہو۔"

پورن چُپ ہوگیا۔ اُس کے پاس جواب نہ تھا، اُس نے گرمی میں آکر ایک بودن بات کہہ دی تھی اور اب نہیں جانتا تھا کہ اُس بات کو سیدھا کیسے کرے۔ پر یہ ورچن بھی تو ایک ہلکائے ہوئے جنور ایسے اُس کے پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا کہ تم اُدھر سے آئے ہو اور یہ زمین ہماری ہے اور یہ وُہ ہے۔ وہ بھلا سرسوتی کو چھوٹی سی نالی کیسے کہہ سکتا تھا۔ اُسے بڑی شرمندگی تھی اور اُس کی سیدھی اور اونچی ناک پر پسینے کے قطرے پُھوٹے اور وُہ سر جھکا کر کہنے لگا "ہم تو ویدوں میں کہتے ہیں کہ سرسوتی جھاگ سے بھری لہروں کے ساتھ آتی ہے ہمارے بچاؤ کے لئے۔ پہاڑوں سے لے کر سمندروں تک اُس کا راستہ پوّتر ہے اور ندیوں میں صرف سرسوتی ہے جو ہماری بات سنتی ہے۔ اِس میں دوسری تمام ندیوں سے بڑھ کر شاندار بڑے پانی آتے ہیں جیسے رتھ پر سوار

ہوں۔"

"یہ تم کونسی ندی کی بات کر رہے ہو پُورن؟"

پُورن نے غصّے سے سر اُٹھایا "بیچ میں ٹوکتے کیوں ہو؟"

"اس لئے کہ تم جس ندی کی بات کرتے ہو وُہ گھاگرا نہیں ہے۔"

"پر یہ تو دوسرے رگ وید میں آیا ہے"۔ پورن کی آنکھیں سُرخ ہوئیں۔

"اور میں خود وہاں سے آیا ہوں۔" ورچن غصہ بھول کر مسکرانے لگا "میں اپنی زمین کو تمہارے ویدوں سے زیادہ جانتا ہوں، جو کُچھ اُن میں ہے مُجھ میں اُس سے بڑھ کر ہے۔ اُن میں جو کُچھ ہے وُہ پرانا ہو گیا ہے، اب گھاگرا وُہ نہیں جس میں شاندار اور جھاگ سے بھرے بڑے پانی آتے تھے۔ اُس میں تو اب اتنا زور نہیں کہ وُہ بستی سے پرے رُکھوں والی جھیل تک پہنچ سکیں اور ہمیں دوسری ندیوں کا پتہ نہیں ہم تو صرف گھاگرا کو جانتے ہیں۔"

"یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ویدوں میں ٹھیک نہ لکھا ہو۔ تم جانتے ہو اُن کو کس نے لکھا؟"

"اُنہوں نے جو باہر سے آئے تھے۔"

"اور وُہی باہر والے اُسے دیوی کا رُوپ دے کر اُس کے سامنے سر جھکاتے ہیں اُسے ساری ندیوں سے بڑھ کر پوتر تا دیتے ہیں۔"

ورچن ہنسا، ایسے ہنسا کہ پُورن کو دُکھ ہوا کہ یہ کیوں ہنسا اور اُس نے پُوچھا کہ تم کیوں ہنستے ہو؟

"وُہی پرانی بات کہ تم ہر شے کو دیوی دیوتا بنا کر اپنے سے الگ کر دیتے ہو اور اُس سے دُور جا بیٹھتے ہو اور اُسے چُھوتے نہیں اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہو اور اُسے دیکھتے نہیں آنکھیں بند کر لیتے ہو۔ گھاگرا کے پانی ہمیں حیاتی دیتے ہیں، ہماری مٹّی میں پڑے بیج کو وتر دیتے ہیں، ہم اُس میں جاتے ہیں اور وُہ ہم میں اور ایسے وُہ ندی اور ہم ایک ہیں۔ اگر وہ دیوی ہے تو پھر ہم بھی وُہی ہیں جو وُہ ہے۔"

"پورن نے اُسے دیکھا کہ وہ کیسے آرام سے بات کرتا ہے، اس کے مہاندرے پر کہیں ڈر کی پیلاہٹ نہیں۔ "ہم اُنہیں اپنے سے الگ کہاں کرتے ہیں ہم تو اُنہیں اپنے گھروں میں اپنے پاس لے آتے ہیں"

"ہاں تم سانس کو مٹّی اور پتھر کر دیتے ہو۔"

"پُورن نے ورچن کو پھر دیکھا یہ آج کیسے آرام سے بات کرتا ہے، مُجھ سے جان کر، مُجھ سے ایک ایک بات پُوچھ کر اب الگ راستہ بناتا ہے اور ٹوکتا ہے۔ میں اِسے ساتھ لے آیا سندھو کے

کنارے سے آن جان سمجھ کر اور اب یہ جانتے والا ہے۔ اس کے پاس پوٹلیوں میں وُہ مُہریں منکے اور گہنے تھے جو اس کی بستی کے کسی سمرو نے بنائے تھے اور وُہ ان کے بدلے رنگین پتھر اور سونے چاندی کی ڈلیاں مانگتا تھا۔ کیا یہ صرف اسی لئے اتنے سفر کر کے ادھر آیا ہے، صرف اسی لئے۔

"کیا تم چند پتھروں اور ڈلیوں کے لئے ریت اور رُکھوں کے سفر کر کے ادھر آئے ہو؟"

"ہاں" ورچن مسکرایا "ہاں۔۔۔"

"نہیں۔" پُورن بھی مسکرایا "نہیں۔ تم صرف اس لئے نہیں آئے۔ تم سویرے چلے جاؤ گے، پھر جانے ہم ملتے ہیں کہ نہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ ہم نہیں ملیں گے۔" ورچن کی مسکراہٹ ہونٹوں پر ٹھہر گئی "پر میں تمہیں اب بتا دیتا ہوں کہ میں پانی اور ریت اور رُکھوں میں سے سفر کر کے یہاں تک کیوں آیا ہوں۔ سُنو، ہم اُدھر ایک پاسے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی ادھر نہیں آتا کہ ہماری بستی میں کسی شے کی تھوڑ نہیں ہے۔ ہمارے لئے وہاں سب کچھ ہے اور ہم بستی کو چھوڑنے کو اچھا نہیں سمجھتے اور پھر یہ ہوا کہ کچھ برسوں سے میں کچھ سُنتا تھا جیسے کبھی کبھار ڈیرہ ڈالنے والے لوگ ادھر کو آتے تھے اور ہم سے لین دین کرتے تھے پر اب یہ لوگ بڑھتے جاتے تھے اور پھر ایسے بھی تھے جن کا کوئی گھر بار نہ تھا اور اُن کے پاس اُن پانی کے لئے بھی کچھ نہ تھا اور ان میں سے وُہ ہمیں بتاتے تھے کہ وُہ بھی ہماری طرح ہی بستیوں میں تھے اور پھر اسوا پر بیٹھے ہوئے اونچی ناکوں والے آئے اور اُنہیں وہاں سے باہر کر دیا سُنو پُورن اور وُہ بستیوں کو چھوڑ کر بکھر گئے اور اب اس زمین پر مارے مارے پھرتے ہیں اور اُن کی کوئی بستی نہیں اور وُہ اپنی زمین پر ہی جنوروں کی طرح گھومتے ہیں۔ مجھے پہلی بار ان لوگوں نے بتایا کہ تم آ گئے ہو۔ پتہ ہے پُورن کہ تم نے اُن کے اندر ایسا ڈر بھر دیا ہے کہ وُہ تمہیں انسان نہیں کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اُن میں سے بہت ساروں نے تمہیں صرف اسوا پر بیٹھے دیکھا تو یہ جانا کہ یہ کوئی نیا جنور ہے جس کی چار ٹانگیں ہیں اور دھڑ سے اوپر انسان ہے اور ہوا سے بھی آگے نکل نکل جاتا ہے۔ وُہ نہیں جانتے کہ تم اور اسوا ایک نہیں ہو۔ اُنہوں نے مٹّی کی مورتیوں میں بھی ایسے جنور بنائے۔ میں نے پہلی بار تمہارے اسوا کو ایک ایسی ہی مُورتی میں دیکھا تھا اور اُس نے میرے اندر بھی ڈر بھر دیا تھا۔ اور تب میں نے سوچا کہ ہم یُوں تو ایک پاسے پڑے ہوئے ہیں اور یہ جو آتے ہیں تو ہری یوپیا سے سیدھے موہنجو چلے جاتے ہیں پر یہ کبھی ادھر بھی آئیں گے اور ہمیں یہاں سے نکال دیں گے تو اس سے پہلے مُجھے جا کر

دیکھ آنا چاہئیے کہ وُہ کیسے ہیں اور اُن میں وُہ کیا ہے جو ہم میں نہیں۔"

"اور تم نے دیکھا؟"

"ہاں۔ میں نے دیکھا کہ سمجھ بُوجھ والے ہمیشہ نا سمجھوں سے مار کھاتے ہیں اُن کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں کہ کسی سانس لینے والے کو مارنے کے لئے سمجھ کی نہیں صرف زور کی ضرورت ہوتی ہے۔ جی دار ہونے کے لئے بودن اور بے سمجھ ہونا بہت ہے۔"

"تمہارے جی میں یہی آتا ہے کہ ہم سب جو ادھر آئے ہیں سب کے سب نا سمجھ ہیں اور بودن بیکار ہیں، ہمارے بھیجے خالی ہیں، ہم اپنے جُثّے کے زور سے تمہاری بستیاں برباد کرتے ہیں اور تمہارے جنوروں کو دھکیل کر آگے لے جاتے ہیں، سب کے سب؟"

ورچن نے ایک گہرا سانس لیا۔ اُس کے نتھنوں میں سُلگتے ہوئے اُپلوں کی باس آئی، جیسے شام ہو اور وُہ اپنی بستی میں ہو اور پاروشنی کی چنگیر کے پاس بیٹھا ہو اور وہ اُپلوں میں پھونکیں مارتی ہو۔ اُس نے ایک اور سانس لیا اور جانا کہ وہ ابھی موہنجو میں ہے جہاں کسی گھر میں کوئی اُپلوں میں پھونکیں مارتی ہے۔

"سب کے سب؟" پورن نے دُہرایا۔

"نہیں سب نہیں۔ تمہارے ساتھ سمجھ بُوجھ والے بھی اُترتے ہیں جو اس زمین کی ندیوں، پہاڑوں، رُتوں اور دیوی دیوتاؤں کے نام بدلتے ہیں۔ یہاں کی بولیوں کو نا سمجھی کی بولیاں کہتے ہیں پر انہی کو اپنی بولی میں گھول کر نئی بولی بناتے ہیں۔ نہیں تم میں سمجھ والوں کا توکال نہیں پر اُن کی سمجھ تمہارے ہاتھوں میں پکڑی کالی دھات کی طرح ہمیں ہی کاٹتی ہے۔ تمہاری سمجھ اور کالی دھات اور اسوا سب ایک ہیں۔"

رات کے پچھلے پہر ہوا اُدھر سے آئی جدھر کو سندھو تھا اور سندھو کے پانیوں پر سے آتی ہوا میں پالا بہت تھا۔ اور اس پالے کی کاٹ سے وہ کروٹیں بدلتے تھے اور سوتے نہ تھے۔

"میں تمہیں شائد کبھی ملنے آؤں۔" پُورن کہنے لگا۔

"نہیں۔" ورچن نے فوراً کہا "اِسی لئے تو میں یہاں آیا ہوں تاکہ تم وہاں نہ آسکو"

"بودن اور بے سمجھ ہو تم۔" پُورن اُٹھ کر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں بازوؤں پر ہولے ہولے چلائیں تاکہ اُن کا ٹھٹھرا ہوا ماس کچھ گرم ہو "مُجھ میں اور اُن میں جو فرق ہے تم دیکھتے ہی نہیں۔ میں یہاں کا ہوں اور یہیں رہوں گا اسی دھرتی پر کیونکہ یہ دھرتی میری بھی ہے۔ تم جو چاہے کرو، مُجھ پر ناک چڑھاؤ، تھوک ڈالو میں یہیں رہوں گا۔ وہ جو کھیتیاں اور

بستیاں اُجاڑتے ہیں میری نسل کے ہیں پر میں تو نہیں۔ میری نسل کے وہ لوگ جو سب سے پہلے پہاڑوں سے اُترے تھے اُنہیں اُترے ہوئے کتنے بے انت برس ہوئے۔ اب اُن کی آل اولاد ایک سے دو اور دو سے چار اور چار سے بے آنت ہوئی اور اب کھیتیاں کھودتی ہے تو یہ کہاں جائے گی؟۔ جدھر سے ہم آئے ہیں اُدھر تو بُھوک اور سخت رُتوں کی مار ہے ہم اُدھر تو واپس نہیں جائیں گے۔ اور بولو تم کہاں کے ہو؟ یہاں کے ہو تو کب کے ہو؟ جب یہاں کی سات ندیاں پہلی بار پہاڑوں سے اُتریں اور انہوں نے میدانوں میں اپنا اپنا راستہ بنایا تو تم یہاں تھے؟ نہیں یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا، تم بھی تو کہیں اور سے اِدھر آنکلے تھے۔ بس ایسے ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ راستہ ہوتا ہے تو اُس پر اور پاؤں بھی چلے آتے ہیں۔ اُدھر دیکھو۔" پُورن نے موہنجو ڈارو کی رات میں چُپ چھتوں کی طرف ہاتھ کیا "دیکھو اُدھر سندھو تک تمہاری اس بستی کی ساری چھتیں بالکل سپاٹ اور بالکل سیدھی ہیں اور کہیں کوئی رکاوٹ نہیں، جیسے ایک پکّا میدان ہو۔ یہاں سے وہاں تک۔۔ یہاں سے اس گھر کی چھت سے اگر میں گھوڑے پر سوار ہو کر اُسے ایڑھ لگاؤں تو وُہ اس کی تنگ گلیوں پر سے پھلانگتا سارے موہنجو کی چھتوں کو روندتا سندھو کے پاس جا رُکے گا۔ تمہاری بستیاں ایسی ہیں اور تمہاری چھتیں ایسی ہیں اور تمہاری زمین ایسی ہے کہ اسے گھوڑے روند سکتے ہیں۔ اس میں ہمارا دوش نہیں۔۔۔"

پھاگن کے اخیر کی ہوا میں پالا کاٹتا تھا اور ورچن سندھو میں ہولے ہولے ہلتی کشتی میں اپنے آپ میں اکٹھا ہوتا جاتا تھا، ہوا بدن کو سکیڑتی تھی اور وُہ گھٹنوں میں سر دیئے کانپتا تھا۔ وُہ گھٹنوں میں سر دیئے ایک کونے میں بیٹھا تھا اور کشتی ہولے ہولے ہلتی سندھو میں تیرتی تھی۔

ابھی مُنہ اندھیرا تھا۔ جب وہ دونوں گھاٹ پر آ گئے تھے۔

گھاٹ پر وُہ کپڑا بنانے والوں کے گھروں والی گلی میں سے ہو کر آئے۔ گھروں کے اندر کھڈّیاں چلتی تھیں، تانے اور پیٹے چلتے تھے اور اُن کی آواز موہنجو کی سویر میں گونجتی تھی۔ ورچن جب کبھی ادھر کو آتا تو رُکتا اور سُنتا۔۔۔ دھاگے کی نالی جب تیرتی ہوئی سُوت کے بیچ میں سے گُذرتی اور ہاتھ چھاج کو ایک دھچکے سے اُس ایک دھاگے کو بُنے ہوئے کپڑے کا ایک حصّہ بناتے تو اِس دھچکے سے کھَٹ کی آواز آتی۔ وہاں بہت ساری کھڈیاں تھیں اور اُن سب کی آواز مل کر موہنجو کے اندر ہی اندر کھَٹ کھَٹ کرتی گُم ہوتی رہتی تھی۔ ورچن اس گُم ہوتی کھَٹ کھَٹ کے لئے وہاں رُکتا اور سُنتا۔ اُس نے اِس لَے کو ساری رُتوں میں سُنا۔ گرمیوں میں یہ کھٹ کھٹ پسینے سے بھیگے بدن پر پھسلتی۔ پالے کی رُت میں یہ بندے کے اندر ٹھٹھّی ہو کر بیٹھتی جاتی۔ برساتوں میں مدھم ہو جاتی اور چاند کا تھال جب پُورا ہوتا تو زمین کو چھوڑ کر اوپر ہی اوپر اُٹھتی جاتی۔۔ اُس کی کشتی سندھو میں تیرتی تھی پر اُس کے کانوں میں چپوؤں کی شپاشپ کی بجائے ابھی تک کھَٹ کھَٹ چل رہی تھی۔

وُہ پچھلی رات اچھی طرح سوئے نہیں تھے اس لئے سویر اُن کے دیکھتے دیکھتے آئی۔ پُورن نے اُسے کچھ کپڑا لتّا اور مُہریں دیں کہ وہاں رواج تھا کہ جاتے ہوئے کوئی نہ کوئی سوغات پوٹلی میں باندھ دی جاتی تھی۔ گھر سے باہر ہوئے تو چوکھٹ پر ایک پنجرہ رکھا تھا جس میں ایک رانگلا پرندہ اونگھتا تھا۔ گھاٹ پر پہنچ کر پُورن نے پنجرہ اُس کے سامنے رکھ دیا جس میں اپنے رنگ برنگے پروں کو سنوارتا پرندہ کبھی حیرت سے کشتی گھر کے ساتھ لگی بڑی کشتی کو دیکھتا تھا "یہ بھی تمہارے لئے ہے"

"اِسے میں رُکھوں، ریت اور پانیوں میں کہاں لئے پھروں گا۔ نہیں میں اس کا دھیان نہیں رکھ سکوں گا تم اِسے واپس لے جاؤ"

"پر یہ سوغات ہے، ہمارا رواج ہے۔"

تمہارا رواج ہے میرا تو نہیں۔"

"دُکھ تمہارے اندر بیٹھ گیا ہے۔" پُورن مسکرایا "تم یہاں کے پرندے کو بھی اپنی بستی میں لے کر نہیں جاتے"

"پرندے وہاں مرنے کے لئے جاتے ہیں۔ جھیل کے کنارے اُن کی ہڈیوں سے اونچے ہوئے ہیں۔ تم کہتے ہو تو لے جاتا ہوں۔"

ملاحوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر پار جانے والے مسافروں کو پُکارا۔

"میں نہ سہی میری آل اولاد میں سے کوئی اُدھر تمہاری بستی کو جائے گا"۔

"تب میں نہ ہوں گا۔" ورچن نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر سہلایا اور پھر اُس کے لئے دل میں اچھا محسوس کیا اور اُس کی گرمی پر ٹھنڈے پانی بہے اور اُسے دُکھ ہوا کہ وُہ اُسے چھوڑتا ہے جس نے اُسے موہنجو میں چھت دی تھی اور وُہ کچھ بتایا تھا جو وُہ نہیں جانتا تھا اور اُسی جاننے کے زور میں وُہ اس کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ بانس کی سیڑھی پر پاؤں رکھتے ہوئے اُسے لگا کہ ابھی پُورن اُس کے پاؤں کو دیکھ رہا ہوگا اور اُس نے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ دیکھتا ہے یا نہیں اور کشتی میں جا بیٹھا۔

کشتی میں پھاگن کے اخیر کی ہوا میں پالا کاٹتا تھا۔

ورچن گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا اور کبھی کبھار سر اُٹھا کر پرے ہوتے موہنجو کی طرف دیکھتا جس کی ہموار چھتیں سویر کی کم روشنی میں ہولے ہولے سرکتی تھیں اور لوتھل جو ایک بڑے گھاٹ والی بستی تھی اور سمندر کے مُنہ میں تھی وہاں سے ایک بڑی کشتی آتی تھی اور موہنجو کو آتی کشتی گھر کے ساتھ ساتھ ہوتی جارہی تھی۔

ڈور گا نے گھٹنوں میں سے تھوڑا سا سر اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ پر ایسے کہ کوئی اُسے نہ دیکھے۔

سندھو کے پار جانے والے بس تھوڑے سے لوگ تھے اور سندھو کے پار جا کر کسی نے کرنا بھی کیا تھا۔ اِدھر تو موہنجو تھا اور اُدھر پار پتہ نہیں کیا تھا، رُکھ اور ریت اور ندیاں تھیں۔ ہاں کسی نے اُسے بتایا تھا کہ اُدھر پار آدھے برس کے چلنے سے ہری یوپیا آتا تھا جو موہنجو جتنا تو نہ تھا پر ایسا ہی تھا۔ تو اِدھر موہنجو تھا اور پار کچھ نہ تھا اب ہر کوئی تو ہری یوپیا نہیں جاتا تھا تو پھر جا کر کسی نے کیا کرنا تھا، رُکھوں کے اندھیروں میں گُم ہو، ریتوں میں بھوکا پیاسا مرے اور ندیوں میں ڈوبے

کیا کرے؟ موہنجو کو چھوڑ کر کون جاتا تھا۔۔۔ پر ڈور گا جا رہا تھا۔

یہ پہلے پانی تھے جو وُہ دیکھتا تھا اور پہلی کشتی تھی جو اُسے پار لے جاتی تھی۔

اُس نے پھر تھوڑا سا سر اُٹھا کر اپنے آس پاس دیکھا۔ سندھو کے پار جن کی کھیتیاں تھیں، چند واہک تھے اور اُن کے مہاندرے ترسے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ وہ بھی اندر سے کڑھتے ہیں۔ چند عورتیں تھیں جو پالے سے بچنے کے لئے مُنہ سر لپیٹے بیٹھی تھیں۔ ایک بچّہ تھا اور وُہ جس کی گود میں تھا وُہ اپنی ٹھٹھرتی ہوئی چھاتی اُس کے مُنہ میں رکھتی تھی پر اُس کا مُنہ بند نہیں ہوتا تھا کہ وُہ بے سُدھ تھا اور تھوڑا اکڑا ہوا تھا اور اُس پر نیر گرتے تھے۔ جانے یہ دونوں پار کیوں جا رہے تھے۔ اور اُدھر رسّوں کے ڈھیر کے پاس گُھٹنوں میں سر دیئے ایک اور مسافر تھا جسے پھاگن کے اخیر کی ہوا کاٹتی تھی۔ یہاں کشتی کے پچھلے حصّے کے مسافر تھے، اگلے حصّے میں اونچی ناک والے بیٹھے تھے یا بیٹھ سکتے تھے۔ وُہیں سے کوئی ہولی آواز میں سندھو کے گُن الاپتا تھا اور کبھی کچھ سنائی دے جاتا اور کبھی آواز پھاگن کی ہوا میں تیرتی دُور ہو جاتی۔

"سات ندیوں میں سے۔۔۔

سندھو ہے جو سب میں سے شاندار ہے۔"

ڈور گا کو جب پہلی ہوا لگی تھی اور اُس نے پہلا سانس لیا تھا اور وُہ ابھی گیلا ہی تھا تو اُس کی میّا نے اُسے بھٹّی کے الاؤ کے سامنے رکھ کر سُکھایا تھا اور اُس بھٹّی میں وُہ اینٹیں پکّی اور سُرخ ہوتی تھیں جو سندھو کے کنارے کی ڈوبو مٹّی سے بنتی تھیں بلکہ جنہیں ڈور گا کی میّا اور باوا اور انگ ساک بناتے تھے اور بناتے چلے آئے تھے تب سے جب سے موہنجو والوں نے جانا کہ کچّی اینٹ کی دیوار یا بند بڑے پانی آنے پر گُھل جاتے ہیں اور اگر اُس اینٹ کو بھٹّی میں چڑھا کر پکا لیں تو وُہ پتھر سے بھی آگے ہو جاتی ہے کیونکہ پتھر سانس نہیں لیتا۔ موہنجو یہ تو نہیں تھا جو اس سمے کشتی سے پَرے پَرے ہوتا دِکھتا تھا، اس کے نیچے جانے کتنے موہنجو دبے ہوئے تھے جو ڈھے گئے اور اُن کے ٹیلوں پر نت نئے موہنجو بنتے گئے۔ اور اُن ساری دیواروں میں، تالابوں اور کنک گھروں اور ویہڑوں اور گلیوں میں، نالیوں اور کنووں میں جو اینٹیں تھیں اور ہزار برس پہلے جب موہنجو بنا تھا اور پہلی اینٹ رکھی گئی تھی اور وُہ اینٹیں جو اب زمین کے اندر تھیں اور اُن کے اوپر جو موہنجو کی بستی اب تھی اس کی بھی اینٹیں۔ یہ سب ڈور گا نے بنائی تھیں۔ اُس نے ان کو بنایا تو تھا پر ان کو دیکھا نہ تھا۔ اُس نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ جب اینٹ پر اینٹ جوڑی جاتی ہے تو کیا کیا مہاندرے بنتے ہیں، ان کی دیواریں کیسی ہوتی ہیں اور گھر اور گلیاں کیسے لگتی ہیں اور ایک پُوری

بستی کیسی ہوتی ہے کیونکہ وُہ اور اُس کے انگ ساک جو پچھلے ہزار برس میں اِن اینٹوں کو اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے اور جُتوں پر ڈھوتے تھے، کبھی بھٹّے کی اونچی چار دیواری سے باہر نہیں گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنا پہلا اور آخری سانس اُس کے اندر لیا تھا۔ وُہ وہیں پیدا ہوئے تھے اور اُنہیں جننے والیوں نے اُنہیں بھٹّی کے الاؤ کے سامنے رکھ کر سُکھایا تھا اور وُہیں مرتے تھے اور اُنہیں کچّے برتنوں میں بند کر کے وُہیں کہیں دبا دیتے تھے، تو وہ مر کر بھی باہر نہیں جاتے تھے۔

ہزار برس پہلے ڈُور گا کے کسی بڑے کو اینٹوں کے بھٹّے کے کسی مالک نے کسی کھیت میں جُھکے دیکھا تھا تو کہا تھا، اِسے چھوڑ میں تمہیں ڈھنگ کا کام دیتا ہوں اور رہنے کو چھپّر اور اَن پانی۔ اور کام ہو نہ ہو اَن پانی ملتا رہے گا۔ اور ڈُور گا کا وہ وڈیرہ بُھوک کا ستایا ہوا تھا اناج کبھی سُوکھتا تھا اور کبھی ڈُوبتا تھا اور اُس کے بال بچّے سُوکھتے تھے اور مرتے تھے اور وُہ اَن پانی کا ترسا ہوا کھیت چھوڑ کر اپنے جیاجنت کے ساتھ اُس چار دیواری کے اندر آگیا جہاں اینٹیں بنتی تھیں اور بھٹّی چڑھتی تھی اور پھر پورے ہزار برس وُہ اُس سے باہر نہیں نکلا آج ڈُور گا نکلا۔

بھٹّے والوں کا ڈھنگ عجیب تھا، وہ اَن پانی دیتے اور رہنے کو چھپر دیتے اور پُورا بال بچّہ اور بڑے بُوڑھے کام میں جُتے رہتے، سویر کرتے اور شام کرتے اور اتنا کام کرتے کہ ان کی ہڈیاں بڑی شتابی سے ڈھیلی اور نرم ہو جاتیں۔ اور اَن پانی بھی نِرا اتنا ملتا جس سے سانس آتا جاتا رہے اور بس۔ اور بھٹّے کا کام کاج بڑا کٹھن تھا، رَت کو نچوڑ کر اُس کی سُرخی کو کالک میں بدلنے والا کام۔ سُرخی اینٹوں میں چلی جاتی اور کالک جُثّے پر ملی جاتی۔ ڈُور گا کی بھی سب لوگوں کی طرح ایک میّا تھی مامن اور چاچُو تھے پر کچھ ٹھیک سے پتہ نہ تھا۔ کسی کو بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ کون کس کا کیا ہے۔ وہ سب وُہیں تھے بھٹّے کے اندر اور ایک دُوسرے کے کچھ نہ کچھ لگتے تھے۔ ڈُور گا کو وہ سویر یاد تھی جب اُسے بچوں میں سے نکال کر بڑوں کا کام دیا گیا تھا۔ چار دیواری کے اندر ایک کھیت تھا جس پر پالے کی سفید کڑکڑاتی چادر تھی اور اُس کے ہاتھ میں ایک کسّی دی گئی کہ یہ کھیت اُس گارے کا ہے جو ٹھنڈی رُت میں بنا تھا اِسے کسّی سے اُٹھا کر اینٹوں کے سانچوں میں ڈالتے جاؤ۔ اور جب ڈُور گا نے کسّی اُٹھا کر پورے زور سے گارے پر ماری تھی تو اُس کے ہاتھ ٹوٹتے بچے اور کسّی اُس کی پکڑ سے چُھوٹ کر دُور تک کھڑکتی چلی گئی پالے کی سفید چادر پر۔ گارا اُوپر اُوپر سے بالکل جما ہوا تھا۔ تب اُس نے دانت بھینچ کر کسّی کے دستے کو زور سے تھاما، ہوا میں اُوپر کی اور گارے پر چلائی اور اُس کی ہڈیاں کڑکڑائیں اور کان جیسے پھٹنے کو آئے پر کسّی تھوڑی سی گارے کے اندر چلی گئی پر پُوری کی پُوری نہیں۔ کئی روز تک اُس کے ہاتھ ٹوٹتے رہے اور

ہتھیلیوں پر چنڈیاں پڑ گئیں تب جا کر وہ گارے کے اُس کھیت کو تھوڑا سا کھود کر سانچوں میں ڈال سکا اور مالک نے اُس کا اَن پانی آدھا کر دیا۔ جب پالے کے دن گئے تو اُس نے مالک کے پاؤں تلے کی مٹّی کو رو رو کر کیچڑ کیا اور کہا کہ مُجھے گارے سے ہٹا لو میں سانچے بھروں گا تو اُس کو ادھر کر دیا گیا جدھر سانچے بھرتے تھے۔

کشتی بہت ہولے ہولے جا رہی تھی پر موہنجو کی آوازیں اب یہاں تک نہیں پہنچ پاتی تھیں۔

لکڑی کے سانچے جن میں دس اینٹیں ایک بار بنتی تھیں بڑے بھاری تھے۔ ڈُور گا اِس سانچے کو گارا ڈالنے والے کے سامنے رکھتا اور جونہی وہ کسّی سے گارا اُٹھا کر سانچے میں بھرتا تو وُہ اُسے دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر بھاگتا ہوا اُس میدان کی طرف جاتا جہاں دُھوپ میں ان گنت اینٹیں سُوکھتی تھیں۔ وہاں پہنچ کر وُہ بھاری سانچے کو اُلٹا کر اُسے دھچکا سا دیتا اور پھر اُٹھاتا تو دس اور گیلی اینٹیں دھوپ میں سُوکھنے لگتیں۔ وُہ سانچے کو اُٹھا کر سر پر رکھتا اور دوڑتا ہوا واپس آتا۔ یہاں وہ سانچے کو ریت کے ایک ڈھیر پر رکھ کر اپنی ہتھیلیوں سے ریت سمیٹ سمیٹ کر اُس میں بھرتا اور پھر فوراً ہی اُسے اُلٹا کر خالی کر دیتا۔ یُوں اینٹوں کے سانچوں میں گیلی لکڑی پر تھوڑی سی ریت لگ جاتی اور جب گارا اُن میں ڈالا جاتا تو وُہ لکڑی کے ساتھ چمٹنے کی بجائے پُوری کی پُوری اینٹ کی شکل میں آرام سے باہر آجاتا۔ ریت کے بغیر گارا اندر ہی رہتا اور اگر باہر آتا تو اینٹ کی بجائے کیچڑ کی صُورت میں گرنے لگتا۔ سو وُہ سانچے میں ریت بھر کر اُسے اُلٹ کر پھر کسّی والے کے سامنے رکھتا جو فوراً ہی اُسے پھر گارے سے بھر دیتا۔ سانچہ اُٹھا کر وہ اندھا دھند بھاگنے لگتا۔ اینٹیں دھوپ میں اُلٹاتا ساری ریت بھر کر سانچہ اُلٹاتا اور پھر ڈُور گا ساری حیاتی یہی کرتا رہا۔ کبھی کبھار اُسے بھٹّی پر الاؤ کو دھیما رکھنے پر بھی لگا دیا جاتا۔

یہ کون ہے جو سامنے کشتی کے ایک کونے میں گھٹنوں میں سر رکھے بیٹھا ہے، ورچن نے سوچا۔

باہر کے لوگ موہنجو کے ڈوبو پانی میں اُگے سرکنڈوں اور جھاڑیوں کو اندر لے آتے۔ اُپلوں کے کھیپڑ بھی لاتے جو بھٹّہ چڑھانے میں کام آتے۔ جب سندھو میں بڑے پانی آتے تو اوپر سے رُکھوں کے تنے بھی بہتے ہوئے آجاتے اور ان سے بھی بھٹّہ گرم ہوتا۔ ہر برس بھٹّے کا مالک دس بارہ زور آور مردوں کو اُوپر بھیجتا۔ وہ سندھو کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہاں تک جاتے جہاں گھنے رُکھوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور پھر اُدھر سے رُکھوں کو کاٹ کاٹ کر سندھو میں

ڈالتے رہتے جن میں سے تقریباً آدھے موہنجو تک پہنچ جاتے۔ ہر بھٹے والے نے اپنے اپنے لوگ بھیجے ہوتے اور وُہ سب اپنے اپنے رُکھوں پر خاص نشان کھود کر سندھو میں ڈالتے تاکہ یہ پتہ چلے کہ کونسا رُکھ کس کا ہے۔ ان میں سے کم تھے جو واپس آتے۔ پر یہ بھی باہر کے لوگ ہوتے، چار دیواری کے اندر والے ہمیشہ اندر رہتے۔ یُوں ڈورگا نے سُنا تھا کہ جب موہنجو میں پہلی اینٹ پکائی گئی تو سندھو کے کنارے رُکھ اتنے گھنے اور بہت تھے کہ دن کو بھی شام ہوتی تھی اور وہ سب دور تک سیاہی لے کر پھیلتے تھے۔ تبھی تو اُن کی مُہروں پر ہاتھی اور گینڈے کی شکل تھی جو ڈورگا نے تو دیکھے نہیں تھے کہ وہ اب تھے نہیں۔ رُکھ ختم ہوئے تو وہ بھی ساتھ میں ختم ہو گئے۔ ڈورگا اُنہیں کیسے دیکھتا؟ وُہ بھٹے سے باہر جا سکتا تو اُنہیں دیکھتا۔ پھر دھیرے دھیرے اُس کی ہڈیوں کا زور سُوکھنے لگا اور اُس کے ہاتھ کانپنے لگے اور دانت کم ہونے لگے اور ایک سویر وہ چھپّر سے باہر آکر سیدھا ہونے لگا تو نہ ہوا، اُس نے سر اُٹھانا چاہا تو وہ بھی نہ ہوا اور اُس نے جان لیا کہ جو ہونا تھا وُہ ہوا اور وُہ جُھک گیا ہے، آخر کو ہزار برس کا بوجھ وہ سہار نہ سکا اور اُس کی کمر میں جُھکاؤ آ گیا۔ عمر بڑھنے سے اور جُھکنے سے وُہ وڈیرہ ہو گیا اور اُسے بھٹہ بنانے کے کام پر لگا دیا گیا، کچّی اینٹوں کو نیچے اُوپر ایسے جوڑنے پر کہ جب الاؤ کی آنچ چڑھے تو ایک ایک کو پہنچ کر سُرخ اور پکّی کرے۔۔۔ پچھلے ہزار برس میں وُہ پہلا تھا جو باہر آیا۔

وُہ سب جو جُھک چکے تھے اور جُھکنے والے تھے وُہ سارا وقت مالک کے ہاتھ کے نیچے اس طرح رہتے کہ مالک اُنہیں مینہ برسنے پر بھی اَن پانی اور چھپّر دیتا۔ مینہ برسے تو نہ اینٹ کے لئے گارا بنتا ہے نہ وہ سوکھتی ہے اور نہ بھٹہ چڑھتا ہے۔ اور جب بادل پرے ہوتے اور دھوپ آتی اور وُہ کام پر لگتے تو وُہ کہتا تم نے اتنے روز ہاتھ پر ہاتھ دھر کر میرا اَن پانی کھایا چھپّر تلے سوئے اور میرا دیا ہوا کپڑا لتّا پہنا تو اب اس کے لئے تمہیں دو مہینے اور کام کرنا ہو گا اور اس سے پہلے تمہاری طرف تین برس ہیں اور اب تین برس اور دو مہینے کام کرو گے تو حساب پورا ہو گا۔ یہ حساب کبھی پُورا نہ ہوا۔ ایک ہزار برس گذر گئے اور پُورا نہ ہوا۔ بچہ پیدا ہوتا اور ابھی اُس کا ناڑو نہ کٹتا تو اُس پر بوجھ پڑ جاتا کہ اس کے حصے میں اتنے برس اور اتنے مہینوں کا کام ہے اور یہ برس اُس کے کُل سانسوں سے بھی زیادہ ہوتے تو وُہ بوجھ کیسے اُتارتا۔ یہ نسل کے آگے بڑھنے سے بڑھتا جاتا۔ ہے ناں اچنبھے کی بات کہ جو اَن پانی اُس کے بڑوں نے پتہ نہیں کھایا بھی تھا کہ نہیں ڈورگا اُس کے لئے جب پیدا ہوا تو جنور ہو گیا اور کام کرتے کرتے کتنی ہو گیا پر بوجھ نہ اُترا۔

دراصل پچھلے ہزار برس میں وُہ پہلا تو تھا جو باہر آیا پر نہیں بھی تھا۔ وہ جو چار دیواری کے اندر سانس لیتے تھے اور مرتے تھے اُن میں سے اکثر اس سوچ سے پَرے تھے کہ اس چار دیواری سے باہر بھی کچھ ہے۔ ہاں کبھی کبھار کسی ایک کے دل میں یہ خیال جڑیں پکڑتا کہ باہر بھی تو کچھ ہونا چاہیئے اگر نہ ہوتا تو ہمیں اُسے دیکھنے سے روکا نہ جاتا۔ مالک اُنہیں ڈراتا کہ تم اِدھر ہو تو تمہیں کوئی ڈر نہیں باہر نکلو گے تو سوائے ڈر کے اور کچھ نہیں۔ اور وُہ کوئی ایک چوری چُھپے چار دیواری میں سے نکلتا اور اپنے آپ کو موہنجو میں گُم کر لیتا پر ایک دو روز میں بھٹے والے کے کامے ڈھونڈتے بھالتے اُسے پکڑ لاتے اور اُس کا حال بُرا ہوتا۔ یوں بھی موہنجو میں وُہ گم کیسے ہوتا، اُس کا مہاندرا الگ سے دکھائی دیتا، اُس کی کالک سے گلیاں کالی ہو جاتیں اور وُہ پکڑا جاتا۔ اور وُہ جُھکا ہوا ہوتا یہ بھی اُسے الگ دکھائی دے جانے کے لئے کافی تھا۔ ویسے وہ جو آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑے بیٹھتے تھے وُہ بھی تو اُن کے ساتھ نہیں تھے، وُہ کہتے کہ اگر مالک کا اَن پانی کھایا ہے، کپڑا لتّا لیا ہے تو اُن کا کام بھی کرو اور اُنہیں واپس لا کر پھر سے کام میں جوت دیا جاتا۔ ہاں ایسا بھی ہوتا کہ کبھی کوئی وہاں سے نکلتا تو موہنجو نہ جاتا کشتی پر بیٹھ کر پار چلا جاتا اور وُہ تو بہت جلد خود ہی لوٹ آتا، اپنے گھٹنوں پر گھسٹتا ہوا، منتیں کرتا کہ میں کبھی نہ جاؤں گا، سندھو کے پار تو بس رُکھ ہیں اور ریت ہے اور نہ کچھ کھانے کو اور نہ پینے کو اور اس کے باوجود ڈورگا سندھو کے پار جا رہا تھا۔ اُس کا سر گُھٹنوں میں تھا اور پھاگن کی ہوا اُس کے جُثّے میں حیاتی بھرتی تھی۔ جو سویر ہونے کو تھی اُس میں اُسے اینٹیں نہیں جوڑنا تھیں۔ رُکھوں میں گم ہو کر موہنجو اور اس کے بھٹوں سے دُور ہونا تھا اپنے آپ کو ایک ہزار برس سے دُور لے جانا تھا۔

ورچن نے پھر اپنے سامنے بیٹھے اُس بندے کو دیکھا جو کبھی کبھار گھٹنوں سے سر اُٹھا کر موہنجو کو تکتا تھا پر اُس کے چہرے پر رنج تھا تو سہی پر جانے کا نہیں، بچھڑنے کا نہیں تھا۔ اُس کے اور موہنجو کے بیچ کچھ تھا جو کشتی بھی اُن دونوں کو ایک دوسرے سے پَرے کرنے کے لئے زور لگاتی تھی۔ وُہ ورچن ایسا ہی تھا، آنا سا تھا پر اُس کی شکل مُورتیوں ایسی سخت پتّھر تھی جیسے زیادہ آگ دینے سے اینٹ کھنگر ہو جاتی ہے۔

ہوا کا بہاؤ بدلا تو وہ آواز جو دُور تیرتی تھی قریب آ گئی۔ کشتی کے اگلے حصے میں کوئی تھا جو سندھو کو دیکھتا تھا اور جو کہتا تھا ورچن کے کانوں میں آتا تھا۔۔۔۔ تم زمین کے خطرناک کناروں پر سے گرجتے گزرتے ہو اور تم بڑے پانیوں کے بڑے ہو اور اُنہیں راستہ دکھانے والے ہو۔ سندھو تمہاری گرج زمین سے اُٹھ کر آسمانوں تک جاتی ہے۔۔۔ جیسے گرجتے بادلوں میں

سے مینہ بڑے پانیوں کی طرح گرتا ہے ایسے سندھو ایک بیل کی طرح ڈکراتا ہوا بہتا چلا جاتا ہے۔۔ اور جیسے مائیں بچھڑوں کی طرف، دودھیل گائیں دُودھ کے ساتھ ایسے شور مچاتے دریا تمہاری طرف آتے ہیں۔۔ تم ایک جنگجو بادشاہ ہو جس کی یہ فوج ہے جب تم ان دریاؤں کو ساتھ لے کر آگے آتے ہو۔ اس دھرتی پر اپنا سایہ کیجئو اے گانگا، یمونا، شتندری پاروشنی اور سرسوتی۔

ورچن نے گھٹنوں سے سر اُٹھایا۔ پاروشنی؟ اُس کا نام یہاں سُن کر وُہ پھر ترسا اور اب وُہ پاروشنی کی باس کے لئے ترسا۔

۔۔ اور اَسکنی کے ساتھ، وِتستا، مارودِوردھا، ارجیکیا اور سوشوما دریاؤ تم میری پُکار سُنو۔۔ اور سندھو کے ساتھ کُوبھا، کرُومو اور گومتی۔۔۔ اے سندھو، اے سندھو۔۔۔

ہوا کا بہاؤ پھر بدلا اور ندیوں اور دریاؤں کو پکارنے والے کی آواز کشتی سے پرے ہو گئی۔

اُس نے پاؤں میں رکھی پوٹلی کی گانٹھ کھولی اور اُس میں ہاتھ ڈال کر اِدھر اُدھر ٹٹولا۔ تانبے کا چوکور ٹکڑا اُس کی اُنگلیوں میں آیا اور اُس کا انگوٹھا اُس پر سے پھسلا کیونکہ وُہ لشکتا تھا اور اِس میں شکل دِکھتی تھی اور یہ پاروشنی کے لئے تھا۔ اُس نے اُسے پوٹلی میں سے نکالا پر ذرا جُھک کر دیکھا اور اُس میں اپنے آپ کو دیکھا۔۔ اُس کے چوڑے ماتھے پر سلوٹیں تھیں جیسے بارش کے بعد کچی دیوار پر بنتی ہیں اور سر کے اور داڑھی کے گھنگھریالے بالوں میں سفید لکیریں تھیں جیسے وُہ کلر میں سے گذرا ہو اور اُس کی شکل کے پیچھے موہنجوڈارو کی بستی آہستہ آہستہ گم ہوتی تھی اور آسمان پر سویر کی سفیدی بڑھتی تھی۔ وُہ اپنے آپ کو دیکھتا تھا کہ ایک زور کا دھچکا لگا۔ کشتی والوں نے لامبے بانس پانی میں سے اُٹھائے تھے اور وہ ریت کے ایک ٹاپو میں دھنس گئی تھی۔ اس کنارے پر گھاٹ نہیں تھا کہ ادھر کو کون آتا تھا اور اگر کوئی آئے تو کہاں جائے۔ ورچن نے لشکتے تانبے کو پوٹلی میں رکھا۔۔ پالا اب کم ہو چکا تھا اور ہوا میں ٹھنڈک بھی تھوڑی تھی۔ کھیتوں میں کام کرنے والے واہک ہاتھوں میں کھیتی باڑی کے اوزار لئے اور روٹی کی پوٹلیاں اُٹھائے کشتی سے اُترنے لگے۔ اُس نے بچّے کے اکڑے ہوئے جسم کو سینہ کے ساتھ لگایا اور وُہ بھی اُتر گئی۔ ورچن بھی اٹھا اور وہ پلٹ کر موہنجو کو دیکھنے کو تھا کہ پھر اُس نے نہیں دیکھا اور سر جھٹک کر بانس کی سیڑھی پر آ گیا۔ وہ عورت اپنے بچّے کے ساتھ کھیتوں میں جا رہی تھی اور پھر وُہ بیٹھ گئی، پتہ نہیں کیوں۔ وُہ نیچے اُترا سر جھکایا اور کشتی سے دور ہونے لگا اور اُس نے اپنے پیروں کو چٹتی اُس سفید مٹّی کو دیکھا جو کلر تھی اور جو سندھو کے کناروں کو چاٹتی تھی۔ یہ کلر دھیرے دھیرے کھیتوں میں پھیل رہا تھا اور اسی لئے ساری کھیتیاں سندھو سے بہت ہٹ کر تھیں۔

ایک سویر ایسی بھی تھی جب وُہ رات بھر پینڈا کرتا آیا تھا اور تھکن سے چُور اِسی کلرا ٹھی زمین پر گرا تھا اور پھر اُٹھا تھا اور اُس ٹاپو کے ساتھ کھڑی کشتی میں جا گرا تھا۔ اور پھر کشتی ڈولتی ہوئی چلی اور وُہ بے سُدھ پڑا رہا اور پھر سویر کی ٹھنڈک نے اُس کا سانس ٹھیک کیا اور وُہ اُٹھ کر بیٹھا اور سر اُٹھا کر سامنے دیکھا تو اُسے سامنے موہنجو اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وُہ یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ بس وُہ آیا تھا اور اب جا رہا تھا۔۔ اور دوسرے کنارے پر بھٹّے کے ساتھ والے میدان میں پُورن اپنے اسوا کو سدھا رہا تھا۔ پھر اُس نے جو دیکھا جدھر دیکھا پُورن کی نظر سے اور اُس کے کہنے سے دیکھا۔ اور پھر وُہ خود دیکھنے لگا پر اس میں وقت لگا۔ اور اُس نے جو کچھ دیکھا تھا اُسے دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھیل کر بڑی ہو گئی تھیں۔۔ حیرت سے اور ڈر سے۔ وُہ سب وہاں گھاگرا کے کنارے آلکس اور آرام سے زندگی کرتے تھے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ کئی سو برسوں سے اونچی ناک والے ادھر کو آتے تھے اور اپنے اسوا پر بیٹھ کر آتے تھے اور پھر یہیں بس جاتے تھے۔ اُنہوں نے باتیں سُن رکھی تھیں پر اُن کو پکّا پیڈا پتہ نہیں تھا کہ یہ اونچی ناک والے کیا ہیں اور کیسے ہیں اور کہاں سے آتے ہیں اور کیوں آئے ہیں۔ اب ورچن نے اُنہیں بتانا تھا۔

سُورج اُس کے سامنے ہوا تو سویر کی ٹھنڈک بالکل ختم ہو گئی۔۔ پر وُہ سر جھکائے چلتا رہا۔ اور جب سُورج اوپر ہوا تو سندھو کے ڈوبو پانی میں اُگے سرٹوں میں سے پکھیرو نکلے اور اُن کے پَر روشنائی سے لشکتے چاندی ہوئے اور اُن کا شور ورچن نے سُنا۔ وُہ جانتا تھا کہ اگر وُہ سندھو کے پار آ کر ناک کی سیدھ میں چلتا جائے تو آخر کو شتندری کے سامنے آ نکلے گا پر اس میں کچھ خطرہ تھا۔ اگر اُس کی ناک کی سیدھ ٹھیک نہ ہوئی تو۔ وُہ مُسکرایا۔ وہ آناسا تھا اور اُس کی ناک ہی نہیں تھی تو پھر وُہ اُس کی سیدھ میں کیسے چل سکتا تھا۔ دوسرا راستہ یُوں تھا کہ وہ سندھو کے بہاؤ کے ساتھ نیچے کو چلتا جائے اور پھر اُس جگہ پر نکلے جہاں پر سندھو میں شتندری کے پانی آ ملتے تھے۔ یہاں سے وُہ شتندری کو پار کر کے پھر اُوپر کی طرف جدھر سے وُہ آ رہا تھا اُدھر کو چلنے لگے۔ اب پھاگن کا اخیر تھا اور وُہ چیتر کے اخیر تک اور حدوساکھ کے پہلے دنوں میں گھاگرا کے کنارے وہاں پہنچ سکتا تھا جہاں درشدوتی ندی اس کے بہاؤ میں آ کر ملتی تھی اور اپایا ندی ساتھ میں بہنے لگتی تھی۔ اور وہاں سے اُس کی بستی قریب تھی، آدھے چاند چکر سے بھی تھوڑے فاصلے پر۔

وُہ سندھو سے تین کوس دُور ہوا اور پھر اس کے پانیوں کو اپنے دائیں جانب رکھ کر سر جھکائے اُن کھیتوں میں چلنے لگا جن میں وُہ واہک جُھکے ہوئے تھے جو اُس کے ساتھ کشتی پر آئے تھے پر اُنہوں نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا نہیں اپنے کام کاج میں مگن رہے۔ کنک کے سِٹّوں میں سبز کچّا

دانہ پڑنے سے اُن کی باس الگ ہو چکی تھی جیسے عورت میں بیج پڑ جائے تو اُس کے بدن کی باس بھی پہلے سے الگ ہو جاتی ہے۔

دو تین کوس اور چلنے سے کھیتیاں بھی پیچھے رہ گئیں۔

اور اب وہاں ایسے رُکھ تھے جن کی شاخیں اور پتّے اور ڈالیاں بس میں یوں گُتھے ہوئے تھے کہ وہ یوں تو بے انت تھے پر ایک ہی لگتے تھے۔ ورچن ایک پل کے لئے رُکا اور پھر سانس بھر کر اُس ایک بڑی اور گھنی ہریاول کے اندر داخل ہو گیا۔

اور چیتر کا اخیر ہوتا تھا جب وُہ درشدوتی کے پانیوں تک پہنچا اور شام ہوتی تھی اور دھیرے دھیرے پودے پتّر اور شکلیں گُم ہوتی تھیں اس لئے وُہ ٹھہر گیا۔ اُس کے پاؤں بھی سُوجتے تھے اور پنڈلیوں میں ناڑیں تھکن سے ٹوٹتی تھیں اور ایک دوسرے کے اوپر ہوتی تھیں۔ اُس کا مُنہ سُوکھتا تھا اور پیٹ میں کچھ بَل کھاتا تھا۔ اُسے سفر میں بہت دن اور بہت راتیں ہو چکی تھیں۔ وہ پوٹلی سرہانے رکھ کر درشدوتی کی طرف مُنہ کر کے لیٹ گیا۔

پانی پر کالک سی اُترتی تھی اور اُس میں سارا کُچھ گُم ہوتا تھا اور وُہ پکھیرو بھی جو رُکھوں میں سے نکل کر پانیوں پر اُڈاری مارتے تھے۔ وُہ بھی گُم ہوتے تھے۔

اُس کے پیچھے اُن رُکھوں میں سے جن میں سے وُہ کئی دن اور کئی رات کے بعد نکلا تھا اور اپنے سامنے اس ندی کو ایسے لیٹے پایا تھا جیسے یہ تھمی ہوئی ہو اور اس کے پانی ٹھہر چکے ہوں اور صرف اُن رُکھوں کی گھنی شاخوں کے مہاندرے اُن میں دِکھتے تھے جو اُن پر جُھکتے تھے تو اُنہی رُکھوں میں سے مور کی آواز آئی "می آؤں۔ می آؤں" اور ورچن کے کان اُس کی آواز پر لگے اور ماتھے پر بَل چڑھائے سننے کے لئے تیار رہا پر وُہ پھر نہ بولا۔ اسی لئے اُسے شک ہوا کہ وہ وہاں بولا تھا اور اُس کی آواز اُسے یہاں آئی تھی اور وُہ جانتا تھا کہ وُہ آرہا ہے۔

درشدوتی کے پانیوں کے اوپر ٹھہری ہوئی کالک پھیل کر کنارے تک آئی اور پھر رُکھوں کے اندر چلی گئی۔

اُسے اپنے پکھیرو ہونے کا خیال آیا۔۔۔ اِدھر موہنجو سے اِدھر جب وُہ رُکھوں میں آیا تھا تو اندر جیسے رات تھی اور وُہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا تھا اور دیر تک آنکھیں جھپکتا تھا اور پھر اُس کو کُچھ کُچھ سُجھائی دیا۔ اور وُہ بہت دن اور بہت رات ان رُکھوں میں رہا۔ چلتا رہا۔ جب اندھیرا ذرا گاڑھا ہوتا تو وُہ جان لیتا کہ اب باہر رات ہے اور وُہ پوٹلی سرہانے دھر کر اپنے لِنگ سیدھے کر لیتا۔ اِن رُکھوں کے گھنے اور ٹھہرے ہوئے موسم میں پہلے تو ہر شے ٹھہری ہوئی تھی۔ ٹہنیاں ایسے تھیں

کہ اُنہیں دیکھتے رہو تو وُہ بڑھتی ہوئی دِکھتی تھیں اور دیکھتے دیکھتے اُن میں سے ایک ہری بُوند پھوٹتی تھی جو دھیرے دھیرے پتّے کی شکل اختیار کرتی جاتی تھی۔ پر ایسا تب ہوتا تھا جب آنکھیں اُس پر جمی رہیں اور سانس بھی زور سے نہ لیا جائے۔ تو ورچن کئی بار رُکتا تھا اور کسی شاخ کو دیر تک دیکھے جاتا تھا اور وُہ پھر اُس کے سامنے ذرا کانپتی تھی پر بہت ہی تھوڑی سی، ایسی کہ شک ہوتا تھا کہ نہیں کانپی اور وُہ اصل میں بڑھتی تھی اور یُوں وہ رُکھ اُس کے سامنے اور گھنے ہوتے تھے۔ تو اِن رُکھوں میں ہر شے ٹھہری رہتی تھی سوائے ٹہنیوں اور پتّوں اور پودوں کے جو بڑھتے جاتے تھے۔ اور اگر کان لگا کر سُنا جاتا تو اُن کے بڑھنے کی سرسراہٹ بھی سُنائی دیتی تھی۔

تو یہاں جب ورچن سوتا تو اُس کے اوپر ہریاول کا آسمان تنا ہوتا اور ارد گرد سبزے کی مہک تیرتی۔ اِن رُکھوں میں کوئی جنور یا پکھیرو نہ تھا! کوئی کیڑا مکوڑا نہ تھا صرف وہ آپ تھے جو بڑھتے جاتے تھے۔ اور پھر یہ کم گھنے ہونے لگے۔ ان کے ہرے چھپّروں میں سے کبھی آسمان دِکھتا۔ جیسے اُن کی چھت ٹوٹ رہی ہو اور جہاں جہاں سے یہ چھدرے ہوتے اور پتّوں میں سے آسمان نظر آتا وہاں سے ہوا کے ساتھ پکھیرو اندر آتے اور اُس کے ٹھہراؤ میں شور مچا کر اُسے توڑتے۔۔۔ اور پھر یہ ہوا کہ چُپ اور ٹھہراؤ تو گئے اور شور اندر آگیا۔ عجیب رنگوں اور نسلوں کے پکھیرو وہاں آ کر اُس کے سر پر چہکتے اور اُس کے کان کھاتے۔ یہ پکھیرو کبھی چُپ نہ ہوتے۔ جب وُہ چلتا تو اُس کے کندھوں پر بیٹھے رہتے اور وُہ اتنے زیادہ تھے کہ اب اُن کی وجہ سے اندھیرا بڑھتا تھا۔ وُہ لنگ سیدھے کرنے کو لیٹتا تو وُہ اُس پر ایسے اور اتنے بیٹھتے کہ اُسے ڈھک دیتے، کروٹ بدلنے سے اُن میں سے ایک دو اُس کے نیچے دب جاتے اور پہلے سے زیادہ شور مچاتے۔ ایک سویر جب وُہ سو کر اُٹھا تو وہ خود شور مچا رہا تھا اور پکھیروؤں کے ساتھ چہچہا رہا تھا۔ وہ ویسا ہی ہو گیا جیسے کہ وُہ تھے پر وُہ یہ نہ جان سکا کہ اُس کے پروں کا رنگ کیا تھا۔ اور ایک سویر پھر وُہی چُپ لوٹ آئی۔

درشدوتی کے پانیوں کے اوپر ٹھہری ہوئی کالک پھیل کر کناروں سے رکھوں کے اندر تک جا رہی تھی اور وُہ پوٹلی سرہانے رکھے اُسے دیکھتا جاتا تھا۔ دیکھتا جاتا تھا اور اُس نے آنکھیں جھپکیں تو شام گہری ہو کر رات ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک وُہ رُکھوں میں سے آیا تھا اور اب درشدوتی کے پار اُسے ریت میں چلنا تھا۔

رات وہ اچھی طرح سویا۔ بس کبھی کبھار پانی میں کوئی شے لوٹتی اور ہلکا سا شور ہوتا تو وُہ آنکھیں کھولتا اور بند کر لیتا۔ بڑی مچھلیاں تھیں جو اچھلتی تھیں اور بہاؤ پر گر کر نیچے چلی جاتی تھیں۔۔ مُنہ اندھیرے سویر کی تازہ ٹھنڈک اُس کے بدن کے لُوئیں ابھارتی ہوئی پھیلی تو وُہ آنکھیں ملتا اُٹھ بیٹھا۔ سروٹوں میں سوئے ہوئے پکھیروؤں میں سے کوئی کوئی پَر جھاڑتا تھا اور بولتا تھا اور درشدوتی کے پانی اب ٹھہرے ہوئے نہیں لگتے تھے بلکہ وہ بہتے تھے اور کناروں سے لگ کر پیچھے ہوتے تھے اور سُنائی دیتے تھے۔ ورچن نے لُنگی اُتار کر پوٹلی میں باندھی اور اُسے اپنے سر پر اچھی طرح سے جما لیا۔ اُس نے پانی میں ٹھِل کر پار جانا تھا۔ جب وُہ آیا تھا تو کوس دو کوس پرے سے اُس نے اس ندی کو پار کیا تھا۔ وُہ ایک ہاتھ سے پوٹلی سنبھالے آگے ہوا، اُس کے تلوے کنارے کی گیلی ریت پر بوجھ ہوئے تو ٹھنڈ اُس کے ننگے پنڈے میں لہریں لیتی تیرتی گئی اور سر کے بالوں تک جا پہنچی۔ وُہ ٹھٹھرنے لگا۔ اُس نے ایک اور قدم اٹھایا تو پانی ٹخنوں پر چڑھتا گھٹنوں تک آیا اور تب اُس کے پیچھے ہِل جُل سی ہوئی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے آسمان ہوا جس پر ابھی روشنی نہیں تھی اور پھر رُکھ تیزی سے گزرے اور پانی نزدیک ہوئے اور پھر وُہ خود پانی میں تھا اور ساتھ ہی اُس کے ننگے پنڈے کے گرداگرد جیسے کائی کے ڈھیلے بازو کسے جانے لگے اور کوئی اُس کو لپیٹ میں لیتا تھا۔ وُہ پانی کے اندر تھا اور اُس نے جو سانس لیا وہ بھی پانی تھا۔ اُس نے اپنے کو چھڑانے کے لئے زور لگایا پر وُہ اور نیچے جاتا تھا اور پانی اُس کے بدن میں بھرتا جاتا تھا۔ اُس نے جان لیا کہ کوئی جنور ہے جو اُس کے گرد لپٹتا ہے اور اُسے پانی میں گرا کر ڈبونا چاہتا ہے۔ اُس نے بہتیرا زور لگایا پر اس کا مُنہ سَر اور ناک پانی میں ہی ڈوبے رہے اور وہ سانس کے لئے کھانستا اور تڑپتا رہا، اُس کے ننگے پنڈے پر کوئی جم کے بیٹھا ہوا تھا اور اُس کی گردن دبوچتا جاتا تھا۔ یَم کے کتّے مجھے کس جگہ پر لینے آگئے۔ یہاں؟ کہاں؟۔۔۔ یہ کہاں ہے جہاں میں ہوں۔ درشدوتی کا کوئی کنارہ۔ موہنجو اور گھاگرا کے بیچ میں کہیں۔ اور۔ یہیں میرا بدن پُھولے گا اور پانی ہو کر ندی میں بُو پھیلائے گا۔ وُہ کھانس رہا تھا اور اُس کے ناک مُنہ سے پانی اُبلتا تھا جب اُس کے بالوں کو مٹھّی میں جکڑنے والے ہاتھ نے اُسے جھٹکا دے کر پانی سے باہر نکالا اور بولا ”تُو مجھے پار لے جائے گا؟“ پھر مٹھی کُھلی اور ورچن بے حال ہو کر پانی میں گرا۔ ایک دو ڈبکیوں کے بعد اُس نے ہوش کی اور سر باہر لے آیا۔ اُس نے چند گہرے سانس لئے، ہوا کو اپنے اندر کھینچا، ناک میں سے پانی سُنکا اور پپوٹوں پر ہاتھ پھیر کر اُوپر دیکھا ”تُم یَم کے کُتّے ہو؟“

”یَم؟“ وُہ اُس پر جُھک گیا ”کیا بولتے ہو؟“

وُہ جنور نہیں تھا ایک جھکا ہوا بوڑھا تھا۔ اتنا زور والا بھی نہیں تھا بس اُس نے دھوکے سے اور پیچھے سے اُسے آپکڑا تھا۔

”یَم۔ موت کے کُتّے جو ہمیں لینے آتے ہیں۔“ ورچن کھانستا ہوا بولا اور اُس کی ناک سے پانی

بہتا تھا۔

"نہیں وِیر نہیں۔ تمہارا سانس تو نہیں رُکا؟" وُہ اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کے گال پر تھپکی دے کر کہنے لگا۔ ورچن کا آنکھوں سے پانی صاف ہوا اور دم درست ہوا تو اُس نے اُسے دیکھا اور دیکھتے ہی جان لیا کہ یہ وُہ ہے جو موہنجو کے اس پار آنے والی کشتی میں اُس کے سامنے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا اور تب پھاگن کے اخیر کی ہوا میں پالا کاٹتا تھا۔ ورچن کا سانس پھر اُلٹنے لگا، وُہ اُسے بار بار اندر کھینچتا تھا اور پھر کھانستا تھا۔

"میں نے تم پر سخت ہاتھ ڈال دیا۔" وُہ جُھکا اور اپنے بندھے ہوئے ہاتھ ورچن کی ناک کو چُھوئے جیسے شرمندہ ہو "میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بس مُجھے پار لے چلو"

"تم ہو کون؟" ورچن نے باریک اور تھمتی آواز میں پُوچھا۔

ڈور گا نے بتایا ـــــ

"اور تم میرے پیچھے چلے آئے اتنے دن اور اتنے رات۔ تم میرے قدموں کے اوپر آتے تھے چُپکے چُپکے۔ میرا پیچھا کرتے تھے۔ پر جب ہم اس پار اُترے تو تم میرے ساتھ کیوں نہ چل پڑے؟"

"اُٹھو۔ اِدھر کنارے پر آ بیٹھو سُوکھی زمین پر۔" ورچن کی پوٹلی جو پانی میں ڈوبنے سے بھاری ہو رہی تھی اُس نے اٹھائی اور اُسے سہارا دے کر پانی سے باہر لے آیا "بچھڑا گائے کے ساتھ نہیں چلتا پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ میں اُس سویر جب پھاگن کے اخیر کے ہوا میں پالا کاٹتا تھا ایک بچھڑے جیسا تھا جو گیلا گیلا باہر آتا ہے اور اپنے آپ کو سہار نہیں سکتا اور جب خشک اور گرم ہوتا ہے تو کانپتی ٹانگوں سے اٹھتا ہے اور ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ بھٹے کی چار دیواری میں سے نکل کر جب میں جھکتا ہوا اور چُھپتا گھاٹ تک پہنچا تو میری کانپتی ٹانگیں بھی مجھے سہارنے سے انکار کرتی تھیں اور میں بڑی مُشکل سے کشتی میں آیا اور ایک کونے میں ڈھیر ہوا۔ مُجھ سے پہلے ہر برس ایک دو تو نکلتے تھے پر وُہ میری آنکھوں کے سامنے واپس لائے جاتے تھے اور میں نہیں لایا جانا چاہتا تھا۔ دوسرے کنارے پر جو وہ ایک اُترے وُہ تو اپنے اپنے کھیتوں میں جا جُھکے پر صرف تم تھے جو سندھو سے دُور ہوتے تھے اور موہنجو کے بھٹوں سے پرے جاتے تھے۔ میں بھی ان دونوں سے اتنا پَرے ہونا چاہتا تھا کہ میرے اور اُن کے بیچ اتنی ندیاں اور رُکھ اور ریتیں آجائیں کہ وُہ مُجھے واپس نہ لے جاسکیں۔ مُجھے کیا پتہ کہ تم کون ہو کدھر جاتے ہو پر اتنا جان گیا تھا کہ موہنجو سے دور جاتے ہو اور اس لئے میں تمہارے پاؤں کی چھاؤں پر چلتا تمہارے پیچھے آتا رہا۔ جب تم

رات کاٹتے تھے اور سوتے تھے تو میں تمہیں دیکھتا تھا۔ جب تم ڈوبو مٹی پر اُڑتے پرندوں کو کھانے کے لئے مارتے تھے پر وُہ مرتے نہ تھے تو میں دیکھتا تھا۔ جب کالے سیاہ رُکھوں کے اندر ڈر تمہارے اندر بیٹھ جاتا تھا اور تم سوتے میں بھی چیختے تھے تو میں سنتا تھا۔ اور میں نے تمہیں دیکھا کہ تم ایک سُوکھی ٹہنی کو ہرا ہوتے دیکھتے ہو، اُس میں سے پتے نکلتے ہیں اور تم اُن کی سرسراہٹ سُنتے ہو۔ اور جب تم پکھیرو بنے تو میں نے تمہاری بولیاں سُنیں۔ ہاں مُجھے آس پاس کا کُچھ پتہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں، میں صرف تمہیں اپنے آگے دیکھتا تھا اور چُھپ کر چلتا تھا۔"

"پر تم نے تو نِرا موہنجو اور اس کے بھٹوں سے دور ہونا تھا تو جب دور ہو گئے تو پھر میرا پیچھا کیوں نہ چھوڑا۔" ورچن کو ٹھنڈ لگ رہی تھی پر وُہ سُکڑ کر بیٹھا اُس کی باتیں دھیان سے سنتا تھا۔

"بیچ میں ایک بار میں نے تم کو چھوڑ دیا۔" ڈور گا کُچھ شرمندہ ہوا اور بولا "پر پھر مُجھے ڈر لگا"

"ہاہا۔" ورچن اپنے کانپتے جُسے کے ساتھ ہنسنے لگا "تمہیں بھی ڈر لگا؟۔ تم تو خود جنوروں ایسے ہو"

"ہاں میں ایک جھکا ہوا جنور ہوں پر پھر بھی مُجھے ڈر لگتا ہے کیونکہ میں نے کالی راتوں میں رُکھوں کے بیچ میں سے اُٹھنے والی آوازیں، پکھیروؤں اور جنوروں کی پہلے کبھی نہیں سُنی تھیں۔ بھٹوں کی چار دیواری کے اندر نہ رُکھ ہوتے ہیں اور نہ پکھیرو۔ اور میں کبھی باہر نہیں نکلا تھا اور کبھی ان کو نہ دیکھا تھا اور نہ سُنا تھا اس لئے ڈرتا تھا کہ یہ کیا ہیں اور کیا بولتے ہیں۔ ہاں تو پھر جب میں نے تمہیں چھوڑ دیا تو رات کو مُجھے ڈر لگا، میں نے اکیلے میں جب یہ آوازیں سُنیں تو میرا جُسہ کانپا اور میری آنکھوں نے دیکھنا بند کر دیا اور پھر میں تمہیں آوازیں دینے لگا"

"مجھے؟"

"ہاں۔ جنم لینے کے بعد میں نے تمہارے پیچھے چل کر چلنا سیکھا تھا اور جب الگ ہوا تھا تو ڈرتا تھا تو پھر میں اور کسے پکارتا۔ اور میں تو تمہارا نام لے کر کیسے پکارتا، بس ہلکائے ہوئے بھینسے کی طرح ڈکراتا تھا کہ شائد تم سُن لو۔ اور جب کوئی جواب نہ آیا تو پھر میں اندھا دُھند رُکھوں میں سے اور سروٹوں اور جھاڑیوں میں سے ایسے بھاگا جیسے بھٹے کا مالک اور اُس کے چاکر مُجھے پکڑنے کو آتے ہوں۔ ہاں تم چلتے بہت شتابی ہو۔ پُورے دو دن اور ایک رات میں ایسے بھاگتا رہا اور پھر تمہیں دیکھا جاتے ہوئے دیکھا تو نہیں جانا کہ تم ہو۔ میں نے تمہیں جاتے ہوئے ایسے جانا کہ تم جہاں تھے وہاں پکھیرو اُڑتے تھے۔ ہاں۔ وہاں اونچی اونچی گھاس تھی تم سے بہت اونچی

اور تم اُس کے اندر او جھل ہو کر کہیں چلتے تھے اور میں نے دُور سے دیکھا کہ اُس گھاس میں سے چھوٹی چھوٹی چڑیاں پُھدکتی ہوئی اڑتی جاتی ہیں، گھاس میں سے نکلتی ہیں جیسے کوئی اُنہیں اُڑا رہا ہو۔ اور یہ تمہارا راستہ تھا"

"اور تم نے جان لیا کہ یہ میں ہوں جو گھاس میں او جھل چلتا ہوں۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتا تھا؟"

"اور کون؟۔ میں اتنے دن تمہارے پیچھے چلتے، تمہیں چلتا دیکھتے اچھی طرح جان گیا تھا کہ تم کس طرح اور کیسے قدم اٹھاتے ہو۔ تم بالکل سیدھ میں نہیں چلتے بلکہ کچھ بل کھا کے ایک طرف جُھکے ہوئے چلتے ہو۔ اور اونچی گھاس میں سے شور مچاتی چڑیاں جو اوپر اٹھتی تھیں، وُہ اُسی طرح ایک سیدھ میں نہیں بلکہ کبھی یہاں سے اور کبھی ذرا پرے سے ہٹ کر اُڑتی تھیں۔ وہاں تم تھے مجھے پتہ تھا۔ اور میں اتنا خوش ہوا کہ جیسے میں نے اپنی میا کو دیکھ لیا ہے اور میں بھاگ کر تمہیں پکارتا ہوا تم تک آنا چاہتا تھا پر پھر میں ڈر گیا۔"

"تمہیں کہتے کیا ہیں؟" ورچن نے اُکتاہٹ سے پوچھا کہ وُہ اس کہانی سے تنگ آنے لگا تھا۔

"ڈور گا۔"

"پھر ڈور گا۔ یہ سب تو میں سمجھتا ہوں پر یہاں جب میں اس ندی کو پار کرنے کے لئے پانی میں قدم رکھتا تھا تو تم مُجھ پر اس طرح کیوں کُود پڑے کہ مُجھے مارنے کو تھے؟"

"میں پھر ڈر گیا تھا۔"

ایک تو تم ڈرتے بہت ہو۔ "ورچن نے زمین پر تھوکا" اور اتنے بوڑھے ہو پھر بھی ڈرتے ہو"

"دیکھو۔ جب میرے پاؤں تلے پیڈی مٹی آتی تھی تو میں چلتا تھا۔ جب اونچی گھاس ہوتی تھی یا گھنے رُکھ ہوتے تھے تو میں تمہارے پیچھے چلتا تھا پر یہاں اس ندی کے کنارے آکر میں ٹھٹکا۔ تم آئے اور یہاں ریت پر سو رہے۔ میں پرے تُھا اُدھر رُکھوں کے اندر پر تمہیں سامنے رکھ کر سوتا تھا۔ اور پھر سویرے میری آنکھ کُھلی تو میں نے دیکھا کہ تم لُنگی اُتار کر پوٹلی میں رکھ رہے ہو اور۔۔۔"

"تو آجاتے پیچھے پیچھے جیسے اتنے دن اور اتنے رات سے میرے پیچھے چھپکلے کی طرح رینگتے آتے رہے ہو۔" ورچن کے اندر غصہ اُبل رہا تھا۔

"آتو جاتا۔ پر میں تیر نہیں سکتا ڈور گا بے چارگی میں تھا" "میں نے کبھی اتنا پانی ہی نہیں

دیکھا تھا چار دیواری سے نکلنے سے پہلے۔ اُس سویر جب میں وہاں سے نکلا تو پہلی بار سندھو کو دیکھا ایسے کہ پانی پھیلا ہوا ہے۔ پر اُس میں کشتی تھی پار جانے کو۔ اب یہاں اس ندی کو دیکھا تو یہاں صرف تم تھے پار جانے کو۔ اور میں نے سوچا کہ اگر یہ مجھے چھوڑ کر ندی پار چلا گیا تو پھر میں ادھر کیا کروں گا۔ کدھر جاؤں گا۔ ساری حیاتی یہیں بیٹھا رہوں گا اور وُہ مجھے ڈھونڈتے بھالتے یہاں تک آجائیں گے اور مُجھے لے جائیں گے۔ تو میں پھر ڈر گیا"

"اچھا" ورچن نے غصے سے سر ہلایا" تم پھر ڈر گئے؟"

"ہاں"

ورچن نے ڈور گا کو غور سے دیکھا جو اب ایک بوڑھے بیل کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا اور کبھی کبھار زور زور سے آنکھیں جھپکتا تھا۔ اور پھر وُہ ہنسا۔ اور ورچن کی ہنسی سے ادھر رُکھوں کے اندر سے کُچھ پھڑپھڑایا۔ "اچھا میں تمہیں اپنی پیٹھ پر بٹھا کر پار لے جاؤں، میں کوئی بھینس ہوں؟"

ڈور گا چُپ چاپ سر جھکائے آنکھیں جھپکتا بیٹھا رہا۔ ورچن بولے چلا جا رہا تھا اور اپنا غصّہ دکھا رہا تھا اور وُہ چپ چاپ بیٹھا سُن رہا تھا۔

پانی پر ٹھہری ہوئی دُھند کم ہو رہی تھی اور روشنائی بڑھتی تھی۔

آخر کو ورچن دھیما ہوا۔ اُس کے سامنے سر جھکائے جو بوڑھا تھا اُس پر اُسے ترس آیا اور اُس کے مہاندرے پر بھی یہ تھا کہ وُہ ترسا ہوا ہے اس لئے آخر کو ورچن دھیما ہوا اور کہنے لگا "ندی میں اُتریں گے تو پانی دھیرے دھیرے گہرا ہو گا۔ گھٹنوں تک، کمر تک اور پھر کندھوں پر آئے گا اور تب میں پنجوں پر بھار ڈال کر ٹھلنے لگوں گا، تم نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھنا ہے صرف سہارے کی خاطر اور تم آپو آپ میرے ساتھ چلے آؤ گے۔ گھبرانا نہیں میں تمہیں نیچے نہیں جانے دوں گا۔ آؤ۔ اور اگر کوئی بڑی مچھلی یا مگرمچھ چُھو کر گزرا تو شور نہیں مچا دینا، ایسا ہوتا ہے۔ آؤ"

وہ دونوں ایک دوسرے سے ڈرتے پانی میں اُترے۔ اور جب وُہ ندی کے بیچ میں تھے تو ڈور گا نے یکدم شور مچا دیا، دونوں ہاتھوں سے ورچن کو دبوچنے لگا اور دھکیلنے لگا اور یُوں ورچن نیچے گیا اور ساتھ میں ڈور گا بھی۔ جب وُہ دونوں ہاتھ پاؤں مارتے اوپر آئے تو ورچن پانی کے کسی جنور کی طرح پھسل کر ایک طرف ہوا اور اپنے آپ کو ڈور گا سے پرے کرتا ہوا بولا "مجھے ڈبوتے ہو؟"

ڈور گا ہاتھ پاؤں چلاتا دوسری بار نیچے گیا تو اوپر جس جگہ وُہ نیچے گیا تھا وہاں پانی برابر ہوا۔ اور برابر ہو کر ایسے چمکنے لگا جیسے باقی ساری ندی پر چمکتا تھا اور کنارے کے رُکھوں کا سبزہ اُس پر تیرتا تھا۔ ورچن اُس جگہ پر منظر بس جمائے اڈیک میں رہا، دیکھتا رہا اور پھر خاصی دیر بعد چمکتے پانی میں سے ڈور گا کا سر ایک ٹاپو کی طرح اُبھرا تو اُس کے بالوں کو اُنگلیوں میں جکڑ کر اُس نے اُسے پھر نیچے نہ جانے دیا اور کہا "اب شور مچاؤ گے؟"

ڈور گا کے ناک مُنہ سے پانی بہتا تھا اور وُہ سر ہلائے چلا جاتا تھا۔

ورچن اُسے سہارا دے کر پھر تیرنے لگا "کیا ہوا تھا؟"

ڈور گا نے مُشکل سے ہوش سنبھالا اور کہنے لگا "کس کو کیا ہوا تھا؟"

"تمہیں اور کس کو؟"

"میرے پاؤں جب زمین چھوڑ کر پانی میں تیرتے تھے تو میں بے بس ہوتا جاتا تھا۔" ڈور گا اب ایک ہاتھ سے پانی کو پیچھے کرتا جاتا تھا "اور تم جانتے ہو کہ میں پہلی بار پانی میں ہوں اور مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ کیا ہے جس میں میں ہوں اور زمین پر نہیں ہوں اور پھر بھی ہوں۔ اور پھر میں نے پانی پر سے اُن رُکھوں کا لشکارا دیکھا جنہیں ہم چھوڑ کر آئے ہیں اور میں نے جانا کہ یہ رُکھ ہمارے پیچھے پیچھے چلے آتے ہیں اور اُن میں کوئی ہے۔ میں ڈر گیا تھا"

ورچن یہ سُن کر چپ رہا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں ایک مچھلی کی طرح بل کھاتے تھے اور پانی کے ساتھ ٹکراؤ سے ایک ہلکی چھپاک چھپاک کی آواز آتی تھی۔

"میں چھوٹا سا تھا تو گھاگرا کے پار کچھ کھیتیاں تھیں جو اب نہیں ہیں اور ہم پتہ ہے کیسے پار اُترتے تھے؟ اُدھر جو جنور جاتے اُن میں سے کسی کی دُم پکڑ لیتے۔۔۔ کبھی کسی گائے کی دُم۔ ہاں اُسے تم زور سے پکڑ لو اور سہجے سہجے تیرتے جاؤ۔ تم نے گائے تو دیکھی ہے ناں؟"

"ہاں۔ مالک جہاں رہتا تھا اُس کے پاس تھیں پر میں نے کبھی اُن کا دُودھ نہیں پیا"

"کبھی نہیں؟" ورچن حیران ہوا۔

"نہیں"

"اور بھینس کا؟"

"یہ بھی جنور ہے؟۔ میں نے دیکھا نہیں"

"کالا ہوتا ہے کالا شاہ۔ رُکھوں میں رہتا ہے اور مار ڈالتا ہے پر کئی ایسے ہیں ہماری بستی میں جو جان جوکھوں میں ڈال اُس کے تھن چُنگ آتے ہیں۔ اُس کا ماس بڑا سواد والا ہوتا ہے"

"میں نے کبھی ماس نہیں کھایا۔"

"ہاں میں بُھولتا تھا۔" ورچن کی آواز پانی پر تیری "تمہارا تو ابھی جنم ہوا ہے"

دوسرے کنارے پر زمین دُور تک دِکھتی تھی وہاں رُکھ اور سروٹ نہ تھے دُور تک ٹبے ٹوٹے تھے خالی خالی اور اُن پر آیا ہوا آسمان تھا۔ ورچن نے جانا کہ اب پاؤں زمین پر لگ سکتے ہیں اور اُس نے انہیں نیچے جانے دیا۔ کنارے پر پہنچ کر دونوں ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے۔ وہ تھکاوٹ سے ہونکتے تھے اور اُن کے مُنہ کُھلے ہوئے تھے۔ ڈور گا ذرا ہٹ کر لیٹا۔ تھوڑی دیر بعد ورچن نے پوٹلی میں سے لُنگی نکال کر اپنے گرد لپیٹی اور اُدھر جدھر اُس نے سفر کرنا تھا دیکھا اور ایک گہرا سانس اپنے اندر بھر کر چلا اور ندی سے دُور ہونے لگا۔ وہ زیادہ دُور نہیں ہوا تھا جب اُس نے مڑ کر دیکھا تو ڈور گا کو ایک ڈرے ہوئے بچھڑے کی طرح اپنے پیچھے آتا پایا اور وُہ شائد جانتا بھی تھا کہ وُہ آتا ہو گا۔

وُہ رُک گیا۔ "میرے پیچھے کہاں آتے ہو، ندی تو پار ہو گئی اب کیوں آتے ہو؟"

"میں جانتا نہیں کہ میں نے کہاں جانا ہے۔ اس لئے۔"

"آؤ۔ میں تمہیں گھاگرا کے کنارے اپنی بستی کو لے چلتا ہوں۔ آؤ"

ڈور گا نے یہ سُنا تو سر جھکا دیا کیونکہ اُس کی آنکھوں میں پانی پھوٹنے کو تھے اور پھر اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

چیتر تھا پر یہاں ہوا گرم تھی اور دُھوپ جُتّے میں ریت کی طرح چُبھتی تھی۔ اِدھر اُدھر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں دبکی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں خشک گھاس کے ٹکڑے تھے۔ اُن کے پاؤں کی ریت بھی گرم ہونے لگی اور اُس میں پیر دھنستا تھا اور جلتا تھا۔ سُورج بیچ آسمان اُن کے سروں پر آیا تو ورچن رُکا۔ اُس کا تن بدن پسینے میں تھا۔ "یہاں سے ریت کا سفر شروع ہوتا ہے۔ گھاگرا کے ادھر دِرشدوتی ہے اور دوسری طرف اپایا ندی ہے اور ادھر ہر شے جلتی ہے۔ اب ہم سُورج ڈھلے چلیں گے یا سویر ہونے کے ساتھ۔ درمیان میں سورج کو پرے رکھنا ہے اور کسی ٹیلے یا جھاڑی کی اوٹ لیٹ کر تھکن اُتاریں گے؟"

"کیا تمہاری بستی بھی ایسی ہے۔"

"نہیں نہیں" ورچن سر جھٹکتا کہتا تھا" ریت دس کوہ ادھر ختم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ گرم ہوا اور جلانے والی رُت بھی اور اُدھر ہم پھر گھنے رکھوں کے اندر جائیں گے جن کے بیچ ایک زمانے میں ایک جھیل ہوا کرتی تھی جو اب سُوکھ چکی ہے۔ اُدھر کوئی نہیں جاتا۔ ہاں پاروشنی جاتی

ہے۔"

"پاروشنی کون؟"

"کوئی نہیں۔ اور رُکھوں کے ساتھ ساتھ ڈوبو مٹّی ہے اور اُس سے پرے چیوا کا چھپر اور دُھروا مامن کے بیلوں کا باڑا ہے اور ذرا دُور پکلی کا آوا دکھائی دیتا ہے۔"

"اُس میں اینٹیں پکتی ہیں؟"

"نہیں وہ صرف گھریلو کام کاج کے برتن اور کھلونے بناتی ہے اور پکاتی ہے۔ اور ہاں جُتّے کو دبانے کے لئے بڑے مرتبان بھی۔ پکی اینٹوں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں اُدھر، چھوٹی بستی ہے موہنجو تو نہیں۔ اور پکلی کے آوے کے پرے بستی ہے اور اس کے ساتھ گھاگرا بہتا ہے۔"

"سندھو ایسا ہے؟"

"نہیں۔"

"درشدوتی جیسا؟"

"نہیں۔ بس وہ ایسا ہے جیسا وُہ ہے۔" اُس نے پوٹلی میں سے ایک سُوکھی ہوئی مچھلی نکالی اور اُسے مُنہ میں رکھ کر چُوسنے لگا "یہ بہت سُوکھ گئی ہے ریت کی لکڑی کی طرح۔ تم جب میرے پیچھے آتے تھے تو کھاتے کیا تھے؟"

"میں۔ پانی پیتا تھا"

"بس؟"

"اور پتے کھاتا تھا کھٹ مِٹھے۔ یا جھاڑیوں میں جو بیر ہوتے ہیں کبھی وُہ مل جاتے تھے۔"

"ریت پر تو نہ پانی ہوتا ہے اور نہ رُکھ پتّے اور بیروں والی جھاڑیاں بھی کم ہوتی ہیں۔ اب کیا کرو گے؟"

"میں مروں گا نہیں۔" ڈورگا ماتھے پر سلوٹ ڈال کر بولا۔ "میں جو اب تک نہیں مرا تو پھر نہیں مروں گا۔ تو پھر گھاگرا کیسا ہے؟"

سُورج نیچے ہوا تو پھر وُہ چلے۔

"ریت کے سفر میں ڈر بہت ہے۔" ڈورگا کے پاؤں دھنستے تھے۔

"تمہیں ہر جگہ ڈر دکھائی دیتا ہے" ورچن کی ہنسی کو کسی رُکھ، جھاڑی نے نہ روکا اور وُہ پھیلتی گئی۔ اور اُس وقت ایک چھوٹا سا جنور اُچھل کر اُن کے سامنے آیا اور ورچن نے ڈورگا کے آگے

ہاتھ کر دیا کہ وُہ آگے نہ جائے اور وُہ رُک گیا۔ "ترلاٹھی ہے"

ترلاٹھی کنک کُترنے والے چوہوں ایسی لگتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو زور سے پھلانگ کر چلتی گئی اور پھر ریت میں گُم ہو گئی۔

"یہ کاٹ لے تو بندہ ہوش گنوا دیتا ہے پر اُس سے پہلے چیخیں مارتا ہے اور کُرلاتا ہے۔"

"ریت میں بھی جنور ہوتے ہیں؟"

"کوئی ایک؟ ریت پاگل کرتی ہے، جب میں اپنی بستی سے موہنجو کو گیا تھا تو ریت کے سفر میں مُجھے کئی ایسے ملے تھے جو کھو گئے تھے اور وُہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں اور کدھر سے آئے ہیں۔ وہ بس ادھر گھومتے رہتے ہیں۔ اور پھر میں نے اس ریت میں کئی کُتّے دیکھے جو بالکل باؤلے ہو چکے تھے، وُہ تھوتھنیوں سے ریت اپنے اوپر ڈالتے تھے اور روتے تھے۔ یہ ایسے ہوتا ہے کہ کُتّے کسی سیہے کا پیچھا کرتے ہوئے بستی سے نکل کر ادھر آ جاتے ہیں اور پھر واپسی کا راستہ بھول کر یہیں ہلکائے پھرتے ہیں اور روتے رہتے ہیں۔"

"اب تو مجھے ڈر آنا ہی چاہیئے" ڈورگا کا مہاندرہ کچھ اور سیاہ لگ رہا تھا۔

سورج نیچے ہو کر چلا گیا اور ریت ٹھنڈی ہونے لگی اور اُن کے پاؤں کو سُکھ ملا۔

رات کے کسی پہر وُہ اُن ٹیلوں کے پاس آئے جو اُن کے تھے جو اُن جیسے تھے پر وہاں مر گئے تھے۔ ورچن رُکا۔ وُہ تھوڑی دیر چُپ کھڑا رہا جیسے کچھ گُنتا ہو اور ڈورگا اُسے دیکھ کر چُپ کھڑا رہا۔ پھر اُس نے پوٹلی میں سے پانی کی وُہ چھوٹی مشک نکالی جو ہر مسافر جو ریت کے سفر پر نکلتا ہے اُسے بھر کر نکلتا ہے۔ ورچن نے اس کا منہ کھولا اور بچا کر باری باری سارے ٹیلوں پر تھوڑا تھوڑا پانی گرایا۔

"آؤ چلیں۔" ورچن نے مشک پوٹلی میں رکھی اور چلنے لگا۔

"یہ تم کیا کرتے تھے؟"

"اِن ٹیلوں کے نیچے وہ لوگ ہیں جو ریت کے سفر میں پانی کے بغیر مر گئے، وُہ ترہیائے ہوئے سُوکھ گئے۔ اِن کے اوپر پانی نہ ڈالیں تو یہ پیچھے سے پکارتے ہیں"

"ہیں۔ پکارتے ہیں" ڈورگا کھڑا ہو گیا لیکن وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اُس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا "کیسے پکارتے ہیں اگر مر گئے ہیں تو؟"

"میں تو نہیں مانتا اِن چیزوں کو پر کُچھ پکّا پتہ نہیں ہوتا۔ کیا پتہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ بس کہتے ہیں کہ ان کو پانی پلا کر نہ گزرو تو یہ پیچھے سے پکارتے ہیں کہ ہم ترہیائے ہوئے ہیں ہمیں

پانی دو۔"

"اب تو نہیں پکاریں گے؟"

"نہیں۔ ویسے سُنا ہے کہ جب پکارتے ہیں تو تمہارا نام لے کر نہیں پکارتے۔ تمہارے باوا کا اور پھر اُس کے باوا کا نام لے کر کہتے ہیں کہ ہم منت کرتے ہیں ہمیں پانی دو، ہم پیاسے ہیں۔ لو میں پھر تمہیں ڈرا رہا ہوں۔ کُچھ نہیں ہو گا چلے آؤ۔"

"سُنو۔" ڈورگا تھوڑی دور جا کر بولا "اُن کے ٹیلوں پر پانی نہ ڈالتے تو اچھا تھا۔"

"کیوں؟" ورچن رُک گیا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میرا باوا کون تھا اور اُس کے باوا کا نام کیا تھا تو وہ اگر پکارتے تو مجھے پتہ چل جاتا۔" ڈورگا نے یہ سب کچھ ڈر کے بغیر کہا۔

"تم تو بودن ہو۔ چلو"

پھر وُہ رُکے نہیں اور رات بھر چلتے رہے اور سویرے جا کر رُکے اور وُہ ایسے ہی رات بھر چلتے رہے اور دن کو رُکتے رہے۔

ایک سویر وُہ ویارنا کی مُردہ بستی میں پہنچے جہاں تیز ہوا سے ریت پکّی ٹھیکریوں اور مُہروں پر سے دھیرے دھیرے سرک کر اُن کی شکلیں دکھاتی تھی۔

سُورج چڑھا اور سر پر آگیا اور وُہ ستانے کے لئے ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو بیٹھے۔

"تم یہاں سے اُٹھ جاؤ" ورچن نے اُسے کہا" اُدھر کسی اور جگہ چھاؤں دیکھ کر وہاں جا بیٹھو

کیوں؟" ڈورگا حیران ہوا پر جواب لئے بغیر اُٹھ کر پرے چلا گیا۔

ورچن نے ڈورگا کو اٹھا دیا تھا کہ وُہ اُس کالے ڈر کو اُس کے چہرے پر سمٹتا پھیلتا نہ دیکھ پائے جو اس مُردہ بستی کو سامنے پا کر اُس کے اندر میں سے اُبلتا تھا اور چہرے تک آتا تھا۔ موہنجو جاتے ہوئے وُہ اِس کے پاس سے ہو گزرا تھا پر اس کے اندر نہیں آیا تھا اور آج بھی اگر یہ رات میں اُس کے قدموں کے نیچے سے نکل کر پیچھے رہ جاتی تو وہ خوش ہوتا پر سویر ہونے پر اُنہیں رکنا تھا نہیں تو گرمی اِنہیں جلا دیتی اور جب سویر ہوئی تو وہ ویارنا میں تھے۔ یہاں کبھی کوئی ندی تھی جو اب نہیں تھی۔ شائد یہ آپایا ندی کا کوئی حصّہ تھا جو ادھر کو آتا تھا۔ اور اُس کا پانی دھیرے دھیرے ریت میں گم ہوا اور اس کے ساتھ یہ بستی بھی ریت میں گُم ہوئی۔ اس کے بسنے والے کہاں گئے؟ یہاں ایسی کئی مُردہ بستیوں کے ٹیلے تھے اور اُنہیں نیتن دھاوا بولتے تھے اور اِن

میں ویارنا، سب سے بڑی تھی۔ ورچن سرسراتی ریت میں تکی ہوتی اینٹوں اور ٹوٹے ہوئے برتنوں پر نظر جمائے دیکھتا رہا کہ کیسے بندے کے بغیر ہر شے میں سے حیاتی ختم ہو جاتی ہے اور پھر یہ قیاس کرنا بھی بڑا کٹھن ہو جاتا ہے کہ ادھر ان کھنڈروں میں بھی کبھی لوگ گھومتے تھے، اور کھیتوں کو جاتے تھے اور چھپّروں کو لوٹتے تھے اور بیج ڈالنے کی گیلی گرمی میں ڈوبتے تھے۔

ڈورگا اُس سے ہٹ کر بیٹھا تھا اور یُوں بیٹھا تھا جیسے سندھو میں تیرتی کشتی میں اُس سویر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ پر وُہ اُسے کبھی کبھار سر اُٹھا کر دیکھ بھی لیتا تھا۔

ورچن سائے میں سے اُٹھا تو ایک ریت رنگ بڑی چھپکلی جھجکے بغیر رینگتی ہوئی اُس کے آگے سے گزرنے لگی۔ اُس کے گزرنے سے ریت میں جو راستہ بنتا جاتا تھا اُسے تیز ہوا پھر سے برابر کرتی جاتی تھی۔ کتنے برس ہوئے اِسے اُجاڑ ہوئے؟ کچھ بہت زیادہ تو نہیں ہوئے ہوں گے کہ کُچھ دیواریں اور گلیوں کی نالیاں ابھی تک تھیں اور جہاں کہیں کھیت تھے وہاں اُن کے گرد کی چار دیواریاں بھی ریت میں سے سر نکالتی تھیں۔ جہاں ندی بہتی تھی وُہ حصہ نیچے تھا۔ آس پاس کنارے اونچے تھے اور یہ خشک راستہ تیز دھوپ میں کھا کر ایسے چمکتا تھا کہ دیکھنے سے آنکھیں دُکھتی تھیں۔ یہاں سیپیاں ابھی تک تھیں اور برتنوں کے چھوٹے چھوٹے سُرخ ٹکڑے جن کی گولائی ریت میں سے اُبھری نظر آتی تھی۔ یہاں کے لوگ کدھر گئے۔ یہاں کے ورچن۔ پاروشنیاں۔ سمرو اور پکلیاں کدھر گئے۔۔۔ تپتی ریت دہکتی تھی اور ورچن اُس پر چلتا ہوا پسینے میں بھیگتا تھا۔ دُھوپ اُس کے اندر داخل ہو کر اُسے ندی کے راستے کی طرح خشک کرنے لگی۔ وُہ سُوکھتے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرتا پھر اُسی ٹیلے کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ سایہ چھوٹا ہو چکا تھا، سورج تیزی سے اوپر ہوتا تھا۔

"ڈورگا۔ اب آجاؤ"

ڈورگا ایک سدھائے ہوئے جنور کی طرح اُٹھا اور اُس کے پاس آکر بیٹھ گیا اور مُنہ کھول کر ہانپنے لگا "اِدھر تمہاری طرف سیک بہت ہے، میں تو لُوس گیا ہوں۔"

"بس راستہ ایسا ہے پر ہماری بستی کی ہوا یہ نہیں ہے۔"

"یہاں بھی کوئی بستی تھی؟"

"ہاں تھی۔" ورچن نے کندھے اُچکائے۔۔۔ اور جس سمے ورچن نے اپنے کندھے سکیڑنے کے لئے اوپر کئے اور وہ "ہاں تھی۔۔" کہنے والا تھا اُس وقت وُہ اُسے ریت میں بل کھاتا دکھائی دیا۔ وہ کالے سیاہ رنگ کا تھا۔ اس کی گول آنکھوں نے اس کی گول آنکھوں میں

دیکھا تھا ۔ چھوٹی چھوٹی بھوری مونچھوں والا ایک ہاتھ لمبا لچکیلا ساہ پیونا اُسے ڈس کر جا رہا تھا جب اُس کے کندھے نیچے ہوئے اور اُس نے "ہاں تھی ۔۔۔" کہا ۔ بس وُہ آنکھ جھپکتے میں آیا اور ورچن کی ایڑی میں کاٹ گیا اور ورچن نے آنکھیں جھپکتے ہوئے سوچا کہ کیا سچ مچ ایسا ہوا تھا اور تب اُس کی ایڑی میں سے ایک ٹیس اُٹھی اور اُس نے جان لیا کہ ایسا ہوا تھا اور اگر اُس نے ابھی کوئی اپا نہ کیا تو وہ سورج ڈھلنے کے ساتھ ڈھل جائے گا ۔

"ڈورگا ، ادھر آ"

ڈورگا اُس کے پاس ہوا ۔

"سُن اور دھیان سے سُن ۔۔۔ اِدھر ویارنا سے نکل اور ذرا پرے ہو کر چل تو تجھے آک کے پودے دکھائی دیں گے ۔۔۔ اُنہیں ڈھیر سارے کاٹ اور اِدھر لے آ ۔۔"

"پر کیوں ؟" ڈورگا نے کہا اور پھر اُس کے چہرے کو دیکھ کر اُس نے کُچھ جانا اور وُہ تیزی سے اٹھا اور چل پڑا ۔

ورچن میں ابھی کُچھ فرق نہ تھا پر وُہ جانتا تھا کہ ہولے ہولے فرق پڑنا تھا ۔۔۔ ہولے ہولے ساہ پیونا کا زہر پانی اُس کی ایڑی سے اُٹھ کر سر کو پہنچنا تھا اور اُس کے جُثّے نے رنگ بدلنا تھا جیسے آسمان کا نیل ہوتا ہے اور آنکھوں میں اندھیرا ہونا تھا ۔۔ وُہ جہاں بیٹھا تھا وہیں اپنے ہاتھوں سے اتنی تیزی سے ریت کھودنے لگا جیسے جس کی زبان سُوکھتی ہو اور وُہ پیاسا ہو تو پانی کو کھوجتا ہے ۔

جب ڈورگا آک کے بُوٹے ریت پر گھسیٹتا ہوا اُس کی طرف آتا دکھائی دیا تو وُہ اپنے آپ کو گردن تک ریت میں دبا چکا تھا ، صرف اُس کے ہاتھ باہر تھے ۔ پہلی نظر میں ڈورگا نے اُسے وہاں دیکھا جہاں اُسے ہونا چاہئے تھا اور وہ وہاں دکھائی نہ دیا تو وُہ پریشانی میں ہوا پر نظر نیچی کرنے پر اُس کا سر جیسے ریت پر رکھا دکھائی دیا تو اُس کی پریشانی بڑھی اور وُہ آک کے پودے گھسیٹتا ہوا اس کے پاس ہوا ۔

"تم نے اپنے آپ کو ایسے کیوں دبا لیا ؟"

"ایسا کرنا ہوتا ہے ۔۔۔ اب تم آک کے ان پودوں کو میرے آسے پاسے اور اوپر ایسے رکھ دے کہ میرا سانس بند نہ ہو آتا جاتا رہے ۔ اور اب مجھ میں اور میرے جُثّے میں بہت فرق پڑنا ہے تو تم نے گھبرانا نہیں ۔ مجھے کھانے کو تم نے کُچھ نہیں دینا چاہے میں بین کروں اور روؤں کُرلاؤں تم نے مجھے سوائے آک کے پتّوں کے اور اس کے دودھ کے اور کچھ نہیں دینا ۔۔۔

اور مُجھے پیاسا رکھنا ہے ۔ دھیان سے سنتا ہے ؟"

"ہاں دھیان سے سُنتا ہوں ۔"

"تو پھر ایسا کرنا اور یاد رکھ ۔۔۔ آک کے پتّے اور بس!"

ڈورگا نے ایسا ہی کیا ۔

دو دن اور دو رات ڈورگا اُس کے ہانپتے مُنہ میں آک کے پتّے ڈالتا رہا اور پوچھتا رہا کہ یہ کیسے لگتے ہیں اور وہ ڈھلتا ہوا جیسے آدھا نیند میں ہو بولتا ۔۔۔" میٹھے ہیں ۔۔۔ میٹھے لگتے ہیں ۔۔" اور ڈورگا جان لیتا ابھی زہر پانی اُس کے اندر ہے ۔۔ دن کو اُسے کچھ سجھائی نہ دیتا اور وُہ جانتا کہ یہ کالی رات ہے اور رات کو اُسے اندھیرا سُوجھتا اور وُہ جانتا کہ بس رات میں رات ہے دِن کبھی نہ ہو گا ۔

اُس کے ہڈ پیر سکڑتے اینٹھتے اور وُہ درد کے مارے کُرلاتا اور دوہائیاں دیتا ۔۔۔

تیسرے دن وہ چُپ ہوا ۔ پر اب وُہ مدھم آواز میں بے تکان بولنے لگا ۔۔۔ جانے وُہ کیا کہتا تھا اور کس سے کہتا تھا ۔ ڈورگا ریت پر لیٹ کر اپنا کان اُس کے منہ کے پاس لے گیا تو وہ کچھ پُوچھتا تھا ۔۔۔ چوتھے دن اُس کی آواز میں لفظ الگ الگ ہوئے تو ڈورگا نے جانا کہ وُہ کیا پُوچھتا ہے "ڈورگا ۔۔۔ تیرا دادا بھی بھٹے کی چار دیواری کے اندر ہی اپنی میّا کے پیٹ میں سے نکلا تھا؟"

"ایسا ہی ہوا ہو گا پر مُجھے نہیں پتہ کہ وُہ کون تھا اور اُس کا کیا نام تھا ۔۔۔" ڈورگا خوش ہوا کہ وُہ بولتا تو ہے ۔

"اور تیرا باپ؟"

"ہاں وہ بھی وہیں ہوا ہو گا ۔۔۔ پر مُجھے کیا پتہ !"

"تو اتنے جنم سے تو اس چکّر میں ہے تو ابھی تک تجھے چاکر رہنے کی عادت نہیں ہوئی ۔۔۔ تُو نے کُھلے ہو کر اپنی من مرضی سے آج تک کُچھ نہیں کیا تو تجھے ایسی حیاتی کی عادت نہیں ہو گئی تھی ؟" ڈورگا پھر خوش ہوا کہ وُہ بولتا تو ہے ۔

"۔۔۔ دیکھ ورچن اِس مُردہ ڈھیر بستی میں بیٹھ کر تجھے میں ایک بات بتاتا ہوں ۔۔۔ تمہیں ابھی تک کُچھ پتہ نہیں اور نہ کبھی پتہ چلے گا کہ وہاں کیا ہوتا ہے جہاں سے میں آیا ہوں ۔۔ میں تمہیں جو کُچھ بھی بتا دوں سب کُچھ بتا دوں پھر بھی تم نہیں جان سکو گے وہاں حیاتی کیسے گزرتی ہے ، وہاں کی سویر ، دوپہر اور رات کیسی ہوتی ہے ۔ ہاں جو اُس میں سے گزرتا ہے ، وُہ حیاتی

کرتا ہے ، جس کے ہڈ پیر پر بیتتی ہے تو ، نرا وُہ جانتا ہے ۔۔۔ دوسرے جو سُنتے ہیں اور اُن کے دُکھ کو جیسے اپنے جُثے پر جھیلتے ہیں تو وُہ بھی کبھی نہیں جان سکتے ۔۔ کُچھ نہیں جان سکتے ۔۔ جس تن پر لگتی ہے بس وُہ تن جانتا ہے ۔۔۔ اسی لئے تو پوچھتا ہے کہ تجھے اتنی مُدتوں تک جنور بنے رہنے سے اس کی عادت نہیں ہو گئی تو بندے کو کبھی بھی جنور بنے رہنے کی عادت نہیں ہوتی ۔ میں نے میرے تن نے ایک ہزار برس گذارا تو بھی نہیں ہوئی ۔ اور اس ڈھیر بستی میں بیٹھ کر تمہیں میں ایک اور بات بتاتا ہوں ۔ یہ جو موہنجو ہے اور ہری یوپیا ہے تو ان بستیوں نے مُردہ ڈھیر ہو جانا ۔۔۔ جیسے تُو ریت میں ہے ایسے ریت میں دبنا ہے ۔۔۔"

"یہ میں بھی جانتا ہوں ۔۔۔" ورچن کی آواز آئی ۔۔ "وہاں اونچی ناک والے آچکے ہیں اپنے اسوا کے ساتھ ، ہمیں نیچ سمجھنے والے اور وہ انہیں برباد کر دیں گے ۔۔۔"

ڈور گا اُٹھا اور ورچن کے ماتھے سے پسینہ اور ریت پونچھی اور اُس کی آنکھوں کو صاف کیا "نہیں ورچن ۔۔۔" وہ اب ایک ڈرا ہوا انسان نہیں تھا جو ورچن کی طرف سدھائے ہوئے جنور کی آنکھوں سے دیکھتا تھا اُس کا کہا مانتا تھا اور ہانپتا تھا بلکہ وُہ اپنی پُرانی بُڈھ قدیم سیانف اور دُکھ کے ساتھ اُس کے سامنے بیٹھا تھا ۔۔ "بستیاں باہر سے نہیں اندر سے مُردہ ہوتی ہیں ۔ باہر والے تو اتنے برسوں سے چلے آرہے ہیں ، اگر موہنجو کو اُنہوں نے ختم کرنا ہوتا تو کر چکے ہوتے ۔۔۔ پر موہنجو ابھی تک ہے اگرچہ ایسے ہونے کو ہے جیسے یہ بستی ہے ۔۔۔"

"تو پھر بستیاں کیسے مُردہ ہو جاتی ہیں ۔۔۔؟"

"وُہ لوگوں کے کُڑھنے سے ہوتی ہیں ۔۔۔ اندر ہی اندر بوڑھے مجھ ایسے اور بچے بھوکے اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے اور عورتیں ویسی جو میرے ایسوں کو جنم دیتی ہیں تو یہ سب کُڑھتے ہیں کہ ہم کیوں ایسے ہیں اور اپنے اندر سے پُوچھتے رہتے ہیں کہ ہمیں ہزار برس کی قید کیوں ہے ۔ ہم میں اور موہنجو کی پکّی گلیوں میں دوڑنے والی گڈ کے بیلوں میں بھی فرق کیوں ہے کہ وُہ پیٹ بھر کر چارہ کھاتے ہیں اور ہم نہیں کھاتے اور اُنہیں سندھو میں نہلا کر اُن کے جُثوں پر تیل مل کر لشکاتے ہیں اور ہم نے کبھی سندھو دیکھا ہی نہیں ۔۔۔ ایک بستی باہر ہے موہنجو کی ۔۔۔ اور دوسری اِدھر بھٹّے کے اندر ہے اور ان دونوں میں ایک میں اُونچ بہت ہے اور دوسری نیچ بہت ہے ۔۔۔ جیسے تُو جو ورچن اِدھر میرے ساتھ ویارنا کے کھنڈروں میں آیا تھا اور اب جو ہے ریت میں دبا ہوا آک کے پتّے کھاتا چباتا اور تیرا بدن نیلا پڑتا ہے تو فرق ہے ناں ۔۔۔ یہی فرق ہے ہم میں اور باہر والوں میں ۔ بھٹّے کا مالک اونچی ناک والا ہے تو کیا اور اگر بغیر ناک کے ہماری طرح

ہم میں سے ہے تو کیا ۔۔۔ تو ورچن بستیاں باہر والے مُردہ نہیں کرتے ہیں ، کرتے ہیں پر ساری کی ساری نہیں کرتے ، یہ ہم خود ہوتے ہیں ۔ اپنے بھائی بندوں کو جنور بنا کر رکھنے والے ۔۔۔"

"پر یہ سب کُچھ تو موہنجو میں ہوتا ہے ۔۔۔" ورچن نے سر جھٹک کر پسینہ کم کرنے کا چارہ کیا "ہماری بستی میں تو نہیں ہوتا ۔۔۔"

"جب ایک ہزار برس سے لوگ ایک جگہ پر کُڑھتے ہیں اور اُن کے ساتھ بُرا ہوتا ہے تو اُن کے کُڑھنے اور بُرائی کی باس پھیلتی ہے اور اُن بستیوں تک بھی جاتی ہے جہاں ایسا نہیں ہوتا ۔۔۔"

"اور پھر وُہ بھی مُردہ ہو جاتی ہیں ؟"

"ہاں وُہ بھی ۔۔۔"

وہاں کس نے ہونا تھا پر اُدھر کوئی ہوتا اور دُور سے دیکھتا تو یہ دیکھتا کہ ایک بُوڑھا ہے جو آک کے پتّوں کے ایک ڈھیر کے پاس بیٹھا اُس سے باتیں کرتا ہے ۔ کبھی اٹھتا ہے اور اُس ڈھیر کے گرد ہولے ہولے چلتا ہے اور کبھی جُھک کر کُچھ کہتا ہے اور کبھی پسینہ پونچھتے ہوئے کچھ دیر کے لئے کسی گرتی دیوار کی اوٹ میں ہو بیٹھتا ہے ۔۔ اور پھر شتابی سے واپس آتا ہے اور آک کے پتّوں سے باتیں کرنے لگتا ہے ۔

آک کے پتّوں میں ورچن اپنی آنکھوں میں گرتے پسینے کو انگلیوں سے باہر کرتا ہے اور دیکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔۔۔ پہلے دو دن اور دو رات وُہ کُچھ بھی دیکھ نہ پایا اُسے صرف ڈور گا کی آواز آئی اور کبھی اُس کی تھکاوٹ کی باس آئی ۔۔ پر تیسرے دن آک کے پتّوں میں سے راستہ بناتی دُھوپ کی سفیدی اُسے دُھندلے بادل کی طرح تیرتی نظر آئی اور اُس کے پیچھے ڈور گا کے ہاتھ پاؤں اِدھر اُدھر چلتے پھرتے دکھائی دینے لگے ۔ اُس کا سارا بدن ریت میں بند تھا اور پھر بھی درد سے پُھولتا لگتا تھا ۔ اُس کے ہونٹوں اور دانتوں پر آک کا سفید دُودھ جما ہوا تھا جسے وُہ زبان سے چاٹتا جاتا تھا اور اُس کی مِٹھاس سے مزا لیتا تھا ۔

چوتھی سویر کو اُس کا دَم ختم ہونے کو آتا تھا اور اُس کے نتھنے پُھولتے تھے اور بُھوک اُس کی انتڑیوں کو کاٹتی تھی تو اُس نے ڈور گا کی طرف صرف دیکھا کیونکہ وُہ بولنے جوگا نہیں رہا تھا ۔ اُس نے قریب ہو کر آک کے چند پتّے اُس کے کُھلے مُنہ میں ڈالے جو وہ فوراً چبانے لگا پر چباتے میں اُسے ابکائی آئی اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا ۔

"یہ تو کڑوے ہیں ڈور گا ۔۔" اُس نے انہیں تھوک دینے کی کوشش کی اور ڈور گا کے چِٹ دانتوں سے ہٹے اور وہ مسکرانے لگا ۔

یہ وہ مستی تھی جو کھیت پر جُھکنے والے اور اُس میں اپنا پسینہ گرا کر مشقّت کرنے والے پنڈوں میں کٹائی کے بعد وحشی اور بے لگام ہو کر پھیلتی ہے اور جس کے آگے وُہ پانچوں بے بس تھے اور رُکھوں کے گُھپ اندھیرے میں اندھا دھند بھاگتے ، گرتے اور ہانپتے تھے پر وُہ مَستی انہیں رُکنے نہ دیتی تھی ۔۔۔ اُن کے اندر نئی کنک کا سواد تھا جو اُنہیں پُھرتیلا اور بے دھڑک کرتا تھا ۔ اور چیتر کی ہوا تھی جو اُن کے خُون کو بے پروا کرتی تھی ۔ پیپل کے بوسیدہ گُھن لگتے تنے جو زمین پر گلتے تھے اور املی کی شاخوں میں سے اور جھاڑیوں کو پھلانگتے وُہ اُس بھینسے کے پیچھے جاتے تھے جو جان چکا تھا کہ یہ پانچ اُس کی رَت پینے کو آتے ہیں ۔

اُن کے اُوپر درختوں میں ماسا پھلانگتا جاتا تھا ۔

بھینسے کی سیاہ کھال پسینے سے تب لشکتی تھی جب گھنے درختوں کے پتّوں کی چھتوں میں سے دُھوپ بہتی ہوئی نیچے آتی اور وُہ ڈکراتا ہوا وہاں سے گزرتا ۔۔۔ گزرتا تو دُھوپ سے پل بھر کو لشکتا اور اگلے پل پھر رُکھوں میں سیاہ ہو جاتا ۔ وُہ پانچوں بھاگتے گرتے ہانپتے اُس پر آنکھیں جمائے دیکھتے تھے اور سُنتے بھی تھے کہ کبھی وُہ نظر آجاتا اور کبھی ٹہنیوں کو توڑتا اُس کا جُثہ سُنائی دیتا ۔

گاگری کے ہاتھ میں بھاری ڈنڈا تھا جسے وہ سنبھالتی تھی اور اُس کی ہرنی ٹانگیں پلانگیں بھرتی بھینسے کے پیچھے جاتی تھیں ۔۔ پچھلے برس جب وہ بھوکڑ کے بغیر آئی تو پھر وہ کبھی کسی پرندے کے پیچھے نہیں گئی ۔

اور پاروشنی سلما کی رسّی سے بنا ہوا گوپیا گھماتی تھی جس میں سمرو کا ترشا ہوا گول گیٹا تھا ۔ اُس کی لُنگی بار بار ڈھیلی پڑ جاتی اور اُسے کسنے کے لئے اُسے رُکنا پڑتا ۔ یُوں گاگری سب سے آگے تھی پلانگیں بھرتی ہوئی ، اُس سے پیچھے کہیں پاروشنی تھی اور پاروشنی کے بہت پیچھے وانگو ، چیوا ، اور جھوریا شور مچاتے چلے آتے تھے ۔۔۔

پاروشنی کا جُسّہ بھی بھینسے کی طرح پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور جب کبھی وُہ بھی رُکھوں کے اندر داخل ہوتی دُھوپ کی لکیر میں سے گذرتی تو اُن تینوں کے جو اُس کے پیچھے چلے آتے تھے دم رُکتے ۔۔ پسینے نے اُس کی لنگی کو اُس کے پنڈے کے ساتھ یوں چپکایا تھا کہ وُہ اُسی رنگ کی ہوتی تھی اور دھوپ میں آتے ہی وُہ سب دکھائی دیتی جو کہ وُہ تھی ۔۔ وہ بھاگتے تھے اور اُن کے آگے آگے رُکھوں میں گُم ہوتا پاروشنی کا بھیگا ہوا جُسّہ بھاگتا تھا اور اُس میں سے ۔۔۔ اُس کی کُچھوں اور چھاتیوں اور ٹانگوں کے بیچ میں جو باس تھی وُہ پھیلتی تھی اور اُن تینوں کو جکڑتی ہوئی اپنے پیچھے گھسیٹتی تھی ۔۔ اور وُہ پل بھر کے لئے بُھولتے کہ وُہ بھینسے کے پیچھے ہیں یا اس باس سے بندھے ہیں ۔

اور اُن سب کے آگے اور بھینسے کے اوجھل ہوتے سائے کے پیچھے آنکھیں لگائے گاگری جب بھاگتی تھی تو اندھا دُھند بھاگتی تھی اور جہاں بھاگتی تھی وہاں دیکھتی نہ تھی اور وہاں راستے میں ایک تنا پڑا تھا اور اُس کا پاؤں اٹکا اور وُہ گرتے ہوئے رُکھ کی طرح مُنہ بھار زمین پر جا گری اور اُس کی ناک میں سے ایک گرم آلودگی پُھوٹی اور بہنے لگی ۔۔۔ اور اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں ۔۔ اُس کا مُنہ گلتے پتّوں کی گیلی باس پر تھا اور اُس کے کان سُنتے تھے ۔۔۔ چیوا اب اپنے چھپر میں سے بالکل باہر نہیں آتا تھا ۔۔ بس بھیڑیں آس پاس خود ہی چر کر لوٹ آتیں اور وُہ کھاٹ پر پڑا رہتا اور ہر شے پر شک کرتا رہتا ، سوال کرتا رہتا ۔۔۔ گاگری اُس کے ہاں جاتی ، لیٹتی اور واپس آجاتی ۔۔ اُس کا جی کرتا تھا کہ اُس کا بیج اُس کے اندر پھر ٹھہر جائے ۔۔۔ وُہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں جو پتھروں والے راستے کے نیچے کسی مرتبان میں اب چھوٹی چھوٹی ہڈیاں تھے اُنہے یاد آتے تھے اور اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُس کے گالوں پر ایک چھوٹا سا ہاتھ کھیلے اور اُس کی چھاتی پر ایک چھوٹا سا مُنہ چلے ۔ آج سویرے وہ چاروں چیوا کے چھپر کے پاس سے گزرتے تھے تو اُس نے اُن کی آہٹ سُن کر اُنہیں روک لیا ۔ وُہ جانتی تھی کہ وُہ بھینسے کو مارنے جاتے ہیں ۔۔ ہر برس یہی ہوتا تھا ۔ ہر برس فصل کی کٹائی کے بعد چیتر کے مہینے میں کوئی نہ کوئی یا دوچار مل کر بھینسے کو مارنے جاتے تھے ۔ اور ایسا ہی ہوتا کہ دن گزرتے جاتے اور جو بھی جاتا خالی ہاتھ ہی آتا یا ہاتھ پاؤں تُڑوا کر آتا یا وُہیں رہ جاتا بھینسے کے بوجھ تلے جیسے مونگلی کے نیچے کنک کا دانہ پِس جاتا ہے ۔۔۔ اور پھر بھی کٹائی کے بعد کی مستی اور چیتر کی ہوا اُن کے جُسّوں کو دھکیل کر رُکھوں میں بھیج دیتی اور وہاں وُہ اُن کی اڈیک میں ہوتا ۔

گاگری زمین پر اوندھی پڑی ہوئی تھی اور اُس کے ناک مُنہ سے خُون بہتا تھا اور اُس کے

اوپر گھنے پتّے تاریکی کرتے تھے ۔۔ جانے مجھے کوئی دیکھتا ہے کہ نہیں ۔۔۔ پاروشنی میرے پیچھے آتی ہے اور اسی راستے پر پاؤں دھرتی آتی ہے ، وُہ دیکھ لے ۔۔۔ کہ میں گر چکی ہوں اور اُٹھ نہیں سکتی ۔۔ گاگری کے آدھے جاگے آدھے سوئے سر میں باتیں ہو رہی تھیں پر اُس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وُہ اپنے آپ کو ہلائے ، وہ جہاں تھی بے بس پتھر پڑی تھی ۔۔۔ پھر پاروشنی کی ہانپتی ہوئی ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہو ہو ۔۔۔ ہوہا ۔۔ ہوہا ۔۔ اُسے سنائی دینے لگی اور وُہ آرہی تھی، یہ آواز قریب ہونے لگی اور اس کے ساتھ پتّوں پر بھاگتے پاؤں پڑتے ہوئے اور اُن کی چرمراہٹ ۔۔۔ یہ سب کُچھ پاس ہوا ، پاس آیا اور پھر ۔۔۔ گزر گیا دُور ہونے لگا ۔۔۔ پاروشنی اُسے دیکھے بِنا گذر گئی تھی ، ہانپتی بھاگتی چلی گئی تھی ۔۔۔ اور گاگری اب ڈری اور اُس نے جانا کہ اگر کوئی اُسے اٹھانے نہ آیا تو وُہ یہیں پتّوں اور ٹہنیوں میں اوندھے مُنہ پڑی مرجائے گی اور پتّوں میں رینگتے جو کیڑے اُس کے پِنڈے کو کاٹنے لگے ہیں تو اُن کی تعداد دھیرے دھیرے بڑھ جائے گی اور وُہ یہ جان کر کہ یہ اب ہلتی نہیں ہے اُس کے ماس کو ہڈیوں سے الگ کرنے لگیں گے ۔۔۔ وُہ ڈری پر کوشش میں رہی کہ خون بہنے سے جو اُس کا زور کم ہوا ہے تو وہ اب اونگھ نہ جائے اور اُس کی آنکھیں بند نہ ہوجائیں ۔ تھوڑی دیر بعد وُہ تینوں بھی پاگل لوگوں کی طرح شور مچاتے اُس کے پاس سے گذر گئے ۔۔۔ ایک چیونٹی نے اُس کی کنڈ پر کاٹا اور اُس کا ماس تھرّایا ۔

اُن کے نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے اور وُہ کتّوں کی طرح رُکھوں میں سونگھتے اُس باس کا پیچھا کر رہے تھے ۔۔۔۔۔۔۔ اکڑتے تھے اور اُنہیں بھاگنے میں مشکل ہوتی تھی اور جیسے وُہ بھی مُنہ اٹھائے باس کو سُونگھتے تھے ۔۔۔

بھینسے کا ڈولتا جُسّہ رُکھوں کی تاریکی میں یوں ڈکراتا چلا جاتا تھا جیسے شُوکتے دریا میں کسی رُکھ کا تنا بے اختیار ہو کر لُڑھکتا چلا جاتا ہے ۔ اِس جنور میں یہ تھا کہ انسان کو دیکھتے ہی بھاگ نکلتا تھا اور بھاگتا جاتا تھا ، بغیر پیچھے دیکھے بغیر جانے کہ میرے پیچھے کوئی آتا بھی ہے یا دُور رہ گیا ۔۔ ہاں جب یہ تھکتا ہے اور اُس کی ٹانگیں اُس کی تھکاوٹ کا بوجھ نہیں سہارتیں تب یہ کھڑا ہوتا ہے اور سامنا کرتا ہے ۔۔ لیکن جب ایسا ہو تو انسان اُس کا سامنا نہیں کر سکتا ۔۔ اُس سمے جب بھینسا تھک کر تمہارے سامنے کھڑا ہوگیا تو سمجھو کہ تمہیں مٹی میں دبانے کے لئے تمہارے ناپ کا مرتبان بھٹی میں پکنے لگا ۔ اسی لئے اُس کے پیچھے جانے والے ہمیشہ اُس کے پیٹ پر نظر رکھتے ہیں کہ وُہ تیز تیز بڑھتا اور سکڑتا تو نہیں کہ یوں سانس پُھول جائے تو ہوتا ہے اور اُس کے کُھر

زمین پر سیدھے پڑتے چلے جاتے ہیں یا آپس میں بھڑنے لگے ہیں کہ یُوں تھکاوٹ ٹانگوں میں اُترے تو ہوتا ہے ۔۔۔ پاروشنی کی آنکھیں بھاگتے ہوئے بھینسے کے کالے پِنڈے پر چپکی ہوئی تھیں اور اُس کی ٹانگیں بھاگتے ہوئے جیسے اپنے بدن کو چھوڑ کر آگے جاتی تھیں ۔ اُس نے نظر ہٹائے اور پاؤں روکے بغیر گوپیا گھمایا اور اُسے گھماتی ہوئی ہاتھ سیدھا کرتی گئی اور جب پوٹلی میں رکھا گول گیٹا بازو کی ناڑوں کو کھینچنے لگا تو اُس نے گوپیے کا دوسرا سِرا چھوڑ دیا ۔۔۔ گیٹا شائد بھینسے کو لگا نہیں کیونکہ وُہ بھاگا جاتا تھا اور اگر لگا تو کہیں پنڈے پر جا لگا جہاں کچھ اثر نہ تھا ، وہاں کھوپڑی کے اُوپر سینگوں کے بیچ گیندے کے پھول اِتنی ایک جگہ ہوتی ہے جہاں گیٹا پُورے زور سے لگ جائے تو بھینسا اُنہی قدموں پر گر جاتا ہے اور پھر اُسے پتھر کے چاقو سے مارا جا سکتا ہے ۔ پر اُس چھوٹی سی جگہ گیٹا مارنے کے لئے بڑا نشانہ چاہیئے ، ہاتھ میں زور اور آنکھ میں تیزی ہو تب ۔۔۔ پاروشنی میں یہ سب کچھ تھا پر نشانہ پھر بھی ٹھیک نہ پڑا ۔۔۔ اُس نے بھاگتے بھاگتے گوپیے میں دُوسرا گیٹا رکھا اور اُسے گھمانے لگی ۔

وہ تینوں اب بھی شور مچاتے ہانپتے چلے آتے تھے پر وُہ بھینسے کو بُھولے ہوئے تھے صرف پاروشنی کے بھیگے ہوئے پِنڈے کو رُکھوں میں سے پھسلتے ہوئے دیکھتے تھے اور اُن کے ماتھے گرم ہوتے تھے اور آنکھوں میں آگ دہکتی تھی اور وُہ اُس کے پیچھے پیچھے تھے اور اُس کی بھیگی باس اُن کے نتھنوں میں اب بہت اتھل پتھل کرتی تھی اور اُنہیں بے حال کرتی تھی ۔۔۔ اتنا بے حال کرتی تھی کہ اب رُکھوں کے تنوں میں ایک پاروشنی نہیں جاتی تھی بہت ساری تھیں جن کے بدن پسینے سے بھیگتے تھے اور لنگیاں ڈھیلی پڑتی تھیں ۔۔۔ اُن تینوں نے ایک دُوجے کو دیکھا اور جانا کہ ماتھا سب کا جلتا ہے اور آنکھوں میں سُرخ گرمی ہے تو وُہ بھاگنے کی بجائے ٹھٹک کر ہرنوں کی طرح پلانگیں بھرنے لگے ، کُودنے لگے ۔۔۔ ایسے وُہ پاروشنی کے قریب ہوتے تھے ۔ اور اُن کے عین اوپر ماسا بھی رُکھوں کے اندر پلانگیں بھرتا ، کُودتا تھا اور اُن کے اُوپر اُوپر جاتا تھا ۔

ادھر جھیل سے اوپر کا آسمان پرندوں کے پروں سے سیاہ ہوتا تھا اور وُہ سب مرنے کے لئے وہاں آئے تھے ۔

پاروشنی گری تو یہ نہ بُوجھ سکی کہ ایسا کیونکر ہوا ۔۔ وہ بھی گرتے رُکھ کی طرح اوندھے مُنہ گرتی چلی گئی اُس کا پاؤں کسی تنے ، ٹیلے یا کسی جنور کے پنجرے سے اٹکا بھی نہیں اور پھر بھی وُہ گری اور اُس کے ساتھ ہی بہت سارے ہانپتے سانس اور بوجھ اُس پر بوجھ ہونے لگے اور اُس کا سانس

بند ہونے لگا اور رُکھ سیاہ ہوئے اور اُس کے پنڈے پر تیرتے پسینے پر سے بوجھ پھسلتے اور پھر آتے اور بار بار پھسلتے ۔۔۔ اور یُوں وہ رُکھوں کو دیکھ نہ سکتی تھی کہ اُسے گرم بھاپ سانس اور کپکپاتے جُثے ڈھانپتے تھے اور اُس کی کُھلی حیران آنکھوں میں اُن کا پسینہ گرتا تھا اور نم ہوا سے اُس کا ماتھا بھیگتا تھا اور رُکھوں میں ٹھہری ہوئی ہوا نمی سے بوجھل تھی اور یہ نمی گرم ہو کر اُس کے پنڈے کے اندر تک مار کرتی تھی اور اُسے ایک دوہرا نڈھال کرنے والا سواد دیتی تھی ۔۔۔ اور پھر بھاری ہوتے پپوٹوں کو اُس نے مُشکل سے کھولا تو اُن کے عین اوپر بھینسا کھڑا تھا ۔ اُس کا پیٹ پچکتا تھا اور پھیلتا تھا اور ٹانگیں لرزتی تھیں اور وُہ کھڑا تھا ۔۔۔ اُس کا بھی پیٹ بھرتا ہے اور پھر خالی ہوتا ہے اور ٹانگیں بھیگتیں ہیں ۔

جھوریا نے پاروشنی کی آنکھوں میں اپنی بجائے کچھ اور سیاہ ہوتا دیکھا اور اُس نے گردن اٹھا کر پیچھے دیکھا تو وہ اُن کے اوپر کھڑا تھا ۔

چہوا اور وانگو نے بھی مُڑ کر دیکھا اور پھر وُہ گرتے پڑتے اُٹھے اور گھگھیائی ہوئی ڈر سے بھاری آواز بس نکالتے جدھر سے آئے تھے اُدھر بھاگنے لگے ۔

پاروشنی گیلی باس میں گُم بھیگتی وہیں گلتے پتّوں پر تھی اور بھینسا اُس کے اوپر کھڑا تھا اور اِس کا پیٹ پچکتا اور پھیلتا تھا اور ٹانگیں لرزتی تھیں اور وُہ جانتی تھی کہ اب اُس کے نتھنے سُکڑیں گے ۔ تناؤ نیچے ہو گا اور آنکھیں اُسے دیکھیں گی اور پھر وہ پھنکارتا ہوا اُس پر آئے گا اور پھر جیسے پتھر کنک کو پیستا ہے ، جیسے کائی پر اوس پڑے تو اُس پر رکھا ہاتھ پھسلتا ہے ایسے پاروشنی کے پِنڈے پر پسینہ اور اُس کے اندر پانیوں کی پھسلن تھی اور اُن میں پاروشنی کی باس گیلی ہوتی تھی اور بھینسا کھڑا تھا ۔۔ اُس کے نتھنے پھڑکتے تھے ، پاروشنی نے جانا کہ اب وُہ آگے آئے گا ۔۔ وہ یوں ٹانگیں اور باہیں کھولے پڑی تھی جیسے اپنے پنڈے کو سُکھاتی ہو اور اُس کے اوپر رکھوں کی چھایا تھی اور پنڈلیوں ، پیٹھ اور کندھوں تلے گلتے پتے چرمراتے تھے ۔۔۔

وہ کھڑا تھا اور اُس کے نتھنے پھڑکتے تھے جیسے اُس کی باس اندر اُتارتے ہوں ۔۔۔ پاروشنی نے جانا کہ اب پلکی کے آوے میں وُہ برتن ضرور پکے گا جس میں اُس کا بچا کھچا بدن بند کر کے زمین میں رکھا جائے گا اور اُس نے دھیرے سے کروٹ بدلی ۔۔۔ اُس طرف جس طرف بھینسا نہ تھا تا کہ جب وُہ پر آئے اُسے کنک کی طرح پیس دینے کو آئے تو وہ اُسے دیکھ نہ سکے ، وہ آئے ، اپنا کام کرے اور جائے ۔۔۔ اب وُہ اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھا پر اُس کے پیچھے کھڑا تھا اور اُس کی ننگی پیٹھ سے چار ہاتھ پرے اُس کے نتھنے پھڑکتے تھے ۔۔۔ پاروشنی کا سانس رُک رُک

کر آتا اور وُہ اُسے روکتی اور انتظار کرتی کہ اُس کا بھاری جُثہ آکر اُسے داب دے اور کام ختم کرے ۔

"می آؤں ۔۔ می آؤں ۔۔۔" رُکھوں میں موربولا ۔

پاروشنی کی تنگی کنڈ پر ایک ایسا سانس بکھرا جو گرم اور رُکنے والا نہ تھا ۔ وُہ جان رہی تھی کہ بھینسے کا بھاری وجود اب اُس پر تنا کھڑا ہے اور اُس پر گرنے کو ہے ۔۔۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ بھینسے کی نم تھوتھنی اُسے سُونگھتی تھی اور اُسے گیلا کرتی تھی ۔ پاروشنی نے ایک ٹانگ سمیٹی اور سیدھی ہو گئی اور باہیں اور ٹانگیں پھیلا کر یوں لیٹ گئی جیسے اپنے آپ کو سُکھاتی ہو ۔۔۔ سانس جو گرم اور رُکنے والا نہ تھا اُسے گرم کرنے لگا ۔ تھوتھنی اُسے ہر جگہ دیکھتی بھالتی تھی ۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور بہت دیر بند رہیں ۔۔ صرف اُس کا سانس اور پتّوں پر سختی سے بھنچی ہوئی ہتھیلیاں بتاتیں کہ وہ زندہ ہے اور زندگی کا تناؤ اُس کے اندر ہے ۔۔۔ اور باہر ہے ۔۔۔ اور اندر جو رُکھوں کے اندر نم گرمی ٹھہری ہوئی ہے وُہ بہنے لگتی ہے اور زندگی اُس کے اندر ہے ۔۔ اور باہر ہے ۔

―――――――――――――――

اُس کے پپوٹوں پر ایک سایہ گہرا ہوا اور اُس نے آنکھیں کھول دیں ۔۔۔ وہ اُس پر جُھکا تھا اور وُہ ورچن تھا ۔۔ "تم اِن رُکھوں میں یُوں لیٹ کر کیا کرتی ہو ۔۔۔؟"

وہ اُٹھی اور جلدی سے اپنی لُنگی میں ہو گئی ۔

"ڈورگا ۔۔۔ ادھر آؤ"

ڈورگا جو اُن سے نظریں ہٹائے رُکھوں کو دیکھ رہا تھا آگے آیا اور اُس نے پاروشنی کے نچڑتے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا "جھاڑیوں کو روندتا اور اپنے آپ میں مگن اور مست ایک بھینسا رُکھوں میں جاتا تھا اُس نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا ؟"

پاروشنی نے سر ہلایا ۔

میرے حصّے کا اَن پانی اس نے لیا اور مجھے بھوک اور پیاس دی ۔۔۔ اِس نے ۔۔۔ تو میں اب آیا ہوں تو اس سے میل کرنے ۔۔۔ اور وُہ بھی جان گیا ہے ۔۔ میں آگیا ہوں ۔

وُہ تینوں رُکھوں کی گھنیری چھاؤں میں چلنے لگے ۔ املی اور پیپل کے پتّوں میں گیلی ہوا دم روکے موجود تھی ۔ بانجھ عورتوں کے رُکھ کے آس پاس اُس نے پہلی بار ورچن کو دیکھا ۔۔ اُس کے مہاندرے سے زردی پُھوٹتی تھی اور اُس کی آنکھیں اور نقش باقی چہرے میں سے الگ

دکھائی دیتے تھے جیسے پانی کم ہو تو ٹاپو اُبھرتے ہیں ۔ وُہ کہیں دیکھتا نہ تھا بس پلانگیں بھرتا چلتا جاتا تھا ۔ اُس کی ٹانگیں سیدھی شاخوں ایسی پتلی دُبلی تھیں اور پِنڈلیوں پر پیپل کے پتّوں ایسی سیاہ رگیں پُھولی ہوئی تھیں ۔۔۔ وہ دو برس ہوئے گیا تھا اور پاروشنی ان دنوں میں بانجھ عورتوں کے رُکھ کے پاس سے جب بھی گزری تو آسے پاسے دیکھ کر اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر سیاہ لُنگی میں ڈال کر اپنے بیچ پر رکھ دیا اور وہاں گرمی ہوتی تھی ۔ رُکھوں کے اندر موجود حبس اور سیلی گرمی سے کہیں زیادہ اور اُس کے پِنڈے کے اِس حصّے نے ہمیشہ یہ بتایا کہ اُسے کبھی اِس رُکھ کے ساتھ لپٹنے یا دھاگے باندھنے کی ضرورت نہ ہو گی اور اب وُہ اُس کے ساتھ چل رہا تھا ۔۔۔ جس کے خیال سے اُس کے بیچ میں نم تھرتھراہٹ ہوتی تھی ۔۔۔ پر وُہ اُس کے ساتھ ساتھ تو چل رہا تھا ۔ اور اُسے کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا ۔ کیا سچ مچ وہی ہے یا کوئی یکسنا ہے جو کسی رُکھ کا سانس ہے جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے ۔ وہ اُسے دیکھتی رہی جواب لاپرواہ ہو کر چلتا تھا اور جب وُہ ادھر سے گیا تھا تو پرواہ کرتا تھا ۔۔ پر اب اُس کے اور پاروشنی کے بیچ دو برس تھے اور اُن کے دن رات تھے اور ایسی رُتیں تھیں جو ریت اور رُکھوں کے پار کہیں تھیں اور ایسی ندیاں تھیں جنہیں اُس نے پار کیا اور وُہ گیا اور ہر ندی کی اپنی رُوح اور جان ہوتی ہے ۔ کیا پتہ کونسی ندی میں سے تیرتا وُہ بدلا اور ورچن سے کچھ اور ہوا ۔۔۔ کیسی بُو باس اُس نے کہیں سُونگھی اور وُہ پاروشنی کے پِنڈے کی باس کو بُھولا ۔۔۔ کیا پتہ ! وُہ اُس کے آگے آگے چلتا تھا اور وُہ اُسے دیکھتی تھی تب وُہ یکدم رُکا جُھکا اور پھر سیدھا ہو کر کہنے لگا "بھینسے کے پیچھے کون کون رُکھوں کے اندر آیا تھا؟"

پاروشنی نے بتایا ۔

"تو پھر یہ گاگری ہے ۔۔۔" وُہ جہاں پہلے جُھکا تھا وہاں بیٹھ گیا اور وہاں گاگری مُنہ بھار پڑی تھی اور اُس کے پِنڈے پر مکوڑے چلتے تھے ۔

"یہاں وُہ باس تیرے تھنوں میں آئی ؟"

ڈور گا نے تھنے سُکیڑے "کونسی ؟"

"لوگوں کے کُڑھنے کی اور اُن پر ظلم ہونے کی باس جو تُو کہتا تھا کہ پھیلتی ہے اور اُن بستیوں تک بھی جاتی ہے جہاں ایسا نہیں ہوتا !"

دریا میں اُتنا ہی پانی تھا جتنا چیتر کے مہینے میں ہوتا ہے ۔۔ اُس پر ہوا چلنے سے بڑی لہریں نہیں اُٹھتیں ، بس جیسے ریت کروٹیں بدلتی ہے ویسے پانی پہلو بدلتا ہے اور ہموار ہو جاتا ہے ۔۔ اور یُوں چیتر کے مہینے میں گھاگھرا دھیرے دھیرے اپنی موج میں بہتا تھا اور اس کے اوپر پچھلے پہر کی دھوپ آلکس سے لیٹتی تھی اور اونچے کنارے پر بیٹھے وُہ اُسے دیکھتے تھے ۔ اُن دونوں سے پَرے سمرو بیٹھا تھا اور بُھر بُھری مٹی کو اُنگلیوں سے کُریدتا تھا ۔۔ وہ تینوں بستی سے دُور نکل کے ادھر آئے تھے پکّی کے آوے کی سیدھ میں اور آوے کا دھواں خالی آسمان میں جاتا تھا اور بکھرتا گُم ہوتا تھا ۔

"گھاگھرا سندھو جتنا نہیں ہے ۔۔۔" ڈور گا بولا

"ہماری بستی بھی تو موہنجو جتنی نہیں ہے ۔۔" ورچن مسکرا رہا تھا "جتنے ہم اتنا ہمارا دریا ۔"

"اور یہ کب سے یہاں بہتا ہے ؟"

"کب سے ؟" ورچن نے سمرو کو دیکھا جو اپنے دھیان سے زمین کو انگلیوں سے کریدتا تھا ۔۔۔ "دریا تو شروع سے ہوتا ہے مُدھ قدیم سے ۔۔۔ جیسے ہم ہوتے ہیں ۔۔۔ ہم کب سے ہوتے ہیں ؟"

"اور یہ آخر تک ہوتا ہے ؟"

"ہاں ۔۔۔"

"پر ہم تو آخر تک نہیں ہوتے پھر دریا ہم جیسا کیسے ہوا ؟ ۔۔۔۔ پر ورچن یہ ہم جیسا ہوتا ہے ، ویارنا کی بستی میں بھی تو دریا آتا تھا جواب نہیں ۔۔۔"

"اُن کا آخر ہو چکا ۔۔۔" ورچن کا دل بیٹھا "وہ ریت میں گُم تب ہوا جب آخر ہو چکا ۔۔۔"

"اور آخر کب ہوتا ہے ؟" ڈور گا نے پُوچھا

ورچن نے اُسے دیکھا کہ ایسے سوالوں کے جواب تو تمہارے بھیجے میں ہیں تم بتاؤ اور ڈور گا نے جان لیا کہ وُہ ایسا کہتا ہے اور بتانے لگا "جب ہزار برس سے لوگ کُڑھتے ہیں اندر ہی اندر ۔۔۔ بوڑھے بچّے عورتیں اور مرد کڑھتے ہیں اور اُن کے مہاندرے عام انسانوں سے الگ ہو جاتے ہیں ۔۔۔ وُہ کُچھ جنور اور کُچھ انسان بن جاتے ہیں ۔ اُن کا وجود اور شکل وجہ تو انسانوں ایسی ہوتی ہے پر اُن کا اُٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا جنوروں جیسا ہو جاتا ہے ۔ ہر کسی کے سامنے جاتے ہیں تو اُن کے ہاتھ آپو آپ بندھ جاتے ہیں اور اُنکی آنکھیں بُجھ جاتی ہیں کہ کہیں اُن کی چمک سے وُہ بُرا نہ مان جائے ، ناراض نہ ہو جائے ۔۔۔ اُن کی ساری حیاتی اِسی بھاگ دوڑ میں ختم ہوتی ہے کہ کہیں اُن کا پالن ہار اُن سے ناراض نہ ہو جائے ، وہ کُتّے کی طرح دُم ہلاتے رہتے ہیں ، اپنی تھوتھنی اُس کے قدموں میں رکھتے ہیں اور ٹھڈّے کھاتے ہیں تو ہلکی سی چوؤں کرکے پھر اُس کے آگے پیچھے لوٹنیاں لگاتے ہیں ۔۔۔"

اور ورچن نے شائد پہلی بار اُس شخص کے مہاندرے اور ناک نقشے کو غور سے دیکھا جو سندھو اور درشدوتی اور رُکھوں اور ریت میں کئی دن اور کئی رات اُس کے پیچھے پیچھے چلا اور پھر اُس کے ساتھ چلا ۔۔۔ تھا تو وُہ اُس جیسا ہی سیاہ پڑتے مٹیالے رنگ کا اور ویسے ہی بالوں کا جو اک دوجے میں یُوں اُلجھے ہوئے تھے جیسے بان کی رسّی بٹی ہوتی ہے ، ہونٹ بھرے بھرے اور موٹے اور جبڑا آگے کو نکلا ہوا ۔ اُس کی منحنی چھاتی پر جو بال تھے وُہ سب سفید ہو چکے تھے ۔۔۔ یہ سب کُچھ تو تھا اور ویسا ہی تھا جیسا کہ وُہ خود تھا اور پرے بیٹھا سمرو تھا ، پر ڈور گا کے مہاندرے میں کُچھ اور بھی تھا ۔۔۔ جیسے ہرن ڈرا ڈرا ہوتا ہے اور چوکنّا کھڑا ہوتا ہے ، جیسے سانپ زمین کے ساتھ لگ کر تیزی سے آگے سرکتا ہے اور جیسے پکھیرو کا بوٹ آلنے سے گرے تو جہاں گرتا ہے وہیں پڑا رہتا ہے ۔۔۔ وُہ کُچھ کُچھ رُکھوں والے مامن ماسا جیسا تھا ۔ کُچھ انسان اور کُچھ کُچھ جنور ۔

"مُجھ میں اور تم سب میں یہی فرق ہے ۔۔" ڈور گا پھر بولا "تم نے میرا حصہ نہیں دیا ہوا

کا ، اَن پانی کا اور سُکھ کا ۔۔۔"

"میں نے ؟" ورچن مسکرایا اور جان گیا کہ بوڑھے ڈور گا کے بھیجے پر شاید دُھوپ نے اثر کیا ہے جو یُوں بولتا ہے ۔

"ہاں اور کیا ۔۔۔" ڈور گا کی بُجھی آنکھوں میں شرارت تیرتی تھی "مجھے ہزار برس ہو گیا ہوا ملے سُکھ ملے تو یہ سب کُچھ تھا تو سہی پر مجھے ملا نہیں ۔۔ تم نے دیا ہی نہیں ۔"

"پر میں تو یہاں تھا اس بستی میں ۔۔۔"

"یہاں میرے کُڑھنے کی باس نہیں پہنچی ؟"

ورچن نے کتے کی طرح ناک ہوا میں اٹھا کر سانس اندر کھینچی جیسے کچھ سونگھتا ہو اور پھر اُس کے موٹے ہونٹوں میں سے دانت دکھائی دیئے اور وہ زور زور سے ہنسنے لگا ۔ "نہیں ڈور گا یہاں تک تمہاری باس نہیں پہنچی ۔۔۔" پھر وہ رُکا اور ڈور گا کے قریب ہو کر اُسے نیچے اوپر سُونگھنے لگا جیسے کُتّے سونگھتے ہیں "نہیں نہیں ضرور پہنچی پر باس نہیں بلکہ ۔۔۔ بُو ۔۔۔ تمہارے پِنڈے پر جمی مَیل اور گند کی بُو تو پُوری بستی سُونگھتی ہو گی ۔ چل اُٹھ دریا میں ڈبکی لگا اور اپنے آپ کو صاف کر ۔۔۔"

"نہیں ۔۔۔" ڈور گا کھڑا ہوا اور پیچھے ہٹا "ناں ۔۔۔ میں پانی میں نہیں جاؤں گا ۔۔ نہیں ۔ ۔۔ مجھے ڈر آتا ہے ۔۔۔ اُدھر بھٹّے کے اندر ہمیں پانی پینے کو ملتا تھا اُوپر ڈالنے کو نہیں ۔۔۔"

اور اُسی طرح ورچن اور سمرو اُٹھ کر اُس کے گرد ہو گئے "وُہ بھٹّہ تو پیچھے رہ گیا ڈور گا ۔۔ اب اُس کو بُھول ۔۔۔ اور تجھے اگر ہزار سال اپنے حصّے کا پانی نہیں ملا تو یہاں بہت ہے ۔۔ جتنا جی چاہے لے ۔۔۔ تمہاری ہزار سال کی میل دُھل جائے گی ۔۔۔ چل دریا کے اندر"

"ناں ۔۔۔" ڈور گا دونوں ہتھیلیاں آگے کئے اپنے آپ کو بچانے لگا اور پیچھے ہونے لگا ۔۔ تب ان دونوں نے اُس کی کچھوں میں ہاتھ دے کر اُسے آسانی سے اٹھایا اور کھینچتے ہوئے پانی تک لے گئے ۔

"دیکھو دیکھو ۔۔۔ دھیان کرو ۔۔۔" ڈور گا چیخ رہا تھا اُس کی حالت دیکھنے والی تھی ۔ جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ ہو" دیکھو میں مرجاؤں گا ۔۔۔ بالکل ڈوب جاؤں گا پُورا کا پُورا ۔۔ دُرشدوتی میں نہیں ڈوبا تو یہاں ڈوب جاؤں گا ۔۔ مرجاؤں گا ۔"

"تم ہزار برس میں نہیں مرے تو اب اتنے سے پانی سے کہاں مرو گے ۔۔۔" وہ دونوں

ہنس ہنس کر دوہرے ہوتے تھے اور اُسے پانی کے اندر لے جاتے تھے ۔۔۔ پھر انہوں نے اُسے دھکیل دیا اور ڈور گا بے اختیار ہو کر دریا میں چلا گیا ۔۔ اُس کا خیال تھا کہ پانی کے اندر جاتے ہی وُہ نیچے جائے گا اور پھر بس نیچے ہی نیچے اور اُس کا کام تمام ہو جائے گا جھٹ پٹ ۔۔۔ پر پانی تو یہاں اُس کے گُھٹنوں تک آیا ۔۔ وُہ سہمی ہوئی آنکھیں کھولے تھوک نگلتا اپنے ڈوبنے اور نیچے ہی نیچے جانے کا انتظار کرتا رہا لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور سمرو اور ورچن اُسے دیکھ دیکھ کر نڈھال ہوتے رہے ۔۔ تب وہ شرمندہ سا ہو کر کھڑا رہا ۔

"اب اگر باہر آنا چاہو تو آ جاؤ ۔۔۔"

لیکن ڈور گا کو پانی اچھا لگا ۔ اُس میں ایسی ٹھنڈک تھی جو جکڑے ہوئے جُثّے کو کھولتی تھی اور اور وُہ اُس میں بیٹھ کر اپنے نیم سیاہ پِنڈے پر چھینٹے اُڑانے لگا ۔

ورچن نے سمرو کی طرف اب مُنہ کیا "میرے بعد ادھر کیا ہوا؟"

"جو کچھ تم سے پہلے اتنے برسوں میں ہوتا آیا تھا وہی ہوتا رہا ۔۔" وہ پھر زمین کُریدنے لگا

"سب لوگ اپنا اپنا کام کاج کرتے رہے ۔ اپنے حصّے کی زمین کھودتے اور بیج ڈالتے رہے ۔۔۔ پھر بڑے پانی اور پھر کٹائی ۔۔۔ کبھی سُکھ کا سانس اور کبھی دُکھ ۔۔۔ بس یونہی ۔۔۔"

"اور کیا ہوا ؟"

"بس یونہی ۔۔۔ میں اپنے منکے مُہریں اور سنگھار کی چیزیں بناتا رہا ۔۔۔ اب یہ ہے کہ موہنجو سے تم میرے لئے جو پتھر اور دھاتیں لائے ہو تو اُن سے برس دو برس اور نکل جائیں گے ۔۔۔ بس یونہی ۔۔ اور میں تمہاری واپسی کی راہ دیکھتا تھا ۔۔"

"تو نے ایسا ہی کرنا تھا ۔۔۔"

"ورچن ۔۔۔ مجھے فکر رہتا ہے"

"تجھے بھی ؟" ورچن کا حیران مہاندرہ اُس کی اور ہوا ۔

"ہاں مجھے بھی ۔۔۔"

"تو تمہیں بھی پتہ چل گیا ہے کہ وُہ آ گئے ہیں ۔ پر سمرو وہ ابھی ادھر سے بہت دُور ہیں ۔۔۔ یُوں تو اُن کو آئے ہزار برس ہو گئے پر وہ ادھر نہیں آئے ۔۔۔ وُہ دھیرے دھیرے اُدھر سے نیچے اُترتے ہیں وُہ درشدوتی کے کناروں سے ادھر نہیں آتے ہیں ۔۔۔ ہاں یہ ہے اور یہ سنا ہے کہ اُن کا ایک قبیلہ پورو نام کا گھاگھرا کے دونوں کناروں پر آن ٹھہرا ہے پر یہاں سے دور ۔۔"

حیران مہاندرہ اب سمرو کا ہوا "توکس کی بات کر رہا ہے ورچن؟"

"اُن کی جو اسوا پر آئے ہیں ۔۔۔"

"میں جانتا تھا ۔ پُورا جانتا تھا ۔۔۔" سمرو نے بار بار سر ہلایا" تو موہنجو میرے لئے نہیں گیا ۔۔۔ نہ میرے پتھروں کے لئے اور نہ ۔۔۔ تو کھوج میں گیا تھا"

"جب سے میں نے یہ جانا کہ اُن کی ایک ٹولی گھاگھرا کے کناروں پر بھی رہتی ہے تو مُجھے ۔۔۔ یہ جو پانی ہے ہمارے سامنے اس میں اُن کے پنڈے بھی نہائے ہوں گے اُن کی عورتوں کی چھاتیوں اور ٹانگوں کے بیچ کو لگ کر آتا ہو گا تو مُجھے ۔۔۔ میں ۔۔۔" ورچن رُک گیا "لیکن تجھے اِن کا فکر تو نہیں تجھے کسی اور بات کا فکر ہے ۔۔۔"

"ہاں میں نے تو نرا اتنا کہا تھا کہ مجھے فکر رہتا ہے اور تو کہیں کا کہیں چلنے لگا ۔"

"اب بتا دو ۔۔۔"

"میں جب سوتا ہوں تو دیکھتا ہوں ۔۔۔"

"یہ کیا کہتے ہو ؟"

"ہاں جب میں سو جاتا ہوں تو پھر میں دیکھنے لگتا ہوں ۔۔۔"

"تو کون نہیں دیکھتا ۔۔۔ سب لوگ کچھ نہ کچھ کبھی نہ کبھی دیکھتے ہیں ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ پر میں بس پانی ہی کو دیکھتا ہوں ۔ میرے آس پاس اوپر نیچے آنکھوں اور بالوں میں پانی ہے ۔۔ اور میں ڈُوبتا ہوں اور ابھرتا ہوں تو اوپر بھی پانی ہے اور میں اُس میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوں کہ کہیں میرا سانس نہ ٹوٹ جائے کہیں یہ میرے اندر جا کر مجھے پُھلا نہ دے اور میں ہاتھ پاؤں ایسے مارتا ہوں جیسے میرا آخر ہو اور پھر وُہ پانی نیچے ہونے لگتا ہے ، اُترنے لگتا ہے ۔ نیچے ہوتا ہے اور اُس کے ساتھ میں جاگ جاتا ہوں اور میرا سارا پنڈا نچڑتا ہے جیسے پانی میں سے نکل کر لیٹا ہوں ۔۔ اور پھر میں اٹھتا ہوں اور گھاگھرا پر آجاتا ہوں ۔ ادھر اس اونچے کنارے سے اُتر کر وہاں جاتا ہوں جہاں ڈور گا اس سمے چھینٹے اُڑا رہا ہے اور میں پانی کے اندر چلتا جاتا ہوں اور پانی میرے پنڈے پر چڑھتا جاتا ہے اور جب میری ناک میں جاتا ہے اور مُنہ میں جاتا ہے اور سانس اور پانی مل کر میرے پیٹ میں اتھل پتھل کرتے ہیں تب صرف اُس سمے میں جاگتا ہوں ۔۔۔"

"تم سوتے میں چلتے ہو؟" ورچن میں فکر مندی بہت تھی ۔

"نہیں ۔۔۔ کبھی نہیں ۔۔ ایسا صرف تب ہوتا ہے جب میں پانی کو سوتے میں دیکھتا

ہوں اور پھر ۔۔۔ جب میں جاگتا ہوں تو گھاگھرا میں کھڑا ہوتا ہوں اور پانی میرے مُنہ میں اور گلے میں میرا سانس کم کرتا ہے ۔۔۔ یہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے ورچن ۔۔ تو جانتا ہے تو بول ۔۔"

"دیکھ سمرو ۔۔۔ اگر ایسا ہوتا کہ تو سوتے میں اپنے آپ کو بڑا ہوتا دیکھتا تو جب جاگتا تو تیرے پاس جو کچھ مال اسباب ہے وُہ بھی بڑا ہو جاتا ۔۔۔ اگر سوتے میں تو گائے بھینس کے ساتھ ہو تو اگلا دن تیرے لئے اچھا ہوتا ۔۔ اور جو تو پنکھ پکھیروؤں کو سوتے میں اُڑتے دیکھتا تو جان کہ جو مال اسباب تیرے پاس ہے وُہ بھی اڑ جائے گا ۔ اگر چاند کو چمکتا دیکھے تو سمجھ کہ شِوا اور لنگم تجھے کچھ نہ کہیں گے ۔۔۔"

"پر میں ان میں سے کچھ بھی نہیں دیکھتا ۔ میں تو نرا پانی دیکھتا ہوں تو اس بارے میں بتا کہ اس کا کیا کھوج ہے ؟"

"تُو پانی میں چھلانگ لگاتا ہے اگر سوتے ہوئے تو اس کا تتارا تمہاری حیاتی میں یہ ہو گا کہ تم نے جو کچھ بُرا کیا وُہ پانی سے صاف ہو جائے گا، تیرے گناہ دُھل جائیں گے ۔۔۔"

"میں نے ایسے کونسے گناہ کئے ۔۔۔" سمرو زمین پر کڑواہٹ سے تھوک کر بولا "شِوا اور لنگم مُجھے کُچھ کہنے والے کون ہوتے ہیں ۔۔۔ اور ورچن میں پانی میں چھلانگ نہیں لگاتا میں تو دھیرے دھیرے اُس میں اُترتا جاتا ہوں اور پھر وُہ میرے مُنہ کانوں اور ناک میں چلنے لگتا ہے تو جاگ جاتا ہوں ۔۔۔"

ورچن نے سر ہلایا ۔ "اس بارے میں نہیں جانتا ۔"

"اور یہ سب جو تُو نے مجھے بتایا کہ سوتے میں اگر یہ دیکھیں تو اس کا تتارا یہ ہوتا ہے تو یہ تم نے کہاں سے جانا ؟ ۔۔۔ موہنجو سے ؟"

"پُورن سے ۔۔۔"

"یہ کون ہے ؟"

"بتاؤں گا ۔۔۔ اور کیا ہوا جب میں ادھر نہ تھا"

"اور کیا ہونا تھا ؟"

"پتہ نہیں پر کُچھ نہ کُچھ تو ہوا ہو گا ۔۔۔"

سمرو زمین کُرید تا رُکا ۔۔۔ "یہ دیکھو ورچن ۔۔۔"

"کیا ہے؟"

"یہ دیکھو ۔۔۔" اُس نے مٹی میں سے ایک ٹھیکری کھینچ کر نکالی "اس پر وُہی بیل بُوٹے ہیں جو پکلی اُلیکتی ہے ۔۔۔"

"پکلی کے آوے کے کسی برتن کی ٹھیکری ہے ؟"

"ناں ۔۔۔ یہ پہلے کی ہے ۔۔ یہاں پہلے کوئی اور تھا، کوئی اور پکلی تھی جو گیلے برتنوں پر بُوٹے اُلیکتی تھی ۔"

"ہماری بستی سے پہلے ؟" ورچن نے ٹھیکری ہاتھ میں لے کر اُس پر پھونک ماری تو دھول کے نیچے وہی بیل بُوٹے تھے ۔۔۔ پر آج کے نہ تھے "نہیں ہماری بستی سے پہلے کوئی اور بستی نہیں تھی ۔۔" اُس نے بازو گھما کر ٹھیکری کو گھاگھرا کے پانی پر پھینکا اور وُہ پانی کے کسی پکھیرو کی طرح اُس پر دُور تک پُھدکتی گئی اور جہاں چھوتی وہاں دائرے بنتے اور بڑے ہوتے گئے اور پھر وہ ڈور گا کے قریب جا کر رُکی اور تہہ میں بیٹھ گئی ۔۔ "ڈور گا اب آجاؤ ہمارے دریا کو گندا مندا نہیں کرو ۔۔"

ڈور گا ہاتھ اور سر جھٹکتا پانی سے باہر آیا اور پھر اونچے کنارے پر چڑھ کر اُن کے پاس بیٹھا ۔

"میں آدھا رہ گیا ہوں ۔۔" ڈور گا پُورے پیٹ کے ساتھ زور سے ہنسا "میں پاؤں اُٹھاتا ہوں تو جَو کی بالی کی طرح ہلکا لگتا ہے ۔۔۔ اس سے پہلے میں کبھی نہیں نہایا ۔"

"ہزار برس میں پہلی بار ڈور گا ؟" ورچن نے اُسے چھیڑا ۔

"ہاں ۔۔۔" ڈور گا کے ماتھے کی سلوٹیں اونچی ہونے لگیں "ہزار برس میں پہلی بار ۔۔"

"اور کل سویرے تم پھر نہاؤ گے کیونکہ میرا ویاہ ہو گا کل ۔۔۔"

سمرو نے سر اُٹھایا "کس کے ساتھ ؟"

"وہ کہتی تھی اب کر لینا چاہیئے" ۔۔۔

دیئے ٹمٹماتے تھے اور اُن کی روشنائی پانی کے اوپر دُور تک نہیں جاتی تھی اور جہاں جا کر وُہ بجھتی تھی اور اندھیرا آگے آتا تھا تو بس وہاں مچھلی پکڑنے کو جال ڈالے گئے تھے، سویرے پاروشنی اور ورچن کا ویاہ تھا اس لئے ۔۔۔ بچے کنارے سے اُتر کر پانی میں ہاتھ ڈالے چلتے تھے کچھو پکڑنے کے لئے کہ اُن کا شوربہ بنتا تھا ۔ جیوا نے اُن دو بھیڑوں کو الگ کیا جو سویرے اسے کاٹ کر ویاہ کے لئے لے جانی تھیں ۔

وُہ تینوں اپنے ویہڑے میں بیٹھے ڈھولک بجاتے تھے اور ڈھولک پر مور کے پروں کا چھیل رنگدار ہار پڑا تھا ۔

اور ڈوبو مٹی کے کنارے پند رُو کھڑا کان ہلاتا تھا کہ اُسے بستی سے ڈھولک کی مدھم آواز ہولے ہولے پہنچتی تھی ۔

اربیلڑی اور سوہنی زنانیاں اپنے آپ کو سنوارتی اور شنگھارتی تھیں کہ سویرے ۔۔۔

پاروشنی ہاتھ پاؤں چوڑے کئے پیٹھ کے بھار فرش پر ویسے ہی لیٹی تھی جیسے جب بھینسا اُس پر تنا کھڑا تھا پر اب پکلی اس پر جُھکی تھی ۔

"دیکھ دیکھ ۔۔۔" پاروشنی کا پنڈا کسمسایا اور وہ اپنی ہنسی مشکل سے روک کر بولی "میرے ماس کو یُوں نہ چُھو اور چھیڑ ۔۔۔"

"آرام سے پڑی رہ چُپ چاپ ۔۔۔" پکلی نے اُسے ڈانٹا "میرا ہاتھ ہلا کر بُوٹے خراب کرتی ہے"

"پر تو بنا کیا رہی ہے پکلی ؟"

پکلی کے ہاتھ میں پیپل کی ٹہنی تھی جس کا سرا چبا کر اُس نے نرم کیا ہوا تھا ۔ اُسے وُہ اپنے رنگ والے کُجّے میں ڈبوتی تھی اور پھر پاروشنی کے ننگے پنڈے پر دھیرے دھیرے پھیرتی تھی اور جونہی یہ ٹہنی اُس کے کسی نرم ماس والے حصّے پر چلتی تو پاروشنی کسمساتی اور اُس کی ہنسی

چُھوٹنے کو آتی پر وُہ پکلی سے ڈرتی تھی اور ہنسی کو پیٹ میں دبا دبا کر لیٹتی تھی ۔

"میں وُہ سارے بیل بُوٹے تیرے جُثے پر اُلیک رہی ہوں جو میں اپنی جھاجھروں ، صحنکوں ، ڈولوں ، گھڑوں اور گھڑولیوں پر اُلیکتی ہوں ۔ وہی بیل بُوٹے جن کے بارے میں تو ہمیشہ پُوچھتی ہے کہ پکلی یہ تُو کیسے بناتی ہے، یہ تیرے سر میں کہاں سے آئے، یہ اسی ٹہنی میں ہوتے ہیں کہ تُو جان بُوجھ کر سوچ کر بناتی ہے ۔۔ اب خود دیکھ لے یہ بن رہے ہیں"

"میں کیسے دیکھ لوں ۔۔۔" وہ پھر ہنسی "میں مٹّی پر پڑی ہوں اور تو ہاتھی کی طرح مجھ پر بوجھ کئے بیٹھی ہے اور مجھے ٹہنی سے اُلیکتی ہے ۔۔۔ میں اٹھ سکوں تو دیکھوں"

""تو جب تیار ہو جائے گی تو دُور سے جھجھر لگے گی ۔۔۔"

"جھجھر اور مُجھ میں کیا ہے جو ایک ہے ؟"

""تو نیچے سے چوڑی ہے ویسے ہی ۔۔۔ جیسے پھنیر سانپ کا پھن ہوتا ہے ۔۔ اور اس پھن سے تُو اپنا وار کرتی ہے ۔۔ تُو اب ہلنامت میں تیرے آس پاس بُوٹے بنانے کو ہوں ۔۔۔"

"پر یہاں دیکھے گا کون ؟" اُس کا جُثہ تھر تھرایا ۔

"جس کے ساتھ تیرا ویاہ ہو گا ۔۔۔"

پاروشنی دھیمی ہو کر مسکرائی اور پکلی اُس کی ٹانگوں کے بیچ بیٹھی سر جھکائے بُوٹے اور بیلیں اور جانے کیا کیا اُلیکتی رہی ۔

سویرے اُس کا ویاہ تھا اور پکلی اُسے سنوارتی تھی جیسے کہ وہ بستی کی ہر لڑکی کو سنوارتی تھی جس کا پہلا ویاہ ہوتا تھا۔ اس سے پہلے اُس نے پاروشنی کے بال دھوئے تھے ، پھر سُکھائے تھے اور پھر صندل کی لکڑی دُھکا کر اُس کی دُھونی اُسکے بالوں میں اسی طرح دُھائی تھی کہ اب وُہ صندل کی باس دیتے تھے ۔ لکڑی کی چوڑی کنگھی سے انہیں سنوارا گیا تھا ۔ اُس کی آنکھوں میں سُرمے کا لیپ دیا گیا تھا ۔

پکلی اٹھی اور پاروشنی کے سر کے قریب ہو بیٹھی "اب ان پر کیا بناؤں ۔" اُس نے اُس کی بھاری چھاتیوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔۔ "میرے پاس تو اتنا رنگ بھی نہیں کہ ان کے لئے پُورا پڑ جائے ۔۔۔"

جب پکلی اُس کی چھاتیوں پر جُھکی سانس روکے بیل بُوٹے بناتی تھی تو بھی اس کے نتھنوں کی گرم ہوا اُس کے ماس کو تھراتی تھی ۔۔۔ تب وہ سمرو کا سوچنے لگی ۔۔۔ دونوں ایک سے

تھے ، وُہ کبھی نہ جان پائی کہ اُن دونوں میں آگے کون ہے اور پیچھے کون ۔۔ کس کے لئے اُس کا پنڈا زیادہ دہکتا ہے اور کون ہے جس کا بیج اُس کے اندر جا کر یُوں ٹھہرے گا جیسے کُنویں میں پتھر گرے تو تہہ میں جا ٹھہرتا ہے ۔ اور پھر کل رُکھوں کے اندر گیلے گلتے پتوں پر پڑی جب وُہ ہانپتی تھی اور برسوں بعد ورچن اُس پر جُھکا تھا تو اُس نے جان لیا تھا کہ وہ سمرو سے آگے ہے ۔۔۔ اُسے یہ پرواہ نہیں تھی کہ رکھوں کے اندر بھنسنے کے پیچھے جاتے وُہ تینوں اُس پر کیوں سانس لینے لگے تھے ۔۔ بستی میں ایسا ہوتا آیا تھا اور ہو جاتا تھا پر اپنی من مرضی سے ایسا ہوتا تھا ۔

"میرا رنگ ختم ہو گیا ہے پر تیرا پنڈا ختم نہیں ہوا ۔۔" پکلی نے جِھلا کر بُوٹے الیکنے والی ٹہنی پھینکتے ہوئے کہا ۔

"تجھے میرا پتہ تھا تو رنگ زیادہ کیوں نہیں لے کر آئی ۔۔۔" پاروشنی اٹھنے لگی ۔

"نہ ۔۔۔ نہ ۔۔۔ ابھی لیٹی رہ اسی طرح ۔۔ سُوکھنے تو دے ۔۔۔ تجھی کو ایسا سنوارا ہے بستی کی کوئی اور ہوتی تو میں ایک آدھ بُوٹا بنا کر نکال باہر کرتی ۔۔۔ اب اِسے سُوکھنے دے اور پھر پرسوں اگر ورچن میری اور دیکھ دیکھ بار بار مسکرایا تو میں جان لُوں گی کہ تیرے پنڈے کے بُوٹے اُسے پسند آئے ہیں ۔۔۔ اور یہ جان لے کہ یہ تب اور زیادہ نکھریں گے اور ابھریں گے اور لال ہوں گے ۔۔۔"

"یہ تو مٹ جائیں گے پرسوں تک ۔۔۔" پاروشنی ہنسی ۔

"تو پھر تجھے بھٹی میں ڈال کر پکا دوں ؟" پکلی بھی خوش ہوئی "لے باقی شنگھار تو آپ کر لے ۔۔۔ تھڑے پر سارا کچھ پڑا ہے ناک کا پوپا ، پاؤں کی کڑیاں، موٹے کنگن اور چھلے، گلے کی ہنسی اور بازو پر باندھنے کی مُہریں ۔۔۔"

"یہ مُہریں ۔۔۔" پاروشنی پھر ڈوبی ۔۔ یہ سمرو نے جو بنائی تھیں ۔

"میں دھروا کے پاس جاتی ہوں جو چھپر کے باہر بیٹھا ہے اور تو پہن لے سب کچھ پر تو شنگھار کے ساتھ بستی کو کیسے جائے گی ۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ میں آپ تیرے پاس آکر شنگھارتی ہوں ۔۔۔"

"لو تم اپنی ٹہنیاں اور رنگ لے کر اتنی دور کہاں آتی ۔۔ میں چلی جاؤں گی ، تو لیٹ جا کر" پکلی چھپّر سے باہر ہوئی تو پاروشنی اُٹھ بیٹھی ۔۔۔

اُس نے آسے پاسے اُن جھجھروں اور ڈولوں کو دیکھا جو دیئے کی روشنی میں دِکھتے تھے کہ

سانس لینے والی چیزیں ہیں ـــ اور اُس کے اندر پھر سمرو کا خیال آیا ـــ نہیں ورچن سمرو سے آگے نہیں تھا ــ وہ تو پردیس ہوا تب یوں لگا کہ آگے ہے پر ہے نہیں ـــ

اُس نے ٹھوڑی نیچی کر کے اپنے آپ کو دیکھنے کی کوشش کی تو اُس کا منہ کُھل گیا ـــ وہ تو ایک بڑی چھایا والے رُکھ کی طرح تھی ، اُس پر پتّے تھے ، پُھول تھے ـــ اُس کا سارا جُثہ بیل بُوٹوں سے ڈھکا ہوا تھا اور جو رُکھ اُس پر پھیلتا تھا اُسی کی جڑیں اُس کے جُثے کے بیچ میں سے پھوٹتی تھیں جہاں پکلی جُھکی تھی ـــ جہاں اُس کو بھی جُھکنا تھا ــ اُس کا جی نہ چاہا کہ وُہ اپنے اس شنگھار کو ڈھک دے پر اُس نے ڈھک دیا اور تھڑے پر بیٹھ کر پاؤں میں کڑیاں ڈالنے لگی ـ

"می آؤں ــ می آؤں" رُکھوں میں مور بولا۔

اور پاروشنی کے اندر گھنے اندر جہاں نم تاریکی تھی وہاں بھی کُچھ بولا ـ "می آؤں ـ می آؤں"

اُن دونوں پر پُورا چاند پڑتا تھا اور وُہ رکھوں کے بیچ جھیل کے پاس اُس کلّراٹھی زمین پر جہاں کبھی جھیل تھی لیٹے تھے اور وُہ وہاں تھے جہاں پرندے مرنے کو آجاتے تھے ــ اُن کے بدنوں تلے پرندوں کی ہڈیاں چُرمُر ہوتی تھیں ـ

ورچن پہلی بار ادھر کو آیا تھا اور پاروشنی آتی رہتی تھی ـ یہ اُس کی مرضی تھی کہ اپنے ویاہ کی رات اِدھر رُکھوں کے بیچ گذارے ، بستی سے دُور اور ڈوبو مٹی کے ادھر اس کلراٹھی زمین پر سکڑتی ہوئی جھیل کنارے ـــ اُن دونوں کا آگا پیچھا کوئی نہ تھا اور اسی لئے پاروشنی کے گھر کے باہر کھڑے ہو کر کسی نے اونچی آواز میں یہ نہ پُوچھا تھا کہ اس گھر میں اب ہمیں کون کھانے کو دے گا ـ کون پانی پلائے گا اور کون جھاڑو دے گا ــ ورچن خود ہی میل لے کر آیا جس میں بستی کے سارے مرد تھے اور ادھر پاروشنی اپنے ویہڑے کے چھپر تلے بیٹھی تھی اور آس پاس بستی کی عورتیں دیئے جلاتی تھیں ـ

ایک لڑکی آٹے سے بھری پرات لے کر آئی تھی اور آٹے پر دو سپیاں رکھی ہوئی تھی ـــ یہ سپیاں گھاگھرا کی تھیں اور اُنہیں پاروشنی نے واپس دریا میں ڈالنا تھا پر ابھی وُہ اُس کی مٹھی میں تھیں ـــ ابھی جب وہ کلراٹھی زمین پر تھی اور اس کے ساتھ ورچن گھرے گھرے اور جیسے اُکھڑے ہوئے سانس لیتا تھا ـــ پھر چار عورتیں اُس کے سامنے آکر بیٹھ گئیں اور اُسے اپنے ننگے پیٹ دکھائے جو کنوارپن کے نرم آٹے کی طرح لچکیلے نہ تھے بلکہ اُن پر پھیل کر پھر سکڑنے

کے وہ نشان تھے جو بچے جننے والیوں کے پیٹ پر ہوتے ہیں ـــ پاروشنی نے ہر عورت کے اِن نشانوں کو باری باری اُنگلیوں سے چُھوا تاکہ کل کو اُس کا پیٹ بھی ایسا ہی ہو ـــ

پھر وُہ اٹھے اور باہر آئے اور تب لوگ زمین پر سے ڈھیمیں اُٹھا کر ہنستے ہوئے اُن پر پھینکنے لگے اور وُہ بھی مسکراتے اپنے آپ کو بچاتے بستی سے بھاگتے ہوئے نکلے ـ زیبو بیلوں ، چیوا کے چھپر اور ڈوبو مٹی ـــ کے آس پاس سے ہوتے ہوئے وہ یہاں تک آئے اور یہاں پہلے پاروشنی نے اُسے اپنے سامنے بٹھایا اور اُس کے گُن گنوائے ـــ

"میرا جُثہ تمہارے خیال میں ایسا تیرتا ہے

جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے ـــ

اور تم مجھے چُھوتے ہو تو میں ایسے تھراتی ہوں

جیسے نیچے جھیل کی تہہ میں مچھلی کنول کے ڈنٹھل کے ساتھ کھَے کر گزرتی ہو تو ـــ اُوپر پانی کی سطح کے اُوپر تیرنے والا کنول ہولے سے تھرّاتا ہے ـ

اور تم نے آنا تھا تو کلائیوں میں ـ

میری چُوڑیاں تنگ ہوگئیں ـــ"

پاروشنی چُپ ہوئی تو ورچن بولا ـ

"جب تم آتی ہو تو ـــ

تمہارے بالوں میں سجے پُھولوں کے پیچھے شہد کی مکھیاں آتی ہیں اور میں انہیں دیکھ کر جان جاتا ہوں کہ تم آتی ہو ـ اور تمہارے کانوں کی بالیاں اندھیرے میں بجلی کی طرح چمکتی تھیں اور تمہارے گنگھریالے بال تمہاری پیٹھ پر آوارہ تھے ـ

تم بہت دھیرے سے چوری چُھپے ایسے میرے پاس آئیں جیسے ٹیلے سے مور اُترتا ہے ـ

تم باس کی طرح آتی ہو اور میرے پاس تمہارے سانس زیادہ تیز اور گہرے چلتے ہیں اور تمہارا بدن گیلا ہوتا ہے ـ

اور جب تم واپس جاتی ہو تو تمہارا مہاندرہ پہلے سے بدل جاتا ہے ـــ

تو لوگ تمہیں کس طرح پہچانتے ہیں ؟

پر آج تم واپس نہیں جاؤگی ـ"

اُدھر رُکھوں کی چُپ میں اور پورے چاند میں ورچن بات کرتا تھا اور ادھر پاروشنی سمرو کا سوچتی تھی ـ وُہ ہوتا تو کیا کہتا ـــ اور بہت بعد میں ورچن نے اُسے بتایا تھا کہ اُس رات

جھیل کے پاس رُکھوں کے بیچ اُس کے بیچ جانے سے پہلے اُس نے جو کہا تھا وُہ سمرو کا کہا ہوا تھا جو اُس نے اُسے دیا تھا کہ لے یہ تو کہہ لینا ۔

"اپنے پہناوے کو کھول دو

تاکہ تمہارے چاند ایسے ماتھے پر جو پسینہ ہے وُہ ختم ہو ۔۔"

اور اُس نے ایسا ہی کیا اور پھر اُسے معلوم نہ تھا کہ کس طرح اپنے آپ کو اُس سے چُھپائے اور وُہ اُس کی پیٹھ پر اور سینے پر گرم لُو ایسے سانس لیتا تھا جو اُسے پگھلاتے تھے ۔ پھر اُس نے ایک ساہ پیونے سانپ کو دیکھا جو کھڑا تھا اور اُس نے اُس کا سانس پی لیا ۔۔۔ رُکھوں میں صرف بھینسے کا گرم سانس لُو کی طرح چلتا تھا اور اُسے راکھ کرتا تھا ۔

"تو کدھر ہے ؟" ورچن چڑھتے سانسوں میں مشکل سے بولا

"اِدھر ہوں ۔۔۔" پاروشنی برابر کے سانس میں تھی ۔

"نہیں ۔۔" ورچن اٹھ کر بیٹھ گیا ۔۔۔

پاروشنی کلّر اٹھی زمین پر ایسے پڑی تھی جیسے پتّوں اور ٹہنیوں والا ایک سرسبز رُکھ وہاں گرا پڑا ہو ۔

"پکلی نے تیرے بدن کو ایک رُکھ تو بنا دیا پر میں اس میں جان نہیں ڈال سکا ، یہ تو مری ہوئی مچھلی کی طرح ہے ۔ ہے تو مچھلی پر اوندھی ہو کر پانی پر تیرتی ہے ۔"

پاروشنی کا ماتھا یکدم پسینے سے بھیگتا گیا "تُو یہ کیسے کہتا ہے ؟"

"مرد جانتا ہے کہ کب وُہ عورت کو اتنا پانی دیتا ہے کہ وُہ اُسی میں تیرتی ہے اور کب اتنا کم کہ اُس کے گلپھڑے پُھولتے ہیں اور وہ اوندھی ہونے لگتی ہے ۔ اس میں دونوں میں سے کوئی ایک چور ہوتا ہے جو پانی کے آگے بند بناتا جاتا ہے تب ایسا ہوتا ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ کم سے کم میں نے ایسا نہیں کیا ۔۔۔"

پاروشنی کروٹ بدل کر اُدھر کو دیکھنے لگی جدھر کو رُکھوں میں رستہ جاتا تھا اور جہاں سے ورچن آیا تھا اور جہاں وُہ بھینسا تھا ۔۔۔ ہاں سمرو ورچن سے آگے تھا اور ورچن نے جان لیا تھا پر اب کیا ہو سکتا تھا ۔۔ کوئی پکھیرو اُوپر سے اُس کی ننگی پیٹھ پر گرا اور ٹھنڈا ہو گیا ۔ اُس جیسے وہاں پہلے بھی بہت تھے ۔۔۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی ۔ ورچن نے کلّر اٹھی زمین پر لیٹے اُسے اپنے اوپر چھاؤں کرتے دیکھا جیسے گرا ہوا رُکھ سیدھا کھڑا ہو گیا ہو ۔۔۔ وہ پکلی کے بنائے بیل بوٹوں کو اُس کے بدن پر پھیلتے دیکھتا تھا اور گُم ہوتا تھا اور یہ بُوٹے یُوں بھی پسینے میں بھیگتے تھے اور اب

چاند کی لَو میں ظاہر ہوتے تھے ۔

"سمرو کا خیال تیرے اندر ہے اور تیرے پانی کو روکتا ہے ۔" ورچن کہتا تھا "میں جانتا ہوں ۔۔"

اور تب ورچن کے چہرے پر جو چھاؤں تھی وُہ پرے ہوئی اور پاروشنی پرے ہوتی ہوتی رُکھوں کے اندر چلی گئی ۔ وہاں بانجھ عورتوں کے رُکھ نے اُسے روکا نہیں کیونکہ وُہ جانتی تھی کہ اُس کا بیج ٹھہرے گا اور وُہ چُلتی گئی ۔ اس کے اوپر پتّوں کے گھنے جُھرمٹ میں کوئی ہنسا اور وُہ ٹھٹک گئی ۔ اُوپر اُن پتّوں میں ماسا کا بے دانت چہرہ تھا جو پوپلا ہو کر ہنستا تھا ۔

"تو چلی آئی پاروشنی ۔۔ پر کیوں ۔۔۔ پر کیوں ۔۔۔ مجھے رُکھوں میں جو ہوتا ہے اُس کا پتہ ہے اور مجھے وُہ بھی پتہ ہے جو تیرے اندر ہوتا ہے ۔۔۔"

"مامن ماسا ۔۔۔" پاروشنی نے سینے پر ہاتھ رکھا ۔۔۔ "تم ادھر کیا کر رہے ہو ؟"

"میں ؟" ماسا ہنسا "میں تم سے پوچھتا ہوں تم ادھر کیا کر رہی ہو ۔۔۔ جانتی نہیں میں ادھر ہی ہوتا ہوں ۔۔۔ رُکھوں کے اندر ۔۔۔ تیرے ویاہ پر گیا تھا میل کے ساتھ اور پھر لوٹ آیا ۔۔۔ آجا اوپر آنا ہے تو آجا ۔۔۔"

"نہیں مامن ۔۔۔"

پاروشنی کا پنڈا اب اُس ٹھنڈ کو محسوس کرنے لگا جو ہوا میں تھی پر جو اُسے ابھی تک لگی نہیں تھی کیونکہ وہ گرم تھی ۔۔۔ پر اب وہ چولہے کی راکھ کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی ۔ اُس نے ہتھیلیوں سے اپنی چھاتیوں کو مسلا جو اب پہلے سے کم ہو چکی تھیں ۔

"مامن تم ادھر کیوں رہتے ہو ؟"

"تم بستی میں کیوں رہتی ہو ؟ ۔۔۔" ماسا پھر ہنسا ۔

"وہاں پانی ہے گھاگھرا ہے اس لئے ۔۔۔"

"اور اگر وہاں پانی نہ ہو گھاگھرا نہ ہو تو ؟" ماسا ایک چپ سرگوشی میں بولا "پھر کہاں رہو گی ؟"

ماسا کیا کہتا ہے کہ گھاگھرا نہ ہو تو ۔۔۔ کیوں نہ ہو ۔۔ جیسے آسمان ہے ویسے گھاگھرا ہے اُس نے کہاں جانا ہے ؟

"میں ہمیش بستی میں رہوں گی مامن ۔۔۔ ہمیش ۔۔۔ تمہیں پتہ ہے میں کب سے یہاں ہوں ؟ ۔۔۔ ہمیشہ سے ۔۔۔ اور میں رہوں گی"

وہ چلنے لگی تو ماسا اُس کے سامنے والے رُکھ سے نیچے آگیا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا"

لے میں تیرا مامن ہوں ۔۔۔" پاروشنی اپنے آپ کو چپ کئے کچھ دیر کھڑی رہی اور پھر وہ ماسا کے دُبلے سروٹ جُثّے سے چمٹ گئی اور اُس کی آنکھوں میں پانی تیرے ۔۔۔ "مامن تو جو جانتا ہے وہ مجھے بتا دے ۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ سب کیا ہے ۔۔۔ کیوں ہے ۔۔۔ وہ اگر ہے تو کہاں ہے ۔۔۔ اور ہم کیوں ہیں مامن ۔۔۔ ہم کیا ہیں ؟"

"چُپ چُپ ۔۔۔" ماسا اُس کے ہونٹوں پر سُوکھی ہوئی ہتھیلی رکھ کر کہنے لگا "مت بول ۔۔۔ ہم اس لئے ہیں کہ ہمیں ہونا چاہئے ۔۔۔ وہ اگر ہے تو یہیں ہے ۔۔۔ بس اتنی سی بات ہے ۔۔۔ یہ رُکھ اور جنور بھی مجھ سے یہی پوچھتے ہیں اور میں اُن کو بھی یہی بتاتا ہوں ۔۔۔ سب کچھ یہیں رہتا ہے یہ رُکھ بھی جنور بھی اور پانی ، رُتیں اور ہم اور کھیتیاں بھی ۔۔۔ یہ سب مٹّی میں جاتا ہے اور پھر آ جاتا ہے ۔ جاتا ہے اور پھر آ جاتا ہے ۔۔۔ میں پتہ ہے رُکھوں میں کیوں آ گیا تھا ؟ بس اسی لئے ۔۔۔ بس اسی لئے" ماسا یکدم پاروشنی سے الگ ہوا اور چھلانگیں لگاتا رُکھ کے اوپر جا بیٹھا ۔۔۔ "اب جا بھی ۔۔۔" اُس نے غصّے سے کہا ۔

پاروشنی رستہ جانتی تھی اور وہ اُس پر چلنے لگی ۔ وُہ گرے ہوئے رُکھوں کو پھلانگتی نہیں تھی اُن کے گرد ہو کر نکل جاتی تھی ۔ رُکھوں کا ذخیرہ ختم ہوا تو ڈوبو مٹّی شروع ہو گئی اور وہ یہاں ٹھٹکی ۔ چاند ڈھل رہا تھا اور یہاں رُکھوں کی اوٹ میں تھا ۔ اندھیرے میں کیا پتہ کہ پیر کہاں جا پڑے ۔ اُس نے ایسے لوگوں کو دیکھا تھا جو اُس کے سامنے صرف پیر ادھر اُدھر ہونے سے نرم ڈوبو مٹّی میں نیچے ہو گئے ، باہر نکلنے کے لے ہاتھ پاؤں مارے تو اور نیچے ہوئے ۔۔۔ پہلے ہنسے کہ یہ کھیل ہے کہ باہر نکلا نہیں جاتا اور جب گھٹنوں تک نیچے ہوئے تو پھر پسینے میں بھیگے کہ نہیں ایسا نہیں ہے یہ تو آخر ہے ۔ اور وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے اوجھل ہوتے تھے اور ڈوبو مٹی اُنہیں نگلنے کے بعد ویسے ہی آرام سے پھیل جاتی تھی اور اُس پر پہلے کی طرح مچھر اور گُتّی اُڑنے لگتی تھی اور کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے نیچے کچھ ہے یا گیا ہے ۔۔۔

پاروشنی پیروں کو جما جما کر چلنے لگی ۔

پندروشائد رُکھوں میں تھا یا شائد ریت کا طرف نکل گیا تھا ۔

وہ بستی کی اَور جانے کی بجائے پکلی کے آوے کی طرف نکلی ۔۔۔ بندہ کسی شے کے لئے ترستا ہے ۔ اُسے سوتے میں دیکھتا ہے جاگتے میں سوچتا ہے اور اُس کے بغیر سانس ٹھیک سے نہیں چلتا اور وہ جب مل جاتی ہے تو یہ ہوتا ہے جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ۔۔۔ سروٹوں کے

بیچ میں سے اور پھر بلند کناروں پر اور اُن کے نیچے اُترتے ہوئے وہ دیکھتی جاتی تھی کہ کب گھاگھرا کے پانی دکھائی دیں ۔۔۔ اور وُہ وہیں تھے جہاں ہوتے تھے اور ڈھلتی چاندنی میں مدھم سا لشکارا دیتے تھے ۔۔۔ وہ پانی میں داخل ہوئی اور چلی اور چلتی گئی اور پانی اُس کی ٹانگوں کو گھیرتا کُولہوں تک آیا اور وہ چلتی گئی یہاں تک کہ اُس کے کانوں کے لوہیں بھیگنے کو آ گئیں اور وُہ رُکی ۔۔۔ اب اُس کی آنکھیں پانی سے باہر تھیں اور سارا جُثّہ گھاگھرا کا حصّہ تھا ۔ وُہ اپنے سامنے بچھی مدھم مدھم لشکتی چادر کو دیکھتی تھی جو اُس کا دریا تھا ۔۔۔ اُس کے پانیوں نے اُس کے جُثّے سے سارا اشک اور سارا دُکھ صاف کیا اور اُسے سُکھ دیا ۔۔۔ جُثّے جُڑنے سے اکلاپے میں دراڑ نہیں پڑتی یہ وُہیں رہتا ہے جہاں ہوتا ہے اور یہ اُس وقت سے ہوتا ہے جب بیج پڑتا ہے پُھوٹتا ہے اور اُس میں دانہ پڑتا ہے اور وہ وُہیں رہتا ہے کہیں نہیں جاتا ۔۔۔ ہاں گھاگھرا کے پانی اس کا اپا تھے ۔۔۔ اکلاپے کی کچّی دیوار ان کے سامنے گُھلتی تھی ، وُہ اسے صاف کرتے تھے اور سُکھ دیتے تھے ۔۔۔

چیتر کے پانی کم ہوتے ہیں پر اُن میں برفوں کا سیت پالا ابھی ٹھہرا ہوتا ہے اور بدن اِس میں ٹھٹھرتا ہے اور پاروشنی ٹھٹھری ۔۔۔ اُس نے اپنا مہاندرہ کنارے کو کیا اور دھیرے دھیرے باہر آنے لگی ۔ نیم روشنائی میں دریا کا کنارہ اونچا ہوتا آسمان کو لگتا تھا اور نیم روشنائی میں اُس کے اوپر سمرو تھا ۔۔۔ ٹھیک طرح سے دیکھا تو نہیں جا سکتا تھا پر اُس نے جانا کہ وہ سمرو ہے ۔

اُس رُکھ کی کوکھ میں اُس رات دو پنکھیرو اُترے ۔

اور پھر رات کی چُپ تھی ۔ چیتر کی چاندنی پھیکی پڑ چکی تھی اور وہ دونوں بے سُدھ مُنہ کھولے ٹھنڈے اور تھکن سے ٹوٹتے سوتے تھے ۔ تب سمرو کے حلق نے پھر پانی مانگا وہ سوکھتا تھا ۔ وہ اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھا اور بیٹھ گیا ۔ پاروشنی بازوؤں میں مُنہ رکھے سوتی تھی ۔ سمرو کی جھجھر اُس کے سرہانے دھری تھی ۔

کوئی کہتا کہ وہ آگ کا کام کرتا ہے ، دھاتیں ڈھالتا ہے اور مُہریں بناتا ہے ، پتھر کاٹتا ہے اور یُوں اُس کے بدن کا پانی سُوکھتا رہتا ہے اور کم ہوتا ہے ۔۔۔ اور پھر بدن پانی واپس مانگتا ہے ۔۔۔ اور کئی لوگ یوں سوچتے تھے کہ اُس کے جُثّے میں بہت گرمی ہے جو کم نہیں ہوتی ، اُس پر پانی ڈالتے جاؤ تو دھیمی رہتی ہے نہیں تو اُسے جلاتی ہے اور اسی لئے سمرو کے پاس دن ہو یا رات ہو ایک جھجھر پڑی رہتی تھی ۔۔۔ ہاں دن کو بھی اور رات کو بھی ۔۔۔ دن کو تو اُس کا ہاتھ جھجھر کی گردن پر ہی جا رہتا اور رات کو وہ اٹھتا رہتا اور اپنے سُوکھتے گلے کو تر کرتا رہتا ۔۔۔

سوتے میں اُس کا گلا سُوکھتا اور اس طرح سُوکھتا جیسے سُوکھی لکڑی ہو جو ٹوٹتی ہو ۔ وہ اٹھتا اور جھجھر کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اُسے اٹھاتا اور اُس کا مُنہ اپنے ہونٹوں کے درمیان رکھ کر پانی اپنے اندر گراتا اور پھر لیٹ جاتا ۔۔۔ اُس کے مُنہ میں اور گلے میں ناگ پھنی کی کھیتیاں اُگتی تھیں اور وہ پانی سے ان کو ڈبوتا رہتا تھا۔

آج رات بھی اُسے پیاس لگتی تھی ویسے ہی جیسے لگتی تھی پر تھوڑی سی زیادہ کہ اُس کے جُثے کی کچھ کچھ نمی تو اُس پسینے میں بہہ گئی جو پاروشنی کے بیل بُوٹوں کو چمکاتا تھا ۔

سمرو نے جھجھر کے گلے کو پکڑا ۔

رات لیٹتے وقت وہ جھجھر کو مُنہ تک بھرتا اور پھر ساری رات اُس میں سے گھونٹ بھرتا رہتا اور اُسے معلوم ہوتا کہ اب جھجھر میں کتنا پانی باقی ہے ، کتنے گھونٹ رہ گئے ہیں ۔ وُہ جب بھی اُسے اُٹھاتا تو اُس کی اُنگلیوں کا ماس جھجّھر کی ٹھنڈک سے مَس ہو کر بتاتا کہ اب پانی یہاں تک ہے ۔۔۔ جہاں تک پانی ہوتا وہیں تک جھجھر کی مٹی میں ٹھنڈک رہتی اور اُس کے اُوپر ویسی ہی جیسی کہ رات ہوتی ۔۔۔ کئی بار وہ جھجّھر کی گولائی پر ہاتھ پھیرتا تاکہ کچھ نمی اُس کے اندر جائے ۔

اُس رات جب پاروشنی بازؤوں میں مُنہ رکھے اوندھی سوتی تھی اور سمرو کا گلا پھر خشک ہوا اور اُس میں ناگ پھنی کی فصل اُگی اور اُس نے ہاتھ بڑھا کر جھجّھر کے گلے کے گرد اُنگلیاں جمائیں تو اُسے کچھ ہوا ۔۔۔ کچھ شک ہوا ۔۔۔ ٹھنڈک وہاں سے تھوڑی سی نیچے تھی جہاں وہ پہلے تھی ۔۔۔ اُس کی ہتھیلی بتاتی تھی کہ لیٹتے وقت پانی یہاں تک تھا اور اب ۔۔۔ ذرا نیچے تھا ۔۔۔ اور اُس نے اُس میں سے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا ۔۔۔ جھجھر میں اتنا پانی نہیں تھا جتنا ہونا چاہئیے تھا ۔۔۔ تو پھر ۔۔۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنے سوکھے ہوئے گلے میں سے تھوک نگلی ۔۔۔ تو پھر ۔۔۔

ڈور گا ڈوبو مٹّی پر قدم جما کر تو چلتا تھا پر دیکھ بھال کر نہ چلتا تھا ۔۔۔ اور اُس کے اندر کوئی ڈر کوئی وہم نہ تھا کہ ابھی اُس کے اگلے قدم پر زمین بیٹھتی جائے گی اور اُس کا پچھلا قدم اُٹھ کر آگے آئے گا اور وہ بھی اُس کے ساتھ مکّھن میں اُنگلی کی طرح دھنستا جائے گا ۔۔۔ نہ ۔۔۔ اُس کے اندر کوئی ڈر نہ تھا ۔ وہ میل کو جاتا تھا ۔۔۔ وہ جاتا تو صرف ایک کو ملنے کو تھا پر وہ اکیلا نہ جاتا تھا ۔ نہ نہ جاتا تھا ۔۔۔ یہاں وہ سب تھے جو آج تک بھٹّے کی چاردیواری کے اندر پیدا ہوئے اور مر گئے ، نہ اُنہوں نے کبھی سندھو دیکھا اور نہ گھگھرا ۔۔۔ نہ کوئی ساک انگ دیکھا اور نہ کوئی سُکھ کا سانس ۔ وہ پیدا ہوئے تو بندے کا بیج تھے پر ہولے ہولے وہ جنوروں کے جائے بنتے گئے ۔ اینٹیں ڈھو ڈھو کر اُن کی کمر جھک گئی ، اُن کی کھال سُکڑ گئی اور سارے جُثّے پر سے جنوروں اور پشوؤں ایسے بال لٹکتے تھے اور جب کبھی اُن جنوروں میں سے کوئی ایک اپنے بُھوکے پیٹ اور باہر لٹکتی زبان کے ساتھ اپنے جھکے ہوئے جُثّے پر مالک کی مار کھاتا تھا تو اندر سے یہی کہتا تھا کہ میں آخر کو تم سے ملنے آؤں گا ۔۔۔ میں تم سے میل کروں گا ، پر ایسا کہاں ہوتا ؟ بھلا مالک میل کرنے دیتا ہے ۔ جس کے ہاتھوں میں اَن پانی اور چھاؤں چھپّر ہوں اور موہنجو میں حویلیاں ہوں اور وہاں اُس کے کنک سے گودام بھرے ہوں اور اُس کے کامے پاؤں تلے اپنے جُثّے بچھاتے ہوں تو وہ میل کرنے دیتا ہے ۔۔۔ پر جب کبھی اُن میں سے کوئی مشقّت کرتا کرتا خون تھوکتا اور ٹھنڈا ہو جاتا تو وہ آنکھیں مردہ ہونے سے پہلے یہی کہتا کہ میں میل کو آؤں گا ۔۔۔ اور جب کبھی کسی کی کوکھ میں سے نکلا ہوا اُس کے سامنے اکڑتا اور بے جان ہوتا اور اُسے اٹھا کر چاردیواری سے باہر پھینک دیا جاتا کہ بس یہی ایک راستہ تھا باہر جانے کا تو وہ بھی یہی کہتی کہ میں میل کو آؤں گی ۔۔۔ تو ڈور گا اکیلا ملنے کو نہ جاتا تھا وہ سب اُس کے ساتھ جاتے تھے ۔

ڈوبو مٹّی کے خاتمے پر جب اُس نے رکھوں کی سیاہی کے اندر پاؤں رکھا تو وہ مسکرایا ، تم یہاں ہو میں جانتا ہوں ۔ میں تم سے میل کرنے آیا ہوں ۔ تم وہاں ہو سندھو کے کنارے اُس

بھٹے کی چاردیواری کے اندر پر یہاں بھی ہو اِن رُکھوں کے اندر ۔۔۔ تم جہاں بھی ہو میں میل کرنے آیا ہوں ۔ ڈورگا بے دھڑک اندھیرے میں چلتا تھا جیسے دیکھتا ہو اور وہ دیکھتا تھا ۔ چاردیواری کے باہر آکر اُس نے بہت کچھ دیکھا جو پہلے نہ دیکھا تھا اور اب دیکھتا تھا اور اب رکھوں میں بھی دیکھتا تھا ۔

دیکھو ، میرے باوا میرے بڑے نے کہا کہ کبھی نہ کبھی میں میل کو آؤں گا پھر اُس کے بڑے نے بھی یہی کہا تھا اور اُس کے بڑے نے بھی ۔۔۔ سب یہ کہتے رہے اور مرتے رہے ۔ میں اکیلا نہیں آیا اُن کو ساتھ لایا ہوں ۔ وہ سب یہاں ہیں جو دھیرے دھیرے کُڑھتے رہے اور مرتے رہے ، جنہیں جنور بنایا گیا ۔۔۔ ڈورگا کے پاؤں تلے پتے چرمراتے اور رکھوں کی خاموشی میں اُن کی آواز دُور تک ٹوٹتی جاتی ۔

دیکھو جب میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور میری ماں نے خود اُس ڈوری کو کاٹا جس کے ساتھ میں اُس سے بندھا تھا تو اُس نے مجھے اُس آگ کے پاس لٹایا جس میں وہ لکڑی ڈالتی تھی اور میں اُس آگ کی گرمی میں سوکھتا تھا ۔ میری ماں نے مجھے جنا ، ایک طرف رکھا اور پھر کام میں جُت گئی کیونکہ اب اُس کا پیٹ خالی تھا اور خالی پیٹ کے لیے اَن چاہیے تھا جو تمہارے ہاتھ میں تھا ۔

دیکھو ، موہنجو کے بچے مٹّی کی جِن بیل گاڑیوں ، گُلہریوں اور اندھے بندروں کے ساتھ کھیلتے تھے اُن کو بھٹے کی آگ میں مَیں پکاتا تھا پر میں صرف پکاتا تھا ، کھیلتے وہ تھے ۔۔۔ میں بھی بچّہ تھا اُس سمے پر میرا کام اُن کھلونوں کو پکانا اور ان کا کام کھیلنا ۔۔۔ میں کاما تھا اور وہ کھیلنے والے ۔۔۔ اور کھیلنے والے کون لوگ تھے ؟ میرے اپنے رنگ ڈھنگ کے یا اُوپر سے اُترنے والے اسوا پر بیٹھے اونچی ناک والے؟ ۔۔۔ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا تھا ۔۔۔ کچھ بھی نہیں ۔۔۔ میرے لئے تو رُتیں ساری کی ساری پسینے کی رُتیں تھیں ۔ میری ماں کے اندر کس کا بیج ٹھہرا تھا یہ نہ میں جانتا ہوں اور نہ جاننے کا مجھے کوئی چاؤ ہے ۔ اُن بہت سارے جُھکے ہوئے بندوں میں سے کوئی ایک ہو گا ۔ مجھے تو اچنبھا اس بات پر ہے کہ وہ دونوں مجھے بنانے کو آپس میں کس طرح مل بیٹھے ۔ اُن کو ملنے کیسے دیا گیا ۔۔۔ میں نے تو لوگوں کو چلتے پھرتے ، اٹھتے بیٹھتے اور ہنستے مسکراتے اُس روز دیکھا جب میں چاردیواری سے باہر آیا ۔ اس سے پہلے میرے لئے سب لوگ جھکے ہوئے ہوتے تھے اور کام کاج میں نچڑتے ہوئے بس ۔۔۔ جب رات پڑتی اور اینٹیں دکھائی نہ دیتیں تو یہ سب اَن اندر ڈال کر بے سُدھ پڑتے اور سویرے منہ اندھیرے

ویسے ہی جُھک جاتے ۔۔۔ میں نے اُنہیں کبھی چلتے پھرتے ، اُٹھتے بیٹھتے اور ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا اور جب باہر کے لوگوں کو ایسے دیکھا تو اچنبھا ہوا کہ لوگ ایسے بھی زندگی کرتے ہیں ۔۔۔ میں وہ گیلا برتن تھا جو ماں کی بھٹّی میں پکا ۔۔۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں جانوں کہ وہ دونوں مالک سے چوری اور کام کاج سے پرے ہو کر کیسے یوں ملے کہ میں ہوا ۔۔۔ پر یہ بھی ویسے ہی ہوا ہو گا جیسے میرے بال ہوئے تھے ۔۔۔ میرے بچّے آئے تھے ۔۔۔ کتنے تھے وہ ؟ ۔۔۔ کیا پتہ ۔۔۔ کیا پتہ وہ سب ہوں جن کے جوان جُسّے پسینے سے نچڑتے تھے اور کیا پتہ اُن میں سے کوئی بھی نہ ہو ۔۔۔ جب اندھیرا گرتا تھا تو ہم سب چھپروں تلے پڑتے تھے تو بے سُدھ پڑتے تھے اور تب اگر کچھ جُسّے سرک سرک کر ایک دوسرے کے پاس ہو ہو جاتے تھے تو کیا پتہ چلتا تھا کہ کون کس میں ہے ۔۔۔ تو مجھے اُن کا پتہ نہ چلا جو میرا بیج تھے جس طرح مجھے یہ پتہ نہ چلا جس کا میں بیج تھا اور اس کا بھی مجھے دکھ تھا ۔۔۔ بندے کو پتہ تو ہو کہ وہ آگے بڑھا ہے ۔۔۔ اُس کا بُوٹا ہرا ہوا ہے ، اُس کا بیج سُوکھ سڑ نہیں گیا اور تب بھی میں نے یہی کہا کہ میں آؤں گا ۔

"می آؤں ۔۔۔ می آؤں" مور اُس کے پاس کہیں بولا ۔

"اب بولتے ہو ۔۔۔ شی" ڈورگا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چاروں اور دیکھا "چُپ ۔۔۔" اور پھر کان کے پیچھے ہتھیلی رکھ کر اُس نے سُنا جیسے دور کے جواب کو سنتا ہو ۔

رُکھوں کے اندر کوئی پکھیرو رُک رُک کر بولا اور پھر چپ ہو گیا ۔

ڈورگا نے اپنی چپٹی ناک کے نتھنوں کو پھلا کر رُکھوں کے اندر ٹھہری ہوئی باس کو اپنے اندر کھینچا ۔۔۔ ہُوں میں تجھے سونگھتا ہوں ۔۔۔ وہ مسکرایا ۔۔۔ باس کو اپنے اندر کھینچا اور پھر اندھا دُھند بھاگنے لگا ۔ رُکھوں سے ٹکراتا اُن کو پھلانگتا بھاگنے لگا ۔۔۔ چیتر کی چاندنی پتوں میں سے چِھن کر نیچے آتی تھی تو وہاں پتہ چلتا تھا کہ آگے کیا ہے ۔

اُوپر رُکھوں کے اندر کوئی ٹہنی ٹوٹی اور ماسا نے آنکھیں کھول کر نیچے دیکھا ۔

نیچے کوئی رُکھوں سے ٹکراتا اُن کو پھلانگتا بھاگتا تھا اور چیتر کی چاندنی پتوں میں سے چھن کر نیچے جاتی تھی تو وہاں پتہ چلتا تھا کہ نیچے کیا ہے ۔ اور وہ وہاں ایک رُکھ کے ساتھ ٹیک لگائے اُونگھتا تھا ۔ اُس کی کالی بھور آنکھیں بند تھیں اور وہ نیند اور زور کے نشے میں بے سُدھ پڑا اونگھتا تھا ۔۔۔ تب اُس کے ڈھلکے ہوئے کان تھرائے اور پھر سیدھے ہو گئے ، ایک آواز آتی تھی ، رُکھوں میں سے ایک دھمک آتی تھی جیسے کوئی زمین کو پاؤں سے ڈھول کی طرح پیٹتا چلتا

ہو ۔۔۔ اور یہ اُن رُکھوں میں رہنے والے کسی جنور کی نہ تھی کیونکہ وہ سب کے پاؤں کی چاپ کو جانتا اور پہچانتا تھا ۔۔۔ اور نہ ہی یہ کوئی بندہ تھا کہ بندے کے پاؤں زمین پر یوں نہیں پڑتے کہ وہ ڈھول ایسے دھم دھم بولنے لگے ۔۔۔ تو پھر یہ کیا ہے جو سنائی دیتا ہے ۔۔۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کان لگا کر سننے لگا ۔ کوئی اُس کی طرف آتا تھا اور اُس کے لئے آتا تھا۔ اُس کے نتھنے پھڑکے اور اُن میں بُھوک اور بے چارگی کی باس آئی اور وہ چوکنّا ہو گیا ، کوئی اُس کی طرف آتا تھا اور اُسی کے لئے آتا تھا ۔

جب ڈور گا بھاگتا ہوا اُس گھنے جُھنڈ کے اندر آیا جس کے ایک رُکھ سے ٹیک لگائے وُہ پہلے اونگھتا تھا اور اب چوکنّا کھڑا تھا اور اُس کی اڈیک میں تھا اور اپنے پچھلے سموں سے زمین کو رگڑتا تھا تو ڈور گا ٹھٹکا اور کھڑا ہو گیا ۔ ایک پل کے لئے اُس میں وہ سارا ڈر آیا جو اُن سب کا تھا جو میل کے لئے آنے کو تھے اور جنہیں وہ ساتھ لایا تھا اور یہ ڈر نکلتا بہت کم ہے بلکہ اندر بیٹھ جاتا ہے ۔ جھکی ہوئی کمر سیدھی ہو جائے تو بھی اندر سے جھکی رہتی ہے ۔۔۔ وہ اُس کے سامنے کھڑا تھا اور اُس کے نتھنوں کی گرم ہواڑ اُس کے جُثّے تک آتی تھی ۔

میں اُن سب کی طرف سے آیا ہوں جو کبھی تمہاری چار دیواری میں تھے ، جُھکے ہوئے لوگوں کی طرف سے جو تمہارے لیے اینٹیں ڈھوتے تھے ، جن سے موہنجو کے کنک گودام ۔ حویلیاں ۔ تالاب اور کنویں بنتے تھے ۔ کہاوت ہے کہ اس ساری زمین پر لوگ پتّھر اور گارے کی بستیوں میں رہتے ہیں اور یہ صرف موہنجو میں ہے کہ یہاں پکّی اینٹ لگتی ہے ۔ کسی نے آج تک یہ نہ پُوچھا کہ ان اینٹوں کو بناتا کون تھا اور انہیں پکاتا کون تھا ۔ سب نے موہنجو کے گودام اور کنویں دیکھے اور اُن کو نہ دیکھا جو شہر سے پرے سندھو کے کنارے چار دیواری کے اندر بھٹّوں پر جنور بنے کام کرتے تھے اور گارا بناتے تھے ، اُسے سانچے میں ڈالتے تھے ۔ دھوپ میں سکھاتے تھے اور پھر بھٹّے میں رکھ کر اُس کے گرد آگ جلا کر پکاتے تھے اور آگ جلائے رکھتے تھے ۔۔۔ اور وہ تم تھے جس نے پہلے پہل وہ چار دیواری بنائی ۔۔۔

اِن رُکھوں میں میرا راج تھا یہ کدھر سے آ گیا ۔۔۔ موہنجو تو یہاں سے بہت دُور ہے! رُکھوں اور ریت کے پار کئی دن اور کئی رات کی مسافت پر اور یہ وہاں سے یہاں کیسے آ گیا ۔۔۔ پر اچھا ہوا جو آ گیا ۔

بھینسا ڈور گا کے سامنے کھڑا تھا اور اُس کے نتھنوں کی ہواڑ اُس کے سیاہ جُھکے ہوئے جُثّے کو جھلساتی تھی ۔

اُس کے نتھنوں کی ہواڑ اُس کے سیاہ جُھکے ہوئے جُثّے کو جھلساتی تھی پر رُکھوں کے اُس ذخیرے میں کُچھ اور بھی تھا جو پھیلتا تھا ۔ ایک باس تھی جو رُکھوں کے اندر سوئی پڑی تھی ، کتنے برسوں سے ، ہزاروں برسوں سے اور وہ جاگی ۔۔۔ اُن کے جُثّوں سے نچڑنے والے پسینے کی باس جو اگر ایک جگہ سارا کا سارا گرتا تو گھاگھرا سے بڑھ کر پھیلتا ۔

"آ گئے ہو ۔ آ گئے ہو" اوپر کہیں اوپر پتّوں کے درمیان اُنہی کے رنگ میں رنگا ماسا تالی بجاتا تھا "مجھے پتہ تھا تم آؤ گے میل کرنے ۔۔۔ نرا ماسے کو پتہ تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا"

"سب جانتے تھے ۔۔۔" ایک رُکھ جو بوڑھا ہو کر بودن ہو چکا تھا اندر سے خالی ہو چلا تھا بولا ۔ "یہ ادھر ہم میں پھرتا تھا اور ہم جانتے تھے کہ کوئی آئے گا جو اس کے ساتھ میل کرے گا"

"یہ کون بولا ؟" ماسا نے کان کھڑے کر دئیے "کون بولا ۔۔۔؟"

"میں اور کون ؟" ایک رُکھ بولا

"مَیں مَیں" دوسرا کہنے لگا ۔

"اور میں ۔۔۔" ایک پیپل کے پتّے کھڑکے ۔

"ہیں ؟" ماسا اچنبھے میں تھا "میں تم میں رہتا تھا ۔ بستا تھا ۔۔۔ اور تم کبھی نہ بولے ۔۔۔ آج کیا ہوا ۔۔۔ کیا تم سچ مچ بولتے ہو ۔۔۔ یا میرے کان بجتے ہیں"

ڈور گا کے آس پاس رُکھ بولتے تھے ۔ ماسا تالی بجاتا تھا اور سامنے وہ سانس اندر کو کھینچ کر باہر ایسے پھینکتا تھا کہ ڈور گا کے جُثّے کو جُھلساتا تھا ۔

"می آؤں ۔۔۔ می آؤں" مور بھی بولا

"تم آج چُپ ہو جاؤ ۔۔۔ ہم تمہاری سُنتے آئے ہیں ۔ اب ہماری سُنو" پیپل کا ایک رُکھ مور پر جُھکا "تمہیں پتہ ہے وہ آیا ہے اور اُس کے سامنے کھڑا ہے ۔۔۔ بہت برسوں بعد آیا ہے"

مور نے حیرت سے اپنے چار چفیرے دیکھا اور رُکھوں کو چُپ پایا ۔۔۔ کیا یہی بولتے تھے یا کوئی اور تھا!

ماسا ایک رُکھ سے دوسرے رُکھ پر کودتا جاتا تھا اور کہتا تھا "کیوں ہے ۔ کدھر ہے ۔ وُہ اگر ہے تو کہاں ہے ۔۔۔ ہم اس لئے ہیں کہ ہمیں ہونا چاہیئے ۔ وہ اگر ہے تو یہیں ہے ۔۔۔"

شک کی باس رُکھوں میں پھیلی اور وہ بولنے لگے "وہ اگر ہے تو کہاں ہے؟ کہاں ہے؟"

اور اُن کے نیچے گھاس نے بھی شک کی باس سونگھی اور بولنے لگی "وہ اگر ہے ۔۔۔ کہاں

ہے ؟"

بھینسے کے سامنے وہ کھڑا تھا ۔۔۔ کیا یہی ہے جس کے پاؤں زمین پر ایسے پڑتے تھے جیسے ڈھول پر تھاپ پڑتی ہے ۔

چیتر کی چاندنی میں گھاگھرا ایک مان جانے والی عورت کی طرح اُس کے سامنے بچھا ہوا تھا اور لشکتا تھا ۔

دور ڈوبو مٹی سے پرے رُکھوں کے ذخیرے میں سے ایک عجیب آواز آتی تھی جیسے ڈھول پر تھاپ پڑتی ہو ۔ جیسے کچھ بولتا ہو جیسے بہت کچھ بولتا ہو ۔

کنک کے ہرے سٹے کو مسلنے سے دانہ نکلتا تھا تو وہ پاروشنی کا سوچتا تھا تو اُس میں سے دُکھ کا دانہ نکلتا تھا ۔۔۔ شائد یہ دانہ کچا تھا ، پکا نہ تھا اور اسی لئے وہ اُس رات پانیوں میں تیر نہ سکی اور اُس کے گلپھڑے کھلتے تھے اور بند ہوتے تھے پر سانس نہ لے سکتے تھے ۔۔۔ وہ سُوکھی رہی اور چلی گئی ۔

ورچن جانتا تھا کہ وہ سمرو کو جاتی ہے ۔

اُس نے اُس سمے جب چیتر کی چاندنی میں گھاگھرا ایک مان جانے والی عورت کی طرح اُس کے سامنے بچھا ہوا تھا اور لشکتا تھا پاروشنی کو اپنے آپ میں سے باہر کیا ۔۔۔ اُسے اپنے سے الگ کر کے رکھا اور خود پیچھے ہو کر بیٹھ گیا ۔۔۔ بس اتنا وقت تھا جو اُس کے لئے تھا ۔۔۔ سارے بندے ایک دوسرے کے لئے کچھ دن رات لے کے آتے ہیں بندھے بندھائے اور پکے پیڈے ۔۔۔ اور یہ دن رات گذر جائیں تو باقی پھوک رہ جاتا ہے ، دھروا کے جُتّے کی طرح جو گابن کرنے سے خالی ہو جاتا ہے ۔ تو آپس میں میل ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتے ۔۔۔ کچھ دن رات ہوتے ہیں اور وہ گذر گئے ۔۔۔ پاروشنی کے لئے جو دن رات تھے وہ گذر گئے ۔

پُورن کو اگر میں یہ بتاؤں کہ پاروشنی ایک بڑے پانی کی طرح آئی اور مُجھ سے دور بہتی ہوئی چلی گئی ۔۔۔ اور میں سوکھا رہا ۔۔۔ یا وہ سُوکھی رہی اور چلی گئی تو وہ کیا کہے ۔

ورچن کو موہنجو کی چھتیں ۔ نالیاں اور گلیاں یاد آئیں ۔

رُکھوں میں جیسے کوئی ڈھول پر تھاپ دیتا چلا جاتا تھا ۔

پاروشنی کا وہ کان جو اُس کے بازو پر رکھا تھا اور دبا ہوا تھا کچھ نہ سُنتا تھا پر دوسرے کان سے وہ دھمک دھیرے دھیرے اترتی تھی ۔

سمرو مُنہ پھیرے سوتا تھا پر وہ سنتی تھی ۔۔۔ رُکھوں میں اس سمے ہے کون ؟ ۔۔۔ مامن ماسا اور کون ۔۔۔ اور اُس نے یہ کیوں کہا تھا کہ اگر وہاں پانی نہ ہو اور گھاگھرا نہ ہو تو ۔۔۔ پانی کیوں نہ ہو اور گھاگھرا کیوں نہ ہو ۔۔۔ اور سمرو نہ ہو اور ورچن نہ ہو ۔۔۔ کیوں نہ ہو ۔۔۔ ورچن ، اُس کا سانس رُکا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ۔ سمرو نے کروٹ بدلی اور زور زور سے خراٹے لینے لگا ۔ پانی نہ ہو اور گھاگھرا نہ ہو ۔۔۔ مامن ماسا ذرا سر میں کچا رہ گیا ہے اس لئے یہ کہتا ہے اور اِسی لئے تو وہ رُکھوں میں ہے ۔۔۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا دیا ۔۔۔ چیتر کی چاندنی تھی پر اُس کا گلا سُوکھتا تھا اور پانی مانگتا تھا ۔ وہ چپکے سے اُٹھی اور پاؤں دیکھ دیکھ کر دھرتی کنوئیں کے قریب گئی وہاں اندھیرا تھا ۔ اُس نے منڈیر پر ہاتھ پھیرا تو اُس کا ہاتھ بوکے سے ٹکرایا اور وہ گم ہوا اور پھر چھپاک سے اُس کی آواز پانی کے اندر کنوئیں میں گرنے کی آئی ۔

"کیا ہے ؟" سمرو نیند میں بڑبڑایا ۔

"کچھ نہیں ۔۔۔" وہ اندر سے بولی "پانی کے لئے آئی ہوں"

اُس نے رسّی کو زور سے پکڑا اور بھرا ہوا بوکا اوپر کھینچنے لگی ۔

جیسے ڈھول پر تھاپ پڑے ایسے ادھر سے سفر کرتی ایک دھمک آتی تھی ۔ بوکا بھرا ہوا تھا ۔۔۔ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر منہ کو لگایا تو پانی وراچھوں سے بہنے لگا اور اُس نے بازو اوپر کر کے پورا بوکا اپنے آپ پر ڈال لیا اور گیلی ہوئی ۔۔۔ چیتر کی رات میں وہ تھوڑی سی کپکپائی اور پھر سمرو کے ساتھ آلیٹی ۔

"تم بھیگتی کیوں ہو ۔۔۔" سمرو نے اُسے ٹٹولا اور کہا اور اونگھ گیا ۔

سمرو مجھے دیکھ کر بتا ۔۔۔ وہ بیل بُوٹے جو پکلی نے میرے جُتّے پر ابلیکے تھے ویسے ہی ہیں یا پھیکے پڑ گئے ۔۔۔ اُس نے اگرچہ نام سمرو کا لیا پر کہا اپنے آپ سے آہستہ سے ، سرگوشی میں ۔۔۔ کہ وہ نہ سنے جس کا نام لیا تھا ۔

اُدھر رُکھوں میں دھمک تھی ۔

پاروشنی نے پھر کان لگا کر سنا کہ کون ہے ۔ اُنہی رُکھوں میں وہ دن تھے جب وہ گاگری اور وہ تینوں بھینسے کے پیچھے جاتے تھے اور چیختے تھے اور گاگری پیچھے رہ گئی تھی اور اب اُس کا پنجر وہیں گلتے سڑتے پتّوں میں بکھرتا تھا اور تب بھینسا اُس پر آیا تھا ۔۔۔ وہ کیسے آیا تھا اُسے یاد نہ تھا ۔۔۔ اُس نے کسی کو بتایا نہ تھا کہ ایسا ہوا تھا کیونکہ کوئی بھی مانتا نہ کہ ایسا ہوا تھا ۔۔۔ اور ایسا ہوا تھا ۔۔۔ پر اُس کی من مرضی سے نہیں زور آوری سے ۔۔۔ پر من مرضی سے نہ بھی ہو تو بھی

کہیں نہ کہیں مرضی کا ایک دانہ ہوتا ہے جو پکتا اور اُس میں سے رَس ٹپکتا ہے ۔۔۔ اور اُس روز ورچن آیا تھا ۔

ورچن ؟ ۔۔۔ اُس کا بیچ یوں دھڑکا جیسے دل دھڑکتا ہو ۔۔۔ اور گرم ہو کر گیلا ہوا ۔

"تو یہ کیا ہے ؟" پاروشنی نے سر جھٹکا ۔۔۔ کون کیا ہے ؟ ۔۔۔

ایک پاگل کُتّا بھونکا ۔ اُن کتّوں میں سے ایک جو کسی خرگوش کے پیچھے رُکھوں سے نکل کر ریت میں نکل گیا اور ہوش خراب کر بیٹھا ۔

وہ اُٹھی اور آنکھیں مل کر اپنے گھر سے باہر آئی ۔ باہر چیتر کی چاندنی میں بستی کی گلی چپ تھی اور ٹھہری ہوئی تھی ۔ دھمک ادھر کچھ اوپر ہو رہی تھی ۔

وہ جب بستی سے باہر ہوئی تو یکدم اپنے سائے سے ڈری کہ یہ کون ہے جو میرے ساتھ آتا ہے ۔ اور پھر اُس نے گھاگھرا کو دیکھا ، جو لیٹا ہوا تھا اور لشکتا تھا ۔

پانی نہ ہو ۔۔۔ گھاگھرا نہ ہو ۔۔۔

یہ تو میرے سامنے ہے ۔۔۔ یہاں سے وہاں تک جہاں تک میں دیکھوں ۔۔۔ بس یہی ہے اور کچھ نہیں ۔۔۔ اس کے پار کچھ نہیں اگر ہے تو مجھے چاہئیے نہیں ۔۔۔ سرکنڈے دریا کے روشن فرش پر جھکتے تھے ۔

"پاروشنی ۔۔۔"

وہ ٹھٹک گئی ۔

"کون ؟" وہ رکی ۔۔۔ کان لگا کر سُنا کہ وہم ہے یا سچ مچ کسی نے نام لیا ۔

"میں ادھر ہوں ۔۔۔"

اُدھر کنارے کے ساتھ وہ تھا ۔۔۔ سایہ تھا پر وہ جانتی تھی کہ وہ تھا ۔

گھاگھرا کا کنارا ریت تھا اور وہ ریت کچھ گرم ہوئی اور پھر ٹھنڈی ہو گئی ۔

ڈھول کی دھمک رکی اور چپ ہو گئی ۔

وہ دونوں اٹھے اور رُکھوں کی جانب بھاگنے لگے ۔

"وہ میل کو آیا تھا ۔۔۔" ماسا ایک رُکھ سے چھلانگ لگا کر دوسرے کی ٹہنی پر جا بیٹھا اور ہنسنے لگا ۔ ڈور گا وہیں تھا جہاں وہ کھڑا تھا پر اب وہ کھڑا نہ تھا اپنی رَت میں رنگا گلتے سڑتے پتّوں پر پڑا تھا ۔

"می آؤں ۔ می آؤں" مور بولا ۔

چیتر بیتا اور وساکھ چڑھا تو جہاں رُکھ اور بُوٹے بڑھے اور پھوٹے یوں ڈور گا کا ادھڑا ہوا جُثّہ بھی جُڑنے لگا ۔

وہ اب پاروشنی کے چھپّر سے نکل کر ایک ڈانگ ٹیکتا آپو آپ گھاگھرا تک چلا جاتا اور سارا دن وہاں بیٹھا رہتا ۔

بستی کے وسنیک کھیت کھود چکے تھے اور اُن میں موٹے باجرے کا بیج ڈال کر اُسے مٹّی سے ڈھک چکے تھے ۔۔۔ پر اب وہ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر بڑے پانی کے لئے دریا کو نہ دیکھتے تھے اوپر دیکھتے تھے آسمان کو کہ یہ کھیتی مینہ کی تھی ۔۔۔ اوپر سے بہہ کر آنے والے پانی کی نہیں پر اوپر سے گرنے والے پانی کی ۔۔۔ اور اس کے لئے وہ کھیتوں سے لوٹ کر اپنے چھپّروں کو پکّا کرنے لگے ۔ پکلی کے آوے کے آس پاس ٹیلوں پر بکھری ٹھیکریوں کو چُن کر اُنہیں گارے میں ملایا اور پھر یہ لیپ چھپّر کی چھت اور دیواروں پر کیا ۔۔۔ یہ بندوبست مینہ کے پانی کو اندر آنے سے روکتا تھا اور شروع سے چلا آتا تھا ۔ پانی کبھی اندر نہ آیا ۔

اُنہوں نے بندوبست تو کر لیا پر جس کے لئے کیا وہ نہ آیا ۔۔۔ کھیت کُھلے چھوڑے پانی کے لئے اور چھپّر لیپ پوچ لئے اُس سے بچاؤ کے لئے پر آسمان خالی رہا ۔

بستی والے اپنے چھپّروں میں پڑے سانس اندر کو کھینچ کر سنبھالتے تھے اور اس سنبھال میں وہ باس ڈھونڈتے تھے جو سُوکھی مٹّی میں بند ہوتی ہے اور پانی کی پہلی بوند اُسے کھول دیتی ہے اور اُڑا دیتی ہے اور وہ اڑتی ہے اور سانسوں میں آکر بتاتی ہے کہ میں آگئی ہوں اور اب : میں اندر رکھا موٹے باجرے کا بیج سُوکھے گا نہیں میں اُس تک دھیرے دھیرے پہنچ جاؤں گی اور وہ پھوٹے گا ۔ پاروشنی نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا جو دریا میں پانی کم ہونے سے اُس کے بیچ کسی ٹاپو کی طرح اُبھرتا جاتا تھا ۔۔۔ اُسے فکر نہ تھی ۔۔۔ اُس کے اندر بہت پانی تھے ، سینچنے کے لئے ، اُس بیج کو بوٹا بنانے کے لئے جو اُس کے اندر ٹھہر گیا تھا ۔۔۔ اور اُسے کہیں ماگھ پوہ میں آ

جانا تھا۔

وہ بھی اپنا چھپّر لیپ چکی تھی ۔۔۔ سمرو ورچن کے لائے ہوئے پتھروں اور دھاتوں سے مہریں اور منکے وغیرہ ڈھالتا رہتا اور ورچن زمین پر اسوا کی شکل اُلیک کر اُسے بتاتا کہ میں نے یہ جنور دیکھا ہے جس پر وہ آتے ہیں اور تُو اِسے مُہروں پر بنا تاکہ لوگ جان جائیں کہ وہ کس پر آتے ہیں ۔ پر سمرو کہتا ۔ اس جنور کی چال ڈھال میری مت سے بہت باہر ہے اور یہ مجھ سے نہیں بنتا، تُو رہنے دے ۔۔۔ اور پھر ڈورگا اُس سے کہتا کہ سمرو تو کسی مہر پر اُس بھینسے کا جثہ کھود جس نے میرے جُثّے کو کھود ڈالا ہے ۔ میں جاؤں گا اور پھر میل کروں گا ۔ اس پر سب ہنستے اور نڈھال ہوتے کیونکہ ڈورگا آدھا رہ گیا تھا اور ٹھوکر بس ٹُھڈّے کھا کر مُشکل سے چلتا تھا ۔ بھینسے کے سینگوں نے اُس کے پیٹ میں گُھس کر اندر آگے پیچھے کر دیا تھا اور اتنی رَت نکالی تھی کہ جب سمرو اُدھر گھر سے آیا اور ادھر سے ورچن اور پاروشنی بھاگے تو وہ رُکھوں میں جیسے اپنی رَت میں تیرتا تھا ۔

پاروشنی اب ورچن اور سمرو کے پاس آتی تھی اور جاتی تھی۔

وہ راتوں کو بہت جاگی اور اُس کی آنکھوں میں بے بسی کے بہت پانی آئے ۔ یُوں تو وہ کبھی نہ روئی تھی، کبھی کسی کے آگے بے بس نہ ہوئی پر ان دونوں بارے وہ کبھی ایک طرف نہ رہی اور تب وہ دونوں میں شانت ہوئی اور اُس نے ٹھہراؤ کیا کہ ایسا پہلے سے ہوتا آیا تھا کہ ایک عورت کے دو ہوں اور وہ دونوں میں رہے ۔۔۔ تو پاروشنی اب دونوں میں رہتی تھی اور وہ دونوں بھی اُس میں آتے تھے ۔

پاروشنی کے چھپّر تلے اُن دو کے سوا ڈورگا بھی تھا ۔

ڈورگا کون ہے ؟ وہ ورچن کے پیچھے پیچھے آیا تھا موہنجو سے ۔۔۔ اور جب سب نے پُوچھا کہ یہ کون ہے تو ورچن بولا تھا کہ یہیں کا باسی ہے، کہیں گیا ہوا تھا اور اب واپس آگیا ہے ۔ اس کے بعد وہ وہیں کا ہو گیا اور کبھی کسی نے نہ پُوچھا کہ تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے ۔ اُس کی بولی ذرا وکھری تھی پر وہ بولتا بہت کم تھا ۔۔۔ وہ کہتا تھا کہ میں جہاں تھا وہاں ہم نِرا جُھکتے تھے بولتے نہیں تھے اور یہ بات اچنبھے کی تھی کہ وہ جُھکا ہوا تھا جیسے تیز ہوا میں دریا کنارے کے سروٹ جھکتے ہیں ۔ جُھکتے ہیں پر لگتا ہے کہ سیدھے ہونا چاہتے ہیں اور ہو نہیں پاتے اور یوں ڈورگا بھی لگتا تھا ۔

جب وہ اپنی رَت میں تیرتا تھا اور وہ اُسے دیکھتے بھالتے رُکھوں میں پہنچے تھے تب اُسے وہ

دیکھا ہوا لگتا تھا ۔۔۔ وہ اوپرا نہیں تھا اپنا تھا پر کون تھا ۔۔۔ دیکھا ہوا تھا پر کہاں ۔۔۔ وہ رَت میں پڑا کراہتا تھا ۔ اور پاروشنی نے جُھک کر اپنا کان اُس کے زخمی ہونٹوں پر رکھا تھا تو وہ کہتا تھا کہ میں پھر آؤں گا ۔۔۔ اور ورچن نے پوچھا تھا کہ ڈورگا یہ تو کیسے کہتا ہے کہ میں پھر آؤں گا پر وہ بول نہ پایا اور آنکھیں موند لیں ۔۔۔ لیکن اُس وقت رُکھوں کے اندر کوئی موجودگی تھی جو خالی ہوئی تھی اور اُس کی باس ابھی وہاں ٹھہری ہوئی تھی اور صرف پاروشنی جانتی تھی کہ ڈورگا کو اِس حال میں کس نے کیا ۔ وہ اُس کے جُثّے کی بُو پہچانتی تھی، اچھی طرح جانتی تھی کہ اُس نے اُسے اتنے قریب سے جانا تھا کہ کوئی گمان نہیں کر سکتا تھا ۔۔۔ پھر اُس نے ورچن کو بتایا کہ وہ کون ہے جس نے ڈورگا کا یہ حال کیا اور تب ورچن نے پاروشنی کو دیکھا اور اُس دیکھنے میں کچھ تھا جو پاروشنی کو بے چین کرتا تھا جیسے ورچن جانتا ہو کہ وہاں جب وہ موہنجو سے لوٹتا تھا تو پاروشنی یہیں کہیں آس پاس گلتے سڑتے پتّوں پر پڑی ہوئی تھی تو تب ۔۔۔ وہاں بھی ایک موجودگی تھی جو خالی ہوئی تھی اور ایک باس ابھی ٹھہری ہوئی تھی اور وہ سارا کچھ اب بھی تھا ۔۔۔ وہ اُسے اپنے چھپّر میں اُٹھا لائے ۔

چیتر کے بعد وساکھ چڑھا تو ڈورگا کا اُدھڑا ہوا جُثّہ جُڑنے لگا ۔۔۔ بستی والے کھیت کھود چکے تھے ۔۔۔ اور اُوپر آسمان کو دیکھتے تھے ۔

یہ کئی بار ہوا کہ رات کے کسی پہر ڈورگا ہڑبڑا کر اُٹھا اور کہنے لگا ۔۔۔ سُنو ۔۔۔ سُنو اور اُن تینوں نے کان لگا کر چاروں اَور سُنا لیکن وہاں سُننے کو کچھ بھی نہ تھا ۔۔۔ پر ڈورگا کہتا کہ سُنو ۔۔۔ یہ بہت بار ہوا اور اُنہوں نے جان لیا کہ ڈورگا کے جُثّے میں اُس کے سینگوں سے زہر اُترا ہے جو اُس کے بھیجے میں رینگتا ہے اس لئے وہ کچھ سُنتا ہے پر وہاں کچھ ہے نہیں ۔۔۔

اُنہوں نے چھپری کی جھاڑی کو جلا کر اُس کی راکھ ڈورگا کے پَھٹ پر باندھی اور اُسے بھوکڑ کا ماس کھلایا ۔۔۔ گاگری کے بعد اب پکلی یہ کام کرتی تھی اور یُوں بھی وہ ڈورگا کو دیکھ کر نرم پڑتی تھی ۔ کبھی کبھار سویرے یُوں لگتا کہ روشنائی کم ہے اور اس لئے کم ہے کہ چڑھتے سُورج کے سامنے کچھ بدلیاں تھیں جو اُس کی کرنوں کو اپنے میں سموتی تھیں اور تب وہ اندر ہی اندر آس لگاتے کہ آج آسمان گہرا ہو گا اور ڈھک جائے گا اور شام تک اس میں سے پانی برسنے لگے گا ۔۔۔ پر ایسا نہ ہوتا ۔۔۔ سُورج آسمان کو اپنی تیزی سے خالی کر دیتا اور وہ خالی رہتا ۔

پاروشنی نے ایک شام اپنے کنویں میں بوکا پھینکا تو اُسے لگا کہ پانی تھوڑا سا نیچے ہے ۔۔۔ جیسے سمرو کو لگا تھا پر ایسا کہاں ہوتا ہے ۔ پانی تو وہیں پر ہو گا لیکن لگتا تھا کہ نہیں ہے ۔ پانی

ہمیشہ اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ وہ ہوتا ہے ۔

پاروشنی کا پیٹ اب زیادہ دکھائی دیتا تھا پر وہ سارے چھپروں کے گھڑے اور مٹ اب بھی سویرے سویرے بھرتی تھی ۔

ایک روز ڈورگا نے جانا کہ آلکس اُسے نکما کرنے کو ہے اور اُس کا جُسّہ ڈھیلا پڑتا ہے تو وہ اپنے تھڑے سے اُٹھا اور چھپر سے باہر گلی میں آگیا ۔ وہ جانتا تھا کہ سبھی اپنے چھپروں میں پڑے اونگھتے ہیں اور پانی برسنے کی آواز کو سننے کے لئے کان لگاتے ہیں ۔۔۔ سوائے اُن کے جو ہاتھ سے چیزیں بناتے تھے وہ اپنے کام میں مگن تھے ۔۔۔ سارے میں ایک چپ تھی پر اُدھر گھاگھرا کے اُوپر پانی کا کوئی پکھیرو ایسے چینختا تھا جیسے تیز ہوا سروٹوں میں سے گذرے تو وہ سیٹیاں بجاتے ہیں ۔

سمرو اُس آگ پر جھکا تھا جس میں اُس کی بنائی ہوئی مُہریں پک رہی تھیں اور اُس کا پسینہ جو گرتا تھا تو آگ شِی شِی بولتی تھی جیسے چُپ رہنے کو کہتی ہو ۔۔۔ اور جب اُس نے سانس لینے کو سر اُٹھایا تو ڈورگا جا رہا تھا ۔۔۔ سمرو پھر آگ پر جھکا اور اُن چوکور مُہروں کو دیکھنے لگا جو اُسی میں پکتی تھیں ۔ اِن مہروں کے سارے مہاندرے وہی تھے جو چلے آتے تھے ۔۔۔ ہمیشہ سے ۔۔۔ پر ایک مہر پر اُس نے اسوا بنا لیا تھا ۔۔۔ اب جو اُس پر بیٹھ کر آئے تھے اُنہیں آئے ہوئے برس ہا برس ہو چکے تھے اور اب سنتے تھے کہ وہ ایک بار پھر اپنے اس جنور پر بیٹھ کر نیچے کسی اور طرف جاتے تھے جہاں پر سبزہ بہت تھا اور پانی بہت تھا ۔۔۔ ادھر یہ دونوں کم ہو رہے تھے ۔

ڈورگا، لنگ کے ٹیلے کے پاس ہوا تو اُس کے دل میں وہی خوف آیا جو کبھی موہنجو میں آتا تھا پر اتنا نہیں کچھ تھوڑا ۔۔۔ اور یہ خوف بھی آیا اور چلا گیا ۔۔۔ وہ چلتا رہا اور پھر اُس کے ایک بازو کی طرف وہ اونچا ڈھیر تھا جس کے کنارے سروٹ چپ کھڑے تھے اور اُن سے پرے نیچے گھاگھرا بہتا تھا اور دوسرے بازو پر ایک خشک میدان تھا جو دور تک جاتا تھا اور دُوری میں کہیں پکلی کے آوے کا دھواں اُٹھتا تھا ۔۔۔ آوے سے پرے کھیت تھے جن کی مٹی میں باجرے کے دانے پڑے سوکھتے تھے پر پھوٹتے نہ تھے اور اُن سے پرے ڈوبو مٹی اور اُس کے ساتھ رُکھوں کا ذخیرہ ۔۔۔ اور وہاں ۔۔۔ وہاں ۔۔۔ ڈورگا کان لگانے کے لئے رُکا اور سُنا ۔۔۔ وہ کچھ نہیں کہہ رہا تھا ، خاموشی تھی ۔۔۔ اُس نے اپنے جُسّے پر ہاتھ پھیرا تو وہ جُڑ چکا تھا اور دبانے سے بھی اُس میں سے ٹیس نہیں اُٹھتی تھی ۔۔۔ پکلی کے آوے کا دھواں آسمان میں

بہت دور تک سیدھا اُٹھتا جاتا تھا ، اُسے بکھیرنے کو ہوا نہ تھی ۔۔۔ وہ گھاگھرا سے ہٹ کر اُدھر کو ہو گیا ۔

اُدھر پنڈو اور شکرا آوے کی آگ میں لکڑی جھونکتے تھے ۔ گیرو اندر چھپر میں سوتا تھا اور پکلی چاک میں بیٹھی اپنی ٹانگوں سے اُسے قابو میں رکھے پاؤں میں گھماتی تھی اور چاک پر گھومتی ایک جھجھر اُس کی اُنگلیوں کے دباؤ سے کہیں سے پھیلتی تھی اور کہیں سے سکڑتی تھی ۔۔۔ جھجھر کی گردن کو لمبا کرنے کے لئے وہ اُسے زیادہ دیر تک اُنگلیوں میں دبوچے رہتی ۔۔۔ گردن لمبی ہوتی جاتی پر مٹّی میں زیادہ لچک نہ تھی اور وہ ٹوٹ کر اُس کے ہاتھوں میں آ جاتی ۔۔۔ اور تب وہ اُس کی مٹّی کو پھینک کر دوبارہ چاک گھمانے لگتی ۔ ڈورگا اُسے بہت دیر کام میں جُتے ہوئے دیکھتا رہا پر اُس نے اوپر نہ دیکھا ۔ پنڈو اور شکرا دیکھ چکے تھے کہ کوئی ادھر گھاگھرا کی طرف سے آیا ہے اور اُن کی ماتی کو دیکھتا ہے ۔

وہ پکلی کے لئے نہیں آیا تھا ۔۔۔ وہاں گھاگھرا کے پاس اُس کی ناک نے اُسے بتایا تھا کہ ادھر گیلی مٹّی ہے اور اُس کی باس نے اُسے بتایا تھا کہ یہ وہی ہے جو موہنجو میں تھی ۔۔۔ اور وہ اُس باس کے پیچھے ادھر کو آیا تھا اور اب پکلی کو دیکھ رہا تھا ۔۔۔ وہ مٹّی اُسے پاس بلاتی تھی ۔۔۔ وہ اس مٹّی میں تو پیدا ہوا تھا ۔۔۔ یہ اس کے ساتھ جھجھریں بناتی تھی اور وہ اس کے ساتھ اینٹیں بنا لیتا تھا ۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اُسے مٹّی بھلی نہ لگتی پر ایسا نہ ہوا ۔ اِس مٹّی نے اُسے بے شک چاکر بنائے رکھا ، جنور کر دیا پر وہ اس پر تھوک نہ سکا ہمیشہ اس کی طرف آیا ۔۔۔ اب اس میں مٹّی کا کیا دوش تھا؟ ۔۔۔ چاہو تو کسی کو جُھکا کر اور اُسے مار کر اس سے اینٹ بنوا لو اور چاہو تو ایسی جھجھری خود بنا لو جو پکلی کی ہتھیلیوں کی گولائی میں گھومتی تھی اور وہ اپنی ہتھیلیاں ایسے رکھتی تھی جیسے اُن کے بیچ آگ جل رہی ہو اور وہ اُسے تاپتی ہو ۔ اُس نے ڈورگا کو دیکھا تو چاک روک دیا ۔ پنڈو اور شکرا پہلے ہی اُسے دیکھ رہے تھے اُنہوں نے چاک رکتے دیکھا تو اُٹھے اور ڈورگا کے پاس آ کر اُسے دیکھنے لگے اور ہنسنے لگے ۔

”آوے کو تمہارا باوا گرم کرے گا ۔۔۔“ پکلی نے زمین پر تھوک کر مٹّی کے اُس تھوبے کو اٹھایا جو جھجھر کی گردن لمبی کرنے کے جتن میں پھر ٹوٹا تھا اور اُسے بچّوں کی طرف پھینکا ”چلو بھاگو“ ۔ ڈورگا آگے ہوا اور بچّوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا ”انہیں آوے سے دُور رکھا کرو ۔“

”اچھا؟“ وہ مسکرائی ، ڈورگا تو جانتا نہ تھا پر پکلی کا ایک اور دانت کم ہو چکا تھا اور اب وہ مسکراتی ہوئی بھلی نہ لگتی تھی گیرو ادھر پڑا رہتا ہے تو سارے کام میں نہیں سنبھال

سکتی ۔۔۔ آوا کون گرم کرے گا ۔۔۔ میں ادھر برتن بھانڈے بنا لیتی ہوں اور یہ آوا تیار کر لیتے ہیں ۔۔۔ چلو جاؤ" اُس نے گیلی مٹی کا ایک اور تھوبہ اُن کی طرف پھینکا پر وہ ڈورگا کو جا لگا ۔۔۔ مٹی ڈورگا کے جُثے کو لگی تو وہ کانپا ۔۔۔ وہ اسی مٹی میں پیدا ہوا تھا ۔۔۔ تھوبہ اُس کے پیٹ پر لگا رہا پھر ڈھیلا ہو کر گر پڑا ۔۔۔ ڈورگا نے اُسے اٹھا کر سونگھا ! ہاں یہی تھی جو موہنجو میں تھی ۔۔۔ وہ پکلی سے پرے ہو کر آوے کے پاس گیا ۔ آگ ابھی دھوئیں میں تھی ۔ وہ بیٹھ گیا اور سوکھی ٹہنیاں توڑ توڑ کر آوے میں ڈالنے لگا ۔ اندر برتنوں کی پال لگ چکی تھی ۔ اس میں تو گرمی ہی نہیں تھی بلکہ ٹھنڈک تھی ۔ وہ تو ہزاروں برس تک اس آوے کے سامنے جھلسا تھا اور پگھلا تھا اور اتنا پگھلا تھا کہ اُس کا مہاندرہ بدل گیا تھا ۔۔۔ پر اب فرق تھا ۔ جب مٹی لادی جائے تو فرق ہوتا ہے اور جب مٹی خود اٹھائی جائے تو فرق ہوتا ہے اور جب آوے کے اندر جھونک دیا جائے ساری حیاتی کے لئے تو وہ کچھ اور ہوتا ہے اور جب بندہ اپنی من مرضی سے اُس کے سامنے بیٹھ جائے تو وہ کچھ اور ہوتا ہے ۔

ڈورگا اپنی من مرضی سے آوے کے سامنے بیٹھا تھا ۔

اُنہوں نے کھیت کُھلے چھوڑے پانی کے لئے اور چھپر لیپ پوچ لئے اُس سے بچاؤ کے لئے ۔۔۔ پر آسمان خالی رہا ۔

آسمان خالی تھا تو اُس میں سے گرتا کیا اور اگر سُوکھی مٹی میں دبے باجرے اور تِل پر کچھ گرے نہ اُسے گیلا نہ کرے تو وہ پھوٹے کیا ۔۔۔ ماتی کے وانگو ، چندرو جھوریا سُوکھے کھیت میں لیٹے رہتے اور آسمان کو تکتے رہتے جیسے اُن کے تکنے سے وہاں گھِر ہو گی اور بادل بنیں گے ۔ اُدھر دُھروا کی داڑھی کے بالوں کا گُچھا ہوا سے اُڑتا تو وہ اُسے اپنی ٹھوڑی کے ساتھ پہلے کی طرح چپکانے کی کوشش بالکل نہ کرتا بلکہ گم سُم بیٹھا رہتا ۔ وہ اب سوتے میں یم کتوں کو دیکھنا بھی بھول گیا تھا ۔۔۔ پہلے کی طرح بستی والے چارے کے گٹھے دیوار کے ساتھ جوڑ جاتے اور وہ اُنہیں ایک ایک کر کے اٹھاتا اور اندر باڑے میں لے جاتا جہاں زیبو بیل اپنی مست آنکھیں جھپکا جھپکا کر اپنی خوشی یا اداسی کا اظہار کرتے ۔۔۔ پر اب دُھروا بڑبڑاتا رہتا ۔ اُسے بھی پانی نہ برسنے کا دکھ تھا ۔ یہ تو نہیں کہ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا ۔۔۔ ایک دوبار ایسا ہوا تھا کہ بستی کے لوگ کدال اور کسّی چلا چلا کر تھک گئے اور پھر مینہ نہ برسا پر اب کی بار دُھروا کے اندر کچھ بولتا تھا اور کہتا تھا کہ دُھروا یہ تیرے لئے ہو رہا ہے ۔ آسمان خالی ہے تو یوں کہ تو جان لے کہ اب تُو جائے گا اور اسی لیے یم کُتّے تو خواب میں نہیں دیکھتا ! سچ مچ جو دیکھے گا ۔ دُھروا دریا پار جانے سے نہیں ڈرتا تھا ۔ اُس نے بڑا کچھ دیکھ لیا تھا! کر لیا تھا اور اب تو وہ گھاس پھونس اور سروٹ ہو گیا تھا ، کسی نہ کام کا نہ کاج کا ، چارے کے اُس گٹھے جیسا جس پر بیل منہ چلانے کو تھا ۔

پاروشنی کے اندر تو ہِل جُل تھی ، دریا کے بیچ ٹیلا اونچا ہوتا جاتا تھا ۔۔۔ جب سے اُس نے آنکھ کھولی تھی اور آس پاس دیکھا تھا تب سے تو ایسا نہیں ہوا تھا کہ باجرے کی فصل کے لئے مینہ نہ اُترے ۔۔۔ وہ چھپر تلے سیدھی لیٹی رہتی اور اُس کے کان باہر گلی کی چُپ دھول پر لگے رہتے کہ ابھی اس پر کوئی آواز گم ہو گی ۔ ایک ۔۔۔ دو تین اور پھر بے اَنت ٹِپ ٹِپ ۔۔۔ پر ایسا ہونے سے پہلے تو پورب کی ہوا ٹھنڈی ہوتی تھی اور چھپر تلے لیٹے بھی پتہ چل جاتا تھا کہ اب دھیرے دھیرے روشنائی کم ہو گی اور ٹھنڈک والا اندھیرا گہرا ہو گا اور پھر پسینہ آئے گا ، گُما ہو گا

رُکھوں کے اندر والا ۔۔۔ اور پھر ٹپ پہلی اور دوسری اور بے انت ۔۔۔ پر اس بار پتہ نہیں کیا ہوا ۔۔۔ اور اُس کے اندر کس کی ہِل جُل تھی ۔۔۔ کون ٹھہرا تھا اُس کے اندر ۔۔۔ ورچن یا سمرو ؟ وہ نہیں جانتی تھی اور نہ اُسے پروا تھی ہاں بعد میں مہاندرہ دیکھ کر ٹیوا لگ سکتا تھا کہ ناک یوں ہے تو ورچن ہوگا اور آنکھیں ایسی ہیں تو سمرو جیسی ہیں ۔۔۔ پر ابھی تک ہاڑ جاتا تھا اور اس نے پوہ ماگھ تک اپنا آپ بنانا تھا اور پھر باہر آنا تھا ۔

ڈورگا اب اُدھر ہی تھا ، پکلی کے چھپر تلے ۔۔۔ گیرو نے پہلے پہل اُس سے بات نہ کی پر پھر اُس نے دیکھا کہ جو کام اُس کے کرنے کا تھا وہ کر دیتا ہے ، موہنجو سے آیا ہوا کاما جو تھوڑا جُھکا ہوا تھا پر جنور کی طرح آوے میں لکڑی جھونکتا تھا ، مٹی گوندھتا تھا ، چھپّر کو لیپتا پوچتا تھا ۔۔۔ بس یہ تھا کہ وہ لکڑی لینے کو رُکھوں کے اندر نہیں جاتا ۔ ادھر کان لگاتے کچھ سنتا تھا پر ادھر جاتا نہیں تھا ۔

ڈورگا بھی اوپر دیکھتا ! وہ یوں تو اُن میں سے نہیں تھا پر ہوتا جاتا تھا ۔ وہ جب اوپر دیکھتے تو وہ بھی دیکھتا ، جو دُکھ اُن کو ہوتا وہ اسے بھی ہوتا ۔۔۔ پہلے صرف ورچن تھا جو نہ ہوتا تو ڈورگا یہاں نہ ہوتا ۔ اُدھر کہیں مر کھپ گیا ہوتا یا جنوروں اور بھوک سے اتنا ستایا جاتا کہ بھٹّے کی چاردیواری کو واپس ہو جاتا ۔ اب یہ کہ بستی کے سارے وسنیک اُسے ورچن ایسے لگنے لگے تھے ۔۔۔ وہ اَنگ ساک جو عام لوگوں کے تو ہوتے ہیں پر جنوروں اور کاموں کے نہیں ہوتے وہ اب اُس کے بھی ہونے لگے تھے ۔ تو وہ بھی اوپر دیکھتا تھا اور آسمان خالی دیکھ کر اُس کے اندر ہُوک اٹھتی تھی کہ یہ کیوں خالی ہے ۔

پکلی کے دانت کم ہو رہے تھے پر اُس کے ہونٹ اُس کے قابو میں نہیں آتے تھے ۔ وہ مسکراتی تھی کہ آخر کو اُسے بھی ایک ایسا مرد ملا جو اُسے دن کو بھی اور رات کو بھی سکھی رکھتا تھا ۔ آسمان خالی رہنے کا سب سے تھوڑا دکھ پکلی کو تھا ، اُس کے برتن بھانڈے جو سوکھتے تھے ۔ می آؤں ۔ می آؤں کرتا مور اب اتنی اونچی آواز میں بولتا جیسے وہ رُکھوں کو چھوڑ کر بستی میں آ نکلا ہے ۔

ورچن ایک بار پھر بستی چھوڑنا چاہتا تھا ۔۔۔ ہم کوئی رُکھ ہیں کہ ایک جگہ پر جمے رہیں ، کچّھو ہیں کہ دریا میں سے رینگ کر کنارے کے سروٹوں میں اور پھر واپس دریا میں ۔۔۔ اور وہ ہری یوپیا کو جانا چاہتا تھا ۔ پچھلی بار ایسا ہوا کہ ادھر ایک اتنا بڑا پانی آگیا کہ سارا ہری یوپیا کئی روز تک اُس میں ڈوبا رہا اور جب پانی اُترے تو وہاں کے باسی گلیوں سے کیچڑ اٹھانے میں جُت گئے ۔

جن کے کچّے گھر تھے وہ تو سارے کے سارے بہہ گئے پر ہری یوپیا کے زیادہ لوگ پکّی اینٹوں میں رہتے تھے اس لئے اُن کا بچاؤ ہو گیا ۔ سوائے اس کے کہ پانی اُن کے اندروں میں آیا اور ریت اور مٹّی چھوڑ گیا ۔۔۔ بس یہی وہ دن تھے جب ورچن ادھر گیا تھا اور پھر بڑے پانی کی دَس پا کر چالیس کوس پرے سے ہی موہنجو کو چلا گیا ۔ وہ موہنجو کے پاس چنو ڈورو بھی جانا چاہتا تھا ۔۔۔ پر ابھی نہیں ۔۔۔ ابھی وہ اُسے دیکھنا چاہتا تھا جو پاروشنی میں تھا ۔۔۔ اور دیکھنا چاہتا تھا اُس کی ناک اُس جیسی ہے یا سمرو ایسی ۔۔۔ اُس نے پکلی کو کہہ رکھا تھا کہ تو اُس کے لئے بندر اور بیل گڈّ بنا اور پکا کہ وہ آنے کو ہے ۔

اور ۔۔۔ سمرو بھی یہی دیکھنا چاہتا تھا ۔

رُکھوں کے اندر جو پتّوں بُوٹوں کی نمی تھی وہ بھی سوکھ گئی تھی اور ماسا زبان باہر نکالے ہانپتا تھا ۔ لِنگ چڑھاووں میں دبا رہتا ۔۔۔ لوگ بھکشو سے کہتے تو پانی کی زبان جانتا ہے اُس سے بات کر سکتا ہے تو بات کر ۔

چیوا کے اندر پہلے شک ہی شک تھا اور پھر وہ اُکّا خالی ہو گیا ۔۔۔ وہ پہلے ہی بستی سے باہر اپنے چھپر میں تھا اور الگ تھلگ تھا پر اب اُسے کوئی نہ دیکھتا ۔ اُس کی بھیڑ بکریوں کو شائد اُس کے ساتھ کوئی اُنس تھا جو اسے چھوڑ کر نہیں گئیں ۔ اس کے چھپر کے آس پاس ہی رہتیں ۔ پر وہ ان سے بھی الگ ہو گیا تھا ۔۔۔ جس روز ورچن موہنجو سے لوٹا تھا بس اُسی روز سویرے گاگری اُس کے پاس آئی تھی ۔ اُسی روز ۔۔۔ "دیکھ چیوا ۔۔۔" وہ بولی تھی "وہاں بستی سے پرے جہاں مٹّی کے قبرستان زمین میں ہیں اور اُن میں وہ ہیں جو ہمارا اَنگ ساک تھے وہاں ایک پتھر ہے جو میرا اَنگ تھا اور تم میں سے تھا ۔۔۔"

اور چیوا نے کہا تھا "تو آج تک تو بولی نہیں ۔ مجھے پتہ تھا کہ تم ادھر جاتی ہو اور اُس پتھر کو اپنے نیروں سے گیلا کرتی ہو پر تم نے آج تک اپنے منہ سے کوئی بات نہیں کی تو اب کیا ہوا ہے ۔۔۔"

"پتہ نہیں ۔۔۔" وہ بولی تھی "اب کیا ہوا ہے ۔ پر میں آج پاروشنی اور ماتی کے تینوں کے ساتھ رُکھوں میں جا رہی ہوں بھینسے کے پیچھے ۔۔۔ اور آج مجھے وہ یاد آتا ہے"

شام کو ورچن برسوں بعد بستی میں لوٹا تو وہ گاگری کو اٹھائے ہوئے تھا ۔ اور پھر اُس پتھر کے ساتھ میں اُس کا مرتبان بھی دبا دیا گیا تھا ۔۔۔ اب وہ دونوں وہاں تھے اور چیوا یہاں ۔۔۔ چیوا نے گاگری بارے کبھی اتنا نہ سوچا تھا کہ وہ بھار بن جائے ۔ وہ آتی تھی اور اپنے

آپ کو شانت کروا کے چلی جاتی تھی ۔ بس اُن کا اتنا ہی میل تھا ۔۔۔ میل تو بس اتنا ہی تھا پر اُس کے چلے جانے سے چیوا گُم ہو گیا تھا ۔۔۔ وہ چھپّر سے اگر باہر آتا تو اُس کے ساتھ ٹیک لگا کر ڈوبو مٹّی کے ساتھ پھیلے ہوئے رُکھوں کو دیکھتا رہتا ۔۔۔ اور اِن رُکھوں میں ماسا تھا ۔

اور ایک روز وہ بھی رُکھوں میں چلا گیا ۔

"مامن ماسا ۔۔۔" اُس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر یہاں وہاں ۔۔۔ ہر جگہ ۔۔۔ کھڑے ہو کر ۔۔۔ بیٹھ کر ۔۔۔ جُھک کر اُسے پکارا اور آخر کار ماسا ایک رُکھ پر سے اُس کے اوپر آگرا اور اُس کی گردن کا منکا ٹوٹتے ٹوٹتے بچا ۔

"اب تم یہاں بھی آجاتے ہو ۔۔۔ یہاں بھی آجاتے ہو" ماسا دانت نکوس کو بولا "میں اُدھر آتا ہوں ؟ نہیں تو تم کیوں آجاتے ہو ؟"

ماسا کے تن پر کوئی لیڑا نہ تھا ۔ اُس کی سیاہ چمڑی اب جُھریوں کی پیاسی اور سُوکھی زمین تھی ، کٹی پھٹی اور گھاؤ والی ، دانت ہونٹوں کے قابو میں نہ رہے تھے اور اُس کی کھوپڑی کا ماس ڈھیلا پڑ گیا تھا ۔

"تمہیں پتہ ہے مامن کہ میرے سر میں رَت یوں دوڑتی تھی کہ کسی کے سر میں کیا دوڑے گی ۔ میں اپنے چھپّر تلے الگ تھلگ اور شانت تھا اور میرے سر میں میری اپنی بستی تھی جس میں مَیں رہتا تھا ۔۔۔ تو مامن پھر مجھے کچھ ہوا" ۔

"مجھے پتہ ہے ۔۔۔" مامن ہی ہی کر کے ایک بڑی ہنسی ہنسا "مجھے پتہ ہے"

"تمہیں پتہ ہے کہ کیا ہوا ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ میں نے اوپر سے رُکھوں میں بیٹھے ہوئے اُنہیں دیکھا تھا ۔ اُن پانچوں کو جو اُس کے پیچھے جاتے تھے ۔ تمہیں پتہ ہے ناں کس کے پیچھے جاتے تھے ۔۔۔ جس کے میل کو ڈور گا آیا تھا پر رَت میں بھیگ کر چلا گیا ۔ اُسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ وہ نانکو ہے ۔ ہمارا پالن ہار ہے ۔ اور وہ پانچوں اُس کے پیچھے بھاگتے تھے ۔۔۔" ماسا یکدم چپ ہوا اور اتنے زور زور سے سر کھجانے لگا کہ اُس کی سیاہ کھوپڑی میں سُرخ جھریٹیں پڑ گئیں ۔

"نہیں کرو مامن ۔۔۔" چیوا نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا

"اچھا ؟" ماسا رُک گیا "نہیں کرتا ۔ تم کہتے ہو تو نہیں کرتا ۔۔۔ پر سواد آتا ہے اس طرح کھجلی کرنے سے ۔۔۔"

"تو پھر کیا ہوا مامن ؟"

"کس کو ؟" ماسا آنکھیں میچے اُس سُورج کو دیکھتا تھا جو رُکھوں کے بیچ لشکتا تھا ۔

"گاگری کو ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ وہ گیلے سڑتے پتّوں پر اوندھی پڑی تھی اور سوچتی تھی کہ شائد مجھے کوئی دیکھے یا نہ دیکھے ۔ میرے پیچھے وہ آتے ہیں ۔ میں راستے میں ہوں اور وہ دیکھ لیں گے پر اُنہوں نے نہ دیکھا اور وہ پاس سے چلے گئے ۔ اُس کی گردن سے پیٹھ کو ملانے والے منکے ٹوٹ گئے تھے اور وہ بس سوچ سکتی تھی پر وہاں سے ہِل نہیں سکتی تھی اور پھر اُس کی کنڈ پر ایک مکوڑا چلتا تھا ۔۔۔ میں نے دیکھا تھا"

"تو پھر تم نے اُسے اٹھایا کیوں نہیں مامن ؟"

"میں کیوں اٹھاتا ۔ کیوں اٹھاتا ۔۔۔" ماسا نے اپنی انگلیاں سیدھی کیں ، اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلیاں جن کے ساتھ ناخن لٹکتے تھے سیدھی کیں اور چیوا کی آنکھوں میں چبھو دیں اور پھر چیختا ہوا املی کے ایک گنجے رُکھ پر جا بیٹھا اور ہنسنے لگا ۔ چیوا نے درد کے زور سے آنکھوں کو بند رکھا اور اُن میں سے پانی بہتا رہا اور اُسے کچھ سجھائی نہ دیا ! صرف ماسا کی ہنسی سنائی دیتی رہی ۔ جب پانی اور درد کی لالی اُس کی آنکھوں سے دُور ہوئی تو اُس نے اوپر دیکھا جہاں ماسا اب بھی ہولے ہولے اپنے آپ کے ساتھ خاموشی سے ہنس رہا تھا ۔

"مامن ماسا ۔۔۔"

"چُپ ۔۔۔" ماسا نے اُسے ڈانٹا "چپ ۔۔۔ وہ کیوں آئی تھی رُکھوں میں ؟ میں اُسے کیوں اٹھاتا ۔۔۔ میں وہاں نہیں جاتا تو تم کیوں آجاتے ہو ۔۔۔ سُن چیوا ۔۔۔" ماسا کا مہاندرہ بولا "پاروشنی کہتی تھی کہ تو یہاں کیوں ہے اور میں نے پوچھا تھا تو وہاں کیوں ہے تو بولی وہاں گھاگھرا ہے ، پانی ہے تو میں نے کہا تھا کہ اگر گھاگھرا نہ ہو ، پانی نہ ہو تو ۔۔۔ میں اسی لئے اِدھر آگیا ہوں ۔ اور جو آگیا وہ آگیا ۔۔۔" ماسا نے اپنی ٹیڑھی ٹانگوں کو پچکے پیٹ میں بھینچا اور ایک چھلانگ لگا کر دُوسرے رُکھ پر جا بیٹھا اور پھر وہاں سے تیسرے پر چلا گیا ۔ اُس نے وہاں سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو چیوا وہاں کھڑا تھا "جاتے کیوں نہیں ۔۔۔؟"

"میں بھی اِدھر آگیا ہوں ۔۔۔" چیوا بولا ۔

"کدھر ؟" ماسا نے حیرت سے آنکھیں گھمائیں "کدھر کدھر ۔۔۔"

"یہاں رُکھوں میں ۔ اب میں بھی واپس نہیں جاؤں گا" ۔

ماسا فوراً چپ ہو گیا ۔ اُس نے کان لگا کر اُن ساری آوازوں کو سنا جو رُکھوں میں تھیں ۔

پکھیرڈوں کی اور پتّوں بُوٹوں کی اور اُن کی جو کبھی اِن رُکھوں میں سے گذرے تھے ۔۔۔ اور اُس کی جو کسی اندھیرے جُھنڈ میں بیٹھا تھا اور اُس کی آنکھیں لشکتی تھیں اور اُس کا سیاہ جُسّہ اُس اندھیرے میں لَو دیتا تھا اور سارے میں اُس کی باس تھی جو بتاتی تھی کہ وہ وہاں ہے ۔۔۔ ماسا کان لگا کر سنتا رہا اور پھر دھیرے دھیرے نرم پاؤں سے رُکھ کے گنجے تنے پر چلتا ہوا نیچے اُترا اور چیوا کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ۔ اُسی کی مہین بجھتی آنکھوں میں پانی تیرتا تھا اور وہ پانی اُس کی ہڑبوں میں گرتا تھا "جو آگیا وہ آگیا" اُس نے کہا اور چیوا کا ہاتھ پکڑ لیا ۔

اُن دونوں سے پرے اُن دونوں کو نہ جانتے ہوئے اُدھر سے ورچن بھی گذرا ۔ وہ رُکھوں کے اندر اُس جگہ جاتا تھا جہاں پر اُس کے مائی باپ بوڑھے ہو کر مرنے کو آئے تھے اور وہ دونوں ایک کھوکھلے تنے میں گھس کر بیٹھ گئے تھے اور مر گئے تھے ۔ اور وہاں اب بھی اُن دونوں کے پنجر پڑے ہوئے تھے ۔ بستی میں کوئی نہ جانتا تھا ، رُکھوں میں صرف ماسا جانتا تھا اور ورچن چوری چھپ کر کبھی کبھی جب وہ دکھ میں ہوتا تو مائی کے پنجر کو اٹھا کر اُس کے ساتھ لپٹتا اور اُس کے دکھ کم ہوتے ۔

"جو آگیا وہ آگیا ۔۔۔" ماسا نے چیوا کا ہاتھ پکڑ لیا ۔

ساون بھادوں کا گُما اُس کا پنڈا گھلاتا تھا اور وہ اپنا موٹا ہونٹ دانتوں تلے داب ے زمین میں کنک کے دانے رکھتی تھی اور ہتھیلی سے مٹّی سمیٹتی انہیں ڈھکتی تھی ۔ کھودی ہوئی مٹّی پر ورچن کا پسینہ گُم ہو چکا تھا پر وہ اُس پر گرا تھا اور وہ ایک کسّی کے ساتھ زمین کو کھودتا جاتا تھا ۔ اُس سے پرے پاروشنی کنک کا تھیلا کاندھے سے لٹکائے زمین پر بیٹھی کسی موٹی بھوکڑی کی طرح ہل ہل کر آگے ہوتی تھی اور کھودی ہوئی زمین میں کنک کے دانے گراتی جاتی تھی ۔

وہ بہت دنوں سے جھیل کی طرف بھی نہیں گئے تھے اور جھیل سوکھتی تھی اور ہر دن اُسے کے چار چفیرے ایک سفید دائرہ بنتا تھا ، جہاں کل پانی تھے وہاں سے اترے تو اب وہاں ایک دائرہ تھا کہ پانی یہاں ہوتے تھے ۔ وہ بہت دنوں سے ادھر نہیں گئی تھی ۔ اُدھر جہاں پرندے مرنے کو آجاتے تھے ۔۔۔ اُن کی ہڈیوں کا وہ ڈھیر اب اور اونچا ہو گیا ہو گا ۔۔۔ پاروشنی بیج رکھتے ہوئے سوچ رہی تھی ۔

ورچن نے اُسے مگن دیکھا ۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا ۔ اُسے جاننے کی لگن تھی کہ اُس کے اندر کس کا ناک نقشہ بنا ہے جو باہر آئے گا پر وہ چُپ چاپ زمین کھودتا رہا ۔

آسمان ابھی خالی تھا پر اس نے اب تو بھرنا تھا اور بھرنا تھا پورے کا پورا ۔۔۔ وساکھ میں تو سارا سوکھا رہا پر ہاڑ میں کچھ مینہ آیا تھا پر ذرا چھدرا اور ہولا ۔۔۔ اور اب ہر برس کی طرح وہ سب اپنی زمینیں کھودتے تھے ، ان میں بیج رکھتے تھے اور کھیتوں کے گرد پچھلے برس کی کچّی منڈیروں کو لیپتے تھے تاکہ جب بڑے پانی آئیں تو آکر نکل نہ جائیں بلکہ کھیت کے اندر کچھ دن ٹھہریں اور مٹّی میں جذب ہو جائیں ۔۔۔ وساکھ کے سوکھے کی بنا پر اس بار اناج کم پڑتا تھا ۔۔۔ یوں تو دریا میں بھی مچھلی کا اناج تھا پر سارا وقت ماس کون کھاتا ہے ۔ پاروشنی پسینے میں تھی اور گرمی سے ہونک رہی تھی اور اُس کا حال اچھا نہ تھا ۔۔۔ وہ ڈھیلی اور سُست پڑتی جاتی تھی ۔

"تجھے اب کام کاج چھوڑ دینا چاہیئے ۔۔۔" ورچن جیسے زمین سے کہتا تھا ۔

"مجھے ؟ ---" پاروشنی بہانہ پا کر رُکی اور سانس ٹھیک کرنے لگی "کیوں اتنی جلدی کیوں --- ابھی تو مکھر پوہ تک کچھ ہو گا --- تین چار ماہ بیچ میں ہیں ---"

پر تجھے دیکھ کر تو لگتا ہے کہ ---" ورچن کے بول میں وہ نرمی تھی جو بیج ڈالنے والے میں تب آتی ہے جب اُسے آس ہو کہ اُس کا بوٹا ہرا ہو گا۔

نہیں ---" دریا میں اُبھرے ٹاپو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پاروشنی بولی "نہیں مکھر پوہ تک ---"

"ورچن ---" تھوڑی دیر میں وہ پھر بولی۔

ورچن بھی تھک رہا تھا وہ بھی رُک گیا "ہاں ---"

"ہم یہ کام کاج کیوں کرتے ہیں اور میرے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ کیوں ہے اور کیسے ہے اور یہ سب کچھ کیسے آگے آگے چلتا ہے۔ تمہارے مائی باپ اور تم اور پھر تمہارا آگے ---"

"مجھ سے ہے --- ؟"

"ابھی کیا پتہ ---" وہ جھنجھلا گئی "میں تو اس ساری حیاتی کی بات کرتی ہوں کہ یہ کیوں ہے ؟ اور ہم سب جنوروں کی طرح بندھے ہوئے اُسی طرح کیوں کرتے چلے جاتے ہیں جس طرح ہم سے پہلے بے انت برسوں سے جب یہ رُکھ نہ تھے اور تب تک جب یہ رُکھ نہ ہوں گے --- تب تک ہم ایسے ہی کیوں چلے جاتے ہیں --- اناج کے لئے --- اپنے بیج کو آگے بڑھانے کے لئے --- اسی طرح حیاتی کیوں گذارتے ہیں ---"

ورچن اٹھا اور پسینہ پونچھتا اُس کے پاس ہو بیٹھا "جب یہ رُکھ نہ ہونگے اور کچھ بھی نہ ہو گا تو پھر بھی ہم ہوں گے --- ہم جنوروں کی طرح نہیں بندھے ہوئے پاروشنی --- ہم نے تو اُسے باندھ رکھا ہے اُسے کہ تُو اس طرح چل --- ہم تو اپنی من مرضی کرتے ہیں"

می آؤں ۔ می آؤں --- رُکھوں میں مور بولا پر اُس کی آواز صرف پاروشنی نے سُنی اور وہ دھیرے سے مسکرائی اُس روز کے لئے جب ایک پرندہ اُس کے سامنے گرا تھا جب وہ جھیل پر تھی اور پھر رُکھوں میں آئی تو یہ مور پیپل تلے اپنے رانگلے پر سمیٹے بولتا تھا اور اُسے دیکھتا تھا۔

بستی کے سارے وسنیک اِن دنوں کھیتوں میں تھے --- وہ ایسا تو نہیں ہونے دیتے تھے کہ بڑا پانی کام پورا ہونے سے پہلے آجائے اور پھر وہ سارا برس لوگوں کے سامنے شرمندہ رہیں کہ پتہ ہے ان کے حصّے کے کھیت میں ابھی بیج پوری طرح نہیں بکھیرا گیا تھا اور ڈھگا گیا تھا کہ پانی آ گئے اور انہوں نے کنک نہیں پر گھاس پھونس کاٹی اور کھائی --- یہ ایک ایسی ٹچکر تھی جو

ساری حیاتی اُس شخص کا پیچھا نہ چھوڑتی جو کھیت تیار کرنے میں سست ہوا اور پانی آ گئے --- اور ہر کوئی جُتے کا پورا زور لگا دیتا کہ یہ ٹچکر نہ سننی پڑے --- ڈورگا کے ذمّے ابھی کوئی کھیت نہ تھا پر وہ ہر اُس شخص کا ہاتھ جا بٹاتا جو ذرا پیچھے رہ جاتا --- سمرو بھی مگن تھا کسیاں اور کدالیں بنانے میں پر وہ وقت نکالتا اور ہر روز تھوڑی دیر کے لئے ادھر جاتا جدھر ورچن اور پاروشنی کام کاج میں جُتے تھے --- وہ دور سے پاروشنی کو دیکھتا ، اُس کے بڑھتے ہوئے جُثّے کو دیکھتا اور پھر واپس آجاتا۔

ماتی اور اُس کے تینوں ہمیشہ کی طرح سب سے زیادہ کام کر رہے تھے اور جنوروں کی طرح جتے ہوئے تھے۔ گاگری کی بہن کو اسی اب جھوریا کے ویاہ میں آگئی تھی اور اُن کے ساتھ گُتّا بھی تھا جو اتنا چھوٹا تھا وہ جب کھیت میں بیٹھتا تو دور سے کچھو کی طرح لگتا۔

وہ سب کھیتوں میں دن رات تھے اور کام میں جُھکے ہوئے تھے۔

ابھی بڑے پانی کے بارے اُنہوں نے زیادہ نہیں سوچا تھا کہ یہ بعد کی بات تھی۔

کوئی شے اُس کی کُدال سے ٹکرائی تو وہ بیٹھ گیا۔ اُس نے مٹّی کو سمیٹ سمیٹ کر پرے کیا تو ایک ٹھیکری تھی اور اُس پر کچھ بیل بوٹے تھے --- پاروشنی نے ادھر دیکھا تو نہیں پر جان گئی کہ وہ کدال روک کر بیٹھا ہے۔ اُس نے ادھر دیکھا تو وہ ٹھیکری پر جُھکا تھا۔

"اِس کھیت میں گھاس پھونس اُگے گی اور وہ تم کاٹو گے اور کھاؤ گے" پاروشنی بولی پر ورچن نے جواب نہ دیا تو وہ اٹھ کر پاس ہوئی "کیا ہے ؟"

"میں جب موہنجو سے آیا تھا تو --- ڈورگا بھی --- تو راستے میں ویارنا کی پرانی بستی کے نشان تھے۔ وہاں جو ٹھیکریاں تھیں تو بس ایسی تھیں --- بالکل ایسی"

"پر یہ تو پکّی کے آوے کا کوئی گھڑا ہے یا جُھجھر ہے جو ٹوٹ کر مٹّی میں تھا اور تمہیں ملا ---"

ورچن نے سر ہلایا "نہیں یہ کچھ اور ہے اور کہیں اور کا ہے یہاں کا نہیں ہے"

"کہیں اور کا ؟" پاروشنی کے ماتھے پر ایک سلوٹ اُبھری "کہاں کا ؟"

"پتہ نہیں --- پر ہم سے پہلے بھی بہت کچھ تھا ، جو نہ رہا --- اور بستیاں تھیں اور اُن میں وسنیک تھے تم جیسے اور مجھ جیسے ---"

"اور اُن بستیوں کا کیا ہوا ---" پاروشنی ڈرتے ہوئے بولتی تھی "اور ہمارا کیا ہو گا ؟"

ورچن نے پاروشنی کے ڈر کو دیکھا تو اُس کا دل نرم ہوا "یہ ٹھیکری تو پکّی کے کسی برتن کی

ہے میں تو یونہی کہہ رہا تھا ۔۔۔"

"نہیں میں پکلی کے اُلیکنے کو جانتی ہوں ۔ جو بیل بوٹے وہ بناتی ہے اُنہیں جانتی ہوں ۔ وہ تو میرے جُثے پر بنے ہیں اور تم نے جھیل کے پاس چاند کی روشنائی میں اُنہیں دیکھا تھا کہ میں ایک رُکھ لگتی تھی جو گرا ہوا تھا ۔۔۔ تو اس ٹھیکری پر بیل بوٹے وہ نہیں جو پکلی بناتی ہے"

"تو پھر یہ کوئی اور پکلی تھی جو یہیں اسی گھاگھرا کے کنارے تھی ۔۔۔ اور وہ جو کچھ الیکتی تھی وہ بے انت زمانوں سے چلا آتا تھا اور پھر کچھ ہوا ، کچھ ٹوٹا اور یہ بیل بوٹے جو ہم دیکھتے ہیں کہیں سے آئے ۔۔۔ یہ کوئی اور پکلی تھی"

ڈوبو مٹی کے پار رُکھوں کی ہری دیوار میں سے دو سر نکلے جو ماسا اور جیوا کے تھے "جو آ گیا وہ آ گیا" اور اُن کے سر پھر رُکھوں میں گُم ہو گئے ۔

می آؤں ۔ می آؤں ۔۔۔ مور اب بولا تو اُس کی آواز ورچن نے بھی سُنی ۔۔۔ اور اُس نے پاروشنی کی طرف دیکھا ۔ اور پاروشنی سر جھکائے بیٹھی تھی اور جانتی تھی کہ ورچن اُسے دیکھتا ہے ۔

اسنوں کے شروع میں گھاگھرا کے پانی اونچے ہوئے پر یُوں جیسے سوچ میں ہوں دھیرے دھیرے اور اپنے میں گُم ۔۔۔ اور پھر وُہ گُم سُم کناروں سے باہر آئے پر ایک جھجھک کے ساتھ ۔ بستی کے آس پاس اور کھیتوں تک رینگتے گئے جیسے کینچلی اُتارنے سے پہلے کا سانپ رینگتا ہے ۔ اب اُنہوں نے کئی روز ادھر ہی رہنا تھا کھیتوں اور زمینوں میں اور بستی میں سب لوگوں نے اپنے چھپروں میں آلکس کے مزے میں اونگھتے رہنا تھا پر بڑے پانی کے دریا میں سے نکلنے کے دوسرے دن سمرو نے اپنے چھپر سے باہر جھانکا تو پانی واپس گھاگھرا میں جا چکے تھے ۔

وُہ سروٹ کی کشتی میں بنی ٹھنی دریا کے پار جاتی تھی ۔

دریا کے کنارے چند بچے ایک کچھو کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے تھے پر وُہ اپنی گردن اور ٹانگیں سمیٹے ایک چپٹے پتھر ایسا ہو رہا تھا ۔

پانی کم تھا پر جتنا تھا اُس میں ماگھ کا پالا ایسے گھلا ہوا تھا کہ اُسے ہاتھ نہیں لگتا تھا ۔

بستی سے پرے پکلی کے آوے کی طرف دریا کا پاٹ چوڑا تھا اور وہاں کنارے کے ساتھ پانی کم تھا اور اُس میں سے لوگ نظر ٹکا کر مچھلی کو تاکتے تھے اور پھر سانس روک کر اُسے جھپٹ لیتے تھے ۔ پر اُن سے وُہ پکھیرو تاکنے میں آگے تھے جو دریا کی سطح پر اُڑتے رہتے ۔ اور پھر ایسے گرتے جیسے مر کر گرتے ہوں پر وُہ مچھلی پر گرتے اور اُسے پانی میں سے نکال لے جاتے ۔

سمرو نے اُسے سروٹ کی کشتی میں بیٹھتے دیکھا تو یہ جانا کہ وُہ پانی پر رُک کر بستی کو دیکھنے جاتی ہے ۔ اور وہاں پانیوں پر تیرتے ہوئے اُن کی بستی بہت بھلی لگتی ۔ اُس کے پیچھے پر بہت پیچھے رُکھ نظر آتے پر تھوڑے ۔ اور وُہ پرانی دیوار جو کبھی بڑے پانیوں کو روکنے کے لئے بنائی گئی تھی ۔ دریا کے بیچ تک جا کے سب اپنی کشتی واپس کرتے ۔۔۔ کیونکہ اُس سے آگے راستہ نہ تھا ۔۔ راستہ تو تھا پر ادھر جانا نہیں تھا ۔ دوسرا کنارا دکھائی تو دیتا تھا پر آج تک کوئی بھی اُدھر گیا نہیں تھا ۔۔۔ کیوں جو چلے جاتے ہیں تو وُہ دوسرے کنارے پر ہی تو چلے جاتے ہیں تو بھلا سانس چلتا ہو تو اچھا بھلا بندہ ادھر کیوں جائے گا ۔۔۔ اُدھر تو وُہ جاتے تھے جن کے لئے کشتی والا آ جاتا تھا کہ آؤ میں تمہاری اڈیک میں ہوں تمہیں پار لے کے جانا ہے ۔ تم جو کچھ کر رہے ہو اور جہاں بھی ہو ابھی اٹھو اور چل دو کہ میں نے اور بہت ساروں کو تمہارے بعد اُدھر پار لے کر جانا ہے ۔۔۔ اور ادھر پار تو وُہ سب تھے جو کبھی تھے ۔۔۔ پتہ نہیں کتنے ۔۔۔ اور وُہ وہاں کیسے تھے ؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کیونکہ ادھر آج تک کوئی گیا نہیں تھا ۔

وُہ کل رات ماتی کے آگے لیٹی تھی اور ماتی نے اُس کے جُثے کو دیکھا بھالا تھا ۔

"بس یہ آنے کو ہے ۔۔۔" اُس نے بتایا تھا "مجھے بُلا لینا ۔۔"

پر پاروشنی نے اُسے نہیں بلایا تھا ۔ آج سویرے جب درد نے اُس کے جُثّے کو چیرنا شروع کر دیا تھا اور اُسے یُوں لگتا تھا جیسے اُس کے دو حصّے وکھرے وکھرے ہو جانے کو ہیں تو وہ جان گئی تھی کہ اب یہ ہونے کو ہے ۔۔۔ پر اُس نے ماتی کو نہیں بُلایا جو اس کام کی جانُوں تھی اور جس کا ہاتھ بڑا صاف اور پکّا تھا۔ تو وُہ اب دریا پار اپنا بچّہ جننے کو جاتی تھی ۔

پکلی نے کہا تھا ۔۔۔ "پاروشنی تیرے اندر پتہ نہیں کونسا ڈر ہے کہ تو اُن چیزوں سے تو نہیں ڈرتی جن سے ہم ڈرتے ہیں ۔۔۔ تو پھر وُہ کیا ہے جو تیرا رنگ پیلا کرتا ہے ۔۔۔ تو شگن کر لے کہ تیرا بچّہ کیسا ہو گا ۔۔۔ کہیں سے چِٹّا سفید پکھیرو لے آ ۔ اُس کی گردن کاٹ کر زمین پر پھینک تو اگر وُہ اپنی پیٹھ پر مرے تو جان لے کہ یَم کے کُتّے تم دونوں کے پیچھے آتے ہیں اور اگر اوندھا ہو جائے تو سب ٹھیک ہو گا" ۔۔۔

اُس نے چھپّر میں سے نکلنے سے پہلے اپنے آپ کو شنگھارا ۔۔۔ پہلے وُہ اپنے کنُویں کی منڈیر پر بیٹھ کر سیلٹ کی چیکنی مٹّی جُثّے پر مَل کر نہائی اور اُس میں بڑی مَست مہک تھی اور جس نے اُس کے سینے اور پیٹ کو نرم کیا ۔ پھر اُس نے سُرمے سے آنکھیں بھور کالی بنائیں ۔ پھر سیسہ پانی اپنے مُنہ پر لگایا تو اُس کی رنگت چِٹّی سفید ہو گئی ۔ اُس کے ہاتھوں میں کنگن تو ہمیشہ رہتے تھے پر اب اُس نے پاؤں میں جھانجھر اور کڑے اور ناک میں کیل اور گلے میں حمیل پہنے ۔

وُہ اپنے بچّے کو دریا کے دوسرے کنارے جاکر جننا چاہتی تھی تاکہ وُہ ان سب سے الگ ہو ۔۔۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ وُہ اُس کا نام کرومور رکھے گی ۔

پہلے موٹے باجرے کے دانے مٹّی میں پڑے رہے اور مینہ نہ پڑنے سے بُھن کر راکھ ہوئے اور پھر کنک بھی مٹّی میں مل کر مٹّی ہوئی کہ بڑے پانی آئے اور پیچھے ہو گئے ۔

وُہ کشتی چلا رہی تھی اور اُس کے جُثّے میں ایک تَراٹ اس طرح تیری کہ وُہ اپنے کُولہوں کو پکڑے مُنہ بھار گر گئی ۔ کشتی بیچ دریا میں تھی اور اُس کے بہنے کے ساتھ ساتھ ہولے سے بہتی تھی ۔ وُہ اپنے آپ کو دباتی اور سانس روکتی اوندھی پڑی رہی اور اُس کے ماتھے اور پُورے جُثّے پر اُس کے اپنے پانی تیرے ۔ اور وُہ اُن میں بھیگتی زور زور سے سانس لیتی رہی ۔ اُس کے کان سروٹ کی کشتی کے ساتھ لگے تھے اور وُہ بہاؤ کو سُن رہی تھی ۔ یہ بہت مدھم تھا ۔ زور میں نہیں تھا ۔ پالے کی رُت میں ایسا ہی ہوتا تھا پر زور کچھ کم تھا ۔ جب اُس کی درد بس ہولے ہوئیں تو وُہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور چپّو سے کشتی کو آگے کرنے لگی ۔

سمرو نے دیکھا کہ پاروشنی کی کشتی دریا کے بیچ سے آگے جاتی ہے ۔۔۔ اُس کا ماتھا سُلگنے لگا ۔۔ یہ کیا کرنے کو ہے ۔ اِسے مت دینی چاہیئے کہ ایسا نہ کرے ۔ دریا کے دوسرے کنارے پر نہ جائے اُدھر کوئی نہیں گیا ۔ پر وُہ جائے گی ، رُکے گی نہیں ۔۔۔ اور اپنے ساتھ وُہ اُسے بھی لے جاتی تھی جو اُس کا تھا ۔۔۔ شائد اُس کا تھا ۔

دریا کے بیچ میں سے جب کشتی آگے ہوئی ۔ دوسرے کنارے کے زیادہ پاس ہوئی تو پاروشنی میں کوئی ڈر نہ تھا ۔ وُہ جانتی تھی کہ اُدھر آج تک کوئی نہیں گیا سوائے اپنے برتن میں بند ہو کر کوئی نہیں گیا پر اُس کے اندر کوئی ڈر نہ تھا ۔ وُہ دوسرے کنارے کے بھید کو جاننا چاہتی تھی اور دوسرا کنارہ اُس کے پاس آتا گیا اور پھر آ گیا ۔۔۔ اُس نے کشتی کو گھسیٹ کر خشکی پر کیا اور پھر کھڑی ہو گئی ۔۔۔ وہاں چُپ تھی ۔۔۔ اُس نے اس چُپ کو سُننا چاہا کہ اس میں وُہ سب ہوں گے جو کبھی تھے پر کوئی نہیں بولا ۔۔۔ وہاں صرف چُپ تھی ۔ یا پھر چند جھاڑیوں کے نوکیلے پتّوں میں سے گزرتی ہوا تھی اور اُن سے پرے ریت تھی اور اُس سے پرے بھی ریت تھی اور اُس سے پَرے اُسے نظر نہیں آتا تھا ۔۔ دِن ڈھلتا تھا اور جھاڑیوں کے سائے لمبے ہوتے تھے ۔ اور دریا پر تیرتا پالا اُس کے جُثّے کو بیج کرتا تھا ۔۔۔ وُہ زمین پر لیٹ گئی کُھلی ہو کر جیسے اپنے آپ کو سُکھاتی ہو اور انتظار کرنے لگی ۔

اُوپر خالی آسمان تھا جو روشنی کم کر رہا تھا ۔ اس کے آس پاس کُچھ نہ تھا بس وُہ خود تھی اور مٹّی میں ایک ایسی مہک تھی جو اُس کے سَر میں اثر کرتی تھی ۔

سُورج نیچے ہو کر پانی کے اندر کہیں چلا گیا اور شام کے پاؤں پاؤں پر ہی رات آ گئی اور وُہ کُھلی ہو کر لیٹی انتظار کرتی رہی ۔

دریا کے پار بستی کے نیچے چند دیئے جھلملاتے تھے ۔

اور تب رُکھوں میں مور بولا "می آؤں ۔ می آؤں ۔"

اور اُس کی آواز ڈوبو مٹّی اور بستی اور دریا پر سے تیرتی اُس کے کانوں تک آئی اور پاروشنی نے ایک گہرا سانس لے کر اپنے آپ کو تیار کیا اور دردوں سے اُس کا جُثّہ کٹنے لگا اور تراٹوں نے اُسے اِس طرح کاٹنا شروع کیا کہ وُہ دوہری ہو گئی ۔۔۔ پسینہ بڑے پانی کی طرح اُس کے بدن سے اُترنے لگا اور اُس کی پیٹھ نیچے مٹّی گیلی ہو ہو کر کیچڑ میں بدلنے لگی اور وُہ اُس میں تڑپتی تھی پر مُنہ بند رکھتی تھی ۔ اور یُوں بہت دیر ہوا ۔۔۔ اتنی دیر کہ جیسے اُس کی بوٹی بوٹی الگ ہوئی اور پھر

جُڑی اور پھر الگ ہوئی اور وُہ اپنے پسینے میں پھسلتی مُنہ بند رکھتی رنگ بدلتی کراہتی اور تڑپتی رہی ـ ـ اور یُوں بہت دیر ہوئی اور پھر رُکھوں میں مور بولا ـ ـ ایک بوجھ اُس کے پیٹ میں سے حرکت کرتا ہوا نیچے ہوتا گیا اور رات کی تاریکی میں اُس کے دانت بھنچے ہوئے تھے اور وُہ درد کی شدّت سے دوہری تہری ہوئی جاتی تھی پر مُنہ نہ کھولتی تھی اور اُس کے ہونٹ جو دانتوں تلے کٹتے تھے اور اُن میں سے رَت پھوٹتی تھی پر پھر بھی وُہ بولتی نہ تھی اور پھر اُس کے بیچ میں دراڑ پڑنے لگی اور پھیلنے لگی اور وُہ یکدم ہلکی ہوگئی ـ ـ ـ وُہ جیسے دریا میں تیرتی تھی کہ اُس کا سارا جسم اور آس پاس کی مٹّی پانی تھی ـ ـ ـ

اُس کے کان سُنتے تھے ـ

اُس نے ہاتھوں سے اس تیز دھار والے پتھر کو ٹٹولا جو وہ ناڑو کے کاٹنے کو ساتھ لائی تھی اور پھر اُس کے کان انتظار کرنے لگے ـ

اب اُس کے رونے کی آواز آنی تھی ـ ـ ـ

گھاگھرا کے پانیوں پر تیرتی اُس مور تک پہنچنی تھی جو رُکھوں میں تھا ـ

اُس کے رونے کی آواز اب آجانی چاہئے تھی ـ ـ ـ پر وُہ نہ آئی ـ

وُہ وہاں بہت دیر تک پڑی رہی ـ

اور اُس کے آسے پاسے ایسی چُپ تھی کہ وُہ چُپ بولتی تھی ـ

اور اُس کے اُوپر آسمان کے سیاہ کنوئیں کی گہرائی میں منجی کے چار تارے اور اُن کے پیچھے ترنگلی بھی بُجھ بُجھ کر لشکتے تھے ـ

دریا کے پانی سانس روکے تھمے لگتے تھے یا تھمے ہوئے تھے ـ

مگھر کا سِیت پالا اُس کے جُسّے میں اُترنے لگا اور وُہ گیلی مٹّی جو اُس کے پسینے نے بنائی تھی اب ٹھنڈی ہوتی تھی اور اُس کی ہڈیوں میں اُترتی تھی ـ

وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اُس کا ناک کس پر ہے پر وُہ دیکھ نہ سکی ـ

دریا میں سے ابھرنے والا ٹاپُو اب ایک مرتبہ پھر ہموار ہو کر پانی کے ساتھ لگ گیا تھا ـ ـ ـ جو کُچھ اُس کے اندر تھا وُہ اب ساتھ پڑا تھا پر اُس کے رونے کی آواز نہ آئی ـ ـ ـ وُہ تھا ہی نہیں ـ ـ ـ وُہ جو کُچھ تھا پاروشنی کے اندر تھا پر باہر ہوا تو اُس میں سانس نہ تھا ـ ـ ـ اُس کے ہڈ پیر تھے پر کس کام کے بس گھاس پھونس تھا کسی نہ کام کا نہ کاج کا اور وُہ پاروشنی کی ہِک کے ساتھ لگا پڑا ٹھنڈا ہوتا تھا ـ

اور وُہ جو کبھی تھے اور اس پار تھے وُہ سب بھی رُکے ہوئے دم تھے ـ

سمرو نے اُسے کشتی میں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور اب چھپّر تلے ٹھٹھرتا تھا اور سوتا نہ تھا ـ

اُس کے آسے پاسے چُپ تھی ـ

رُکھوں کے اندر رُکا ہوا مور بولنا چاہتا تھا اور اُس کی چونچ نہ کُھلتی تھی ـ وُہ پُھدکتا اور پنجوں پر بھار ڈالتا جھیل کو جانے لگا ـ رُکھوں کے اوپر رات تھی تو نیچے اُس سے بھی بڑھ کر رات تھی اور وُہ چلتا جاتا تھا ـ جھیل رکھوں کی سیاہی کے اندر تھی اور دِکھتی تھی پر مدھم سی اور گُم ہوتی ہوئی ـ

ہم سب کہاں ہیں اور کیوں ہیں اور یہ کیا بھید ہے جو بے انت برسوں سے ہم سب میں جو تھے اور جو ہیں اِن میں چلتا جاتا ہے اور وہاں جائے گا جہاں ہم ہوں گے یا نہیں ہوں گے ـ ـ ـ

وُہ ہے بھی یا صرف ڈر ہے جو ہم نے خود بنایا ہے اور اب اُسی سے ڈرتے ہیں ـ ـ ـ مٹّی میں دبی ٹھیکری کونسی پکلی کی ہے ـ ڈور گا جھکا ہے تو کیوں ایسا ہے اور سمرو رات میں سوتے میں کہاں جاتا ہے اور اُس کا گلا سُوکھے کھیت کی طرح ہر دم پانی کیوں مانگتا ہے اور بڑے پانی آکر کیوں چلے گئے ـ ورچن جڑیں کیوں نہیں پکڑتا اور میرے ساتھ جو اکڑتا ٹھنڈا جُسّہ ہے یہ اتنے ماہ میرے اندر گرم رہا اور ہِلتا رہا تو اب کیوں نہیں رویا ـ ـ ـ پاروشنی نے اپنے آپ کو سنبھالا دے کر اٹھایا اور اُٹھ کر بیٹھ گئی اور وُہ اُس کے سامنے پڑا تھا پر دکھائی نہیں دیتا تھا کہ اُس کی ناک کیسی ہے اور کس کا ہے ـ ـ ـ اُس نے اُسے اٹھایا تو وُہ لکڑی کی طرح تھا ـ اکڑا ہوا پر نرم بھی تھا اُس کے اپنے پیٹ کی طرح ـ ـ اُس نے اُسے اٹھایا اور چلی اور کشتی تک گئی اور اُسے اندر رکھ کر کشتی کو دھکیلا اور جونہی وُہ گھاگھرا کے سانس روکے پانی پر تیری تو وُہ اُس کے اندر بیٹھ گئی اور اُسے کھینے لگی ـ ـ ـ پر ایسے کھیتی تھی جیسے نیند میں ہو ـ

پکلی دیکھ تیرے آوے سے اٹھنے والے دھوئیں سے زیادہ سیاہ رات میں مَیں ہوں اور بتا تُو اتنی مٹّی کہاں سے لائے گی جس کے ساتھ اس کے دبانے کو برتن بنائے گی ـ ـ ـ یہ ایسا ہے کہ اس کے لئے ایک پہاڑ کی مٹّی بھی پُوری نہیں ہوگی ـ

اسے دبانے سے پہلے میں اسے کھاٹ پر رکھوں گی جس کے پائے نہ ہوں اور اُس پر سفید کپڑا بچھا ہو گا ـ

میں ایک کنوئیں کے گھیر جتنی جگہ کو گوبر سے لیپ کر اُس پر گھاس ڈالوں گی اور اُس پر کنک کے دانے تاکہ کوّے اُنہیں کھالیں اور تمہیں نہ کھائیں ـ

پکلی تو میرا ساتھ دے اور اس کے لئے اتنا بڑا برتن بنا دے کہ میں بھی اس کے ساتھ مٹّی

میں دابی جاؤں ۔ تم سب جو چُپ ہو پُوچھنے آئے ہو کہ وہ کہاں ہے ۔۔۔ تو وُہ اس کو کہہ میں یُوں ٹھہرا جیسے ایک پہاڑ کی کھوہ میں ایک ہرن آباد ہوا ۔۔۔ کچھ دیر ٹھہرا اور پھر چلا گیا ۔

سروٹ کی کشتی میں پانی رِس رِس کر جمع ہوتا تھا اور وُہ دوسرے کنارے کے پاس ہوتی جاتی تھی ۔

سرکنڈوں کی دیوار جو کنارے کے ساتھ چلتی جاتی تھی ہولے ہولے ہوا سے ہلتی جاتی تھی ۔ آسمان پر منجی اور ترنگلی نیچے ہو رہے تھے ۔ مکھر کی سیت تیز تھی اور تیز ہوتی تھی ۔۔۔ اور آسے پاسے نری چُپ تھی ۔

پانی میں کوئی شے گری ۔

پھر ایک اور شپاک ایسی آواز پانی پر تیرتی پاروشنی کے کانوں میں آئی ۔۔۔ پر وُہ کہاں سُنتی تھی ۔ کچھ پانی میں گر رہا تھا اور کچھ ہوا میں تیرتا تھا ۔

کشتی کے ساتھ کچھ گرا تو گرنے سے پانی اُچھلا اور چھینٹے پاروشنی پر پڑے ، وُہ کب محسوس کرتی تھی ۔

چُپ میں کچھ گرتا تھا ۔

میں خود گرتی ہوں گھاگھرا میں اور یہ میرے گرنے کی آواز ہے ۔۔۔ میں ڈوبتی ہوں اور پانی میں ہوں ۔ تب پاروشنی کے سر پر سے کچھ گُذرا اور اُس کے کندھوں سے کچھ چُھوا اور پھر اُس نے سُنا کہ شائیں شائیں کی کچھ مدھم آواز تھی جو ہوا کو کاٹتی تھی اور اس کے ساتھ پانی میں بار بار کچھ گرتا تھا ۔۔۔ جیسے ڈھول پر مینہ کے موٹے قطرے گریں تو وہ گم ہوتے ہیں ۔ ایک مدھم گم کے ساتھ ایسے جو کچھ گرتا تھا پانی میں گم ہوتا تھا ۔۔۔ پاروشنی چپّو چلاتی تھی تو شور ہوتا تھا ۔ اُس نے اُنہیں پانی سے اُٹھا لیا اور سُننے لگی ۔۔۔ دھیرے دھیرے جو کچھ گرتا تھا وُہ بڑھتا گیا جیسے مینہ کی پہلی ٹپ ٹپ کے بعد وُہ زیادہ اُترتا جائے ۔ گھاگھرا کی سیاہ دِکھتی زمین پر گرنے کی بے انت آوازیں دھیرے سے اُبھرتی تھیں ۔۔۔ اور پھر پَروں کی ایک پوٹلی کشتی میں آ گری اور پاروشنی کی پیٹھ کے ساتھ لگ کر ٹھنڈی ہو گئی ۔۔۔ اُس نے اُسے چُھوا تو وُہ مرا ہوا تھا ۔

وُہ بے انت تھے اور آسمان کو ڈھکے ہوئے تھے اور اس طرح اور ایسے ڈھکے ہوئے تھے جیسے صرف ایک پَر ہے جو پُورے آسمان پر چھایا اُسے ڈھک رہا ہے ۔ وہ اتنے تھے کہ رات کے اندر ایک اور رات کرتے تھے اور اُن کے پروں کی شُوکر بے حد مرنے والی تھی ، بہت دھیمی اور رُکتی

ہوئی اور شور کے بغیر تھی ۔۔۔ وُہ الگ الگ نہ دِکھتے تھے پر ایک لگتے تھے جو بہت بڑا ہے اور سارے آسمان پر ہے ۔ پر جب وُہ گرتے تھے تو پھر جانا جاتا تھا کہ یہ بہت سارے ہیں کیونکہ اُن میں سے ایک الگ ہو کر نیچے آتا تھا اور گھاگھرا کے پانیوں میں سوراخ کر کے نیچے چلا جاتا تھا اور پھر وُہ سوراخ برابر ہو جاتا تھا اور وُہ اُس کا حصّہ بن جاتا تھا ۔ اندھیرے کے اندر اندھیرے میں پاروشنی اُنہیں پوری طرح دیکھ نہ سکتی تھی پر وُہ آنکھیں پھاڑ کر اُنہیں دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ کہاں سے آ گئے ہیں اتنے ڈھیر سارے اور انہیں گھاگھرا میں گرنے کی جلدی کیوں ہے ، وُہ کیوں گر رہے ہیں ۔۔۔ وُہ بے انت تھے اور اُس کی کشتی کے آسے پاسے گھاگھرا کے پانیوں پر گرتے جاتے تھے اور اس سیاہ رات کے اندر ایک اور رات کرتے تھے جو اُن کے پروں کے پھیلنے اور سُکڑنے سے وجود میں آتی تھی ۔۔۔ اور اس رات میں اُن کے پروں کے پھیلنے اور سُکڑنے سے ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگتی تھی اور پھر رُکتی تھی جیسے وُہ سب سانس لیتے ہوں پر یہ اُن کے پروں کی شُوکر میں سے نکلتی مدھم ہوا تھی ۔

وُہ اس کی کشتی کے آس پاس آسمان سے اس طرح گرتے تھے جیسے وُہ اُس کے اندر سے باہر کو گرا تھا ۔ وُہ بولتے نہ تھے چُپ تھے اور گرتے جاتے تھے ۔

پاروشنی نے اُس ایک کو اٹھایا جو کشتی میں گرا تھا ، اُس کا جُسّہ ٹھنڈا ہو چکا تھا ، مکھر کی رات میں وُہ ٹھنڈا ہو چکا تھا ۔ وہ ڈوبتے تھے کہ وُہ آسمان پر اپنا آخری دم لیتے تھے اور پھر مُردہ ہو کر نیچے پانی میں آ گرتے تھے ۔۔۔ یہ تو جھیل پر گرا کرتے تھے ! اُن پانیوں پر جو خشک ہونے کو تھے ۔۔۔ اب یہ بہتے دریا پر کیوں گرتے ہیں ۔

آسمان میں اُنہوں نے ایک اور رات کر رکھی تھی اور اُن کے پروں کی شُوکر اُکھڑے ہوئے سانس کی طرح مدھم مدھم آتی جاتی تھی ۔۔۔ اور وُہ تیز برستے مینہ کی طرح نیچے آتے چلے جاتے تھے ۔ اور اُن کے گرنے سے گھاگھرا کی سطح میں بے انت گڑھے بنتے تھے اور گم ہوتے تھے ۔۔۔ اور پانی جو اُن کے گرنے سے اُڑتا تھا کشتی میں بیٹھی پاروشنی پر پڑتا تھا اور اُس پر بھی پڑتا تھا جس میں دم نہ تھا ۔

پاروشنی نے پہلے اُسے اٹھایا جو اُن میں سے ایک تھا جو اُس کے آسے پاسے رات کے اندر ایک اور رات کرتے تھے اور جن کے پَروں کی شُوکر اُکھڑے سانس کی طرح مدھم مدھم آتی جاتی تھی جو بے دم ہو کر پانیوں میں گرتے جاتے تھے اور پھر اُس کو اٹھایا جو رویا نہ تھا اور وُہ کشتی پر سے جُھکی اور اُنہیں گھاگھرا میں ڈال دیا ۔

سامنے یہاں سے وہاں تک جہاں تک وُہ دیکھ سکتے تھے ریت تھی اور جھاڑیاں تھیں اور اُن میں وُہ ایک نہ تھا سارے تھے جو کبھی جھاڑیوں کے اوپر بیٹھ کر دانت نکالتے اور کبھی اُن کے سامنے بیٹھ کر اپنے لمبے کان ہِلاتے ۔ وہ دانت نکوس کر اُن کی طرف بڑھتے پر وُہ پنجوں میں نہ آتے ۔

پر یہ تو ایک تھا اتنے سارے کیسے ہو گئے ؟

اُن میں سے ایک کُتّے کے سر میں کُچھ گھوما ۔۔۔

جب ہم خُشک کھیتوں میں لوٹنیاں لے رہے تھے اور یہ سیہا اپنے لمبے کان جوڑے پنجوں سے مٹّی کھودتا تھا تو ہم نے اسے دیکھا اور چِیخ چِیخ کرتے اس کے پیچھے ہو لئے ۔ یہ ایک تھا ۔ اور یہ ڈوبو مٹّی پر کُودتا رُکھوں میں آیا تو ہم اس کے پیچھے تھے تو یہ ایک تھا ۔ اور ہماری زبانیں اس کی رَت کا سواد لینے کے چاؤ میں باہر لٹکتی تھیں اور اُن سے رال ٹپ ٹپ گرتی تھی اور اُس راستے پر گرتی جاتی تھی جس پر ہم اِس سیہے کو پکڑنے کو اپنا زور لگاتے بھاگتے تھے ۔۔۔ ہمارے تو جو پنجوں میں آجاتا ہم اُسے کھاتے ہیں پر اس سفید نرم اور پلپلے جنور میں رَت بہت ہوتی ہے اور اسی لئے ہم چاروں پانچوں اِسے پکڑنے کو بھاگتے تھے اور پھر رُکھوں کے اندر جاتے تھے اور اُس پر نظر رکھتے رُکھوں کے اندر جاتے تھے ۔ اُس کا چھوٹا سا پُھرت والا جُثہ ہر شے پھلانگتا جاتا تھا اور اُسے پتہ تھا کہ میرے پیچھے میری رَت پینے چاٹنے والے تھوتھنیاں اٹھائے سُونگھتے بھاگتے چلے آتے ہیں تو وُہ اپنی ٹانگوں سے بھاگتا نہ تھا اُڑتا اُن کو پنکھ لگاتا جاتا تھا ۔ ایک بار اُس نے ایک جھاڑی میں اپنے آپ کو گُم کرنا چاہا پر ہم اُس کی باس پر تھوتھنیاں رکھ کر اُس کے پاس ہوتے جاتے تھے اور وُہ پُھدک کر پھر اپنی رَت بچانے کو دوڑنے لگا ۔ جہاں رُکھ ختم ہوتے ہیں وہاں سے ریت شروع ہوتی ہے اور ہم کبھی اُدھر کو نہیں گئے ۔ ہم تو بس بستی اور اس کی سُوکھتی کھیتیوں کے آسے پاسے رہتے ہیں پر رَت کے سواد نے ہمیں بے بس کیا اور ہم وہاں سے نکلے جہاں ہم رہتے تھے ۔ تو جب وُہ آخری رُکھ کے پاس پہنچا جس کی چھاؤں ریت پر پڑتی تھی تو وُہ رُکا اور جھجھکا اور پھر ریت میں چلا گیا ۔۔۔ ہم بھی وہاں رُکے اور جھجکے کیونکہ اس کے آگے ہم کبھی نہ گئے تھے اور جانتے نہ تھے کہ آگے کیا ہے ۔ پر ہماری تھوتھنیوں نے سُونگھ کر بتایا کہ آگے سیہا ہے تو ہم سب بُھول بھال رُکھوں سے نکل کر اُدھر چلے گئے جہاں ہم آسمان تک ریت دیکھتے تھے اور تب ۔۔۔۔ وُہ ایک سے بہت سارے ہو گئے ۔ پہلے تو ہم سب اُن کو پکڑنے کے لئے الگ الگ اُن کے پیچھے بھاگنے لگے ، کبھی کسی ٹیلے پر کبھی کسی جھاڑی میں اور کبھی کسی سوراخ میں اور ہم سب اُچھل کُود رہے تھے اور پھر ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا کہ ہم پانچوں چاروں الگ الگ جگہوں پر اچھل کود رہے تھے اور کس کے پیچھے اچھل کُود رہے تھے ، یہ صرف اُسے نظر آرہا تھا جو ایسا کر رہا تھا اور باقیوں سے وُہ اوجھل تھا تو ہم رُک گئے ۔۔۔ وُہ صرف ایک تھا اور یہ بہت سارے تھے تو یہ کہاں سے آگئے اور اگر یہ بہت سارے ہیں تو سب کو نظر کیوں نہیں آتے ۔۔۔ تب وُہ کبھی جھاڑیوں کے اوپر بیٹھ کر دانت نکالتے کہ آؤ ہمیں پکڑ لو اور کبھی ہمارے سامنے بیٹھ کر اپنے لمبے کان ہلا ہلا کر ہمیں تاؤ دلاتے اور ہم اُنہیں دیکھ کر ڈرنے لگے اور ہانپنے لگے کہ یہ کیا ہیں ۔۔۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنی اپنی دُمیں لرزتی ٹانگوں میں دبائیں اور رُکھوں کی طرف واپس بھاگے ۔۔ پر ہم وہاں تک اُن میں پُہنچتے پہنچتے کُچھ اور ہو چکے تھے اور ہمارا سر گُھوم چُکا تھا اور ہم بدل چکے تھے ۔ ہماری رَت گرم ہو کر ٹانگوں اور دُموں میں سے پھٹ کر باہر آتی تھی ۔۔ ہم ایک دُوجے کو کبھی نہیں کھاتے پر ہم ایسے کُچھ اور ہوئے کہ ہم ایک دُوجے کو بھنبھوڑنا چاہتے تھے اور رَت پی جانا چاہتے تھے ۔ ہم رُکھوں میں بھاگتے بھاگتے آپس میں اُلجھتے اور بھونکتے تھے اور ہماری زبانوں پر کُچھ ایسے پُھوٹا کہ وُہ وراچھوں میں سے گرنے لگا اور یہ رال نئی جھاگ تھی ۔ جیسے بڑے پانیوں سے پہلے گھاگھرا پر آتی ہے ۔۔۔ ہم چاروں پانچوں وہ نہ تھے جو تھے اور ہم کُچھ اور ہو چکے تھے اور رُکھوں میں بھاگتے تھے ۔

چیوا نے نیچے دیکھا اور دُور اِملی کے ایک گھنے درخت میں گُم ماسے کو ہیک لگائی "ہے ماسا ۔۔۔"

ماسا اونگھتا تھا ، ہیک سے چوکنا ہوا "بول ۔۔۔ بول ۔۔۔ جو آگیا وُہ آگیا ۔۔۔ بول"

"اِن کتوں کو کیا ہوا ہے جو یُوں ایک دُوجے کو بھنبھوڑتے اور کاٹتے جاتے ہیں ۔ ابھی یہ ایک سیہے کے پیچھے بھاگتے گئے تھے اور اب واپس آئے ہیں تو ان کے مُنہ سے جھاگ بہتی

ہے ---"

"مجھے کیا پتہ کہ کیا ہوا ہے ---" ماسا غصے میں بولتا تھا۔

چیوا جواب ماسے جیسا ہو گیا تھا اپنی ٹہنی سے اُچک کر دوسری پر ہوا اور پھر دوسرے رُکھ پر اور پھر املی کے پتوں میں اُس نے جا جھانکا "تجھے پتہ ہے پر بتاتا نہیں"

"تو یہاں بھی آ گیا --- پہلے بستی چھوڑ کر ادھر آیا اور اب ادھر بھی چین لینے نہیں دیتا۔ جدھر جاتا ہوں اُدھر مامن ماسا مامن ماسا کرتا آ جاتا ہے، جنور کا بچّہ"

"مامن ماسا۔ مامن ماسا" چیوا نے اُسے چھیڑا اور پھر اُس کے پاس ہو کر مٹھی کھول کر بولا "بیر کھائے گا سُوہے بیر ---"

ماسا جو ابھی گرم ہو کر مُنہ سے تھوک نکالتا بولتا تھا بیر کی بات سُن کر اُسی کا ٹھنڈا ہو گیا اور چیوا کی طرف بے چارگی سے دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے مُنہ دُوجے پاسے کرتے ہوئے کہا "نہیں --- بیر تیرے پاس کہاں سے آئے" --- اُس نے رُکھوں میں آ کر بستی سے، اُس کے وسنیکوں سے سارے ناتے توڑ دیئے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ اُسے بستی میں جانا پڑتا جیسے وُہ ماتی کو ایک بار بتانے گیا تھا کہ بڑے پانی تیرے کھیتوں تک نہیں آئے --- ورنہ وُہ ادھر ہی رہتا۔ وُہ سارا کُچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا پر بیروں کا سواد اپنے تالو سے چپکا کر ساتھ لے آیا تھا اور یہ سواد چُھوٹتا نہ تھا۔ پہلے رُکھوں میں جھیل پاسے دو بڑے جھاڑ والی پُرانی بیریاں تھیں اور اُن پر پکنے والے سُوہے بیروں کو وُہ ٹہنیوں سے لٹک لٹک کر کھاتا اور پیٹ بھرتا پر ایک بیری ایسی بوڑھی ہوئی کہ کھڑی کھڑی سُوکھ گئی اور دوسری کو اندر سے کیڑے نے کھا لیا اور وُہ بُھر بُھری ہو کر گر گئی۔ یہ ابھی ایک برس پہلے ہوئے تھا۔ رُکھ سُوکھ رہے تھے۔ کئی اور رُکھوں کے ساتھ بھی یہی ہوا وُہ اندر سے کھوکھلے ہو کر رات گر جاتے تھے اور کئی بار ماسا جب ایک رُکھ سے دوسرے پر جانے کو بیٹھک لگاتا تو دیکھتا کہ دُوسرا رُکھ تو ہے نہیں وُہ تو گر چکا --- یہ بوڑھے ہو رہے تھے اور ان کی جگہ نیچے جھاڑیاں تو اُگتی تھیں پر ان رُکھوں کا بیج پودہ بن کر آگے اونچا نہ ہوتا تھا --- تو چیوا نے مُٹھی کھولی اور اُس میں تین سُوہے بیر تھے۔

"یہ کہاں سے لایا ---" ماسا نے اُنہیں اُچک لیا "ہماری بیریاں تو گر چکیں ہیں ؟"

"یہ بیر نہیں پِیلو ہیں ---"

"پیلو؟ ---" اُس نے ایک بیر چکھا "نہیں یہ تو بیر ہے"

"تم نے دیکھا نہیں ماسا --- تم اوپر دیکھتے ہو نیچے زمین کو تو دیکھتے نہیں --- وہاں اب رُکھوں کی بجائے جھاڑیاں اُگ رہی ہیں اور ان بیروں کی جھاڑیاں ہیں اور انہیں پِیلو کہتے ہیں"

"کون کہتے ہیں ؟"

"پتہ نہیں ---" چیوا سر کھجانے لگا "میں جب اُدھر چھپر میں بھیڑ بکریوں کا چھیڑو تھا تو ایک تپڑواسی نے مُجھے کھلائی تھیں اور کہا تھا کہ وُہ انہیں کہیں اور سے لایا ہے۔ تب ان کی جھاڑی ادھر نہیں ہوتی تھی --- اور اب بہت ساری بن رہی ہیں۔ ان پر یہ بیر لگے تو میں نے چکھے اور جان لیا کہ بیر نہیں پیلو ہیں"

"ہاں بیروں جیسی نہیں ہیں ---" ماسا نے ناک سکیڑ کر کہا "اور تو پوچھتا تھا کہ اِن کُتوں کو کیا ہوا ہے ؟"

"ہاں --- یہی پُوچھتا تھا"

"یہ ادھر گئے ہوں گے جہاں سے ریت شروع ہوتی ہے اور اُس کے بعد اُدھر اور کُچھ بھی نہیں بس ریت کی دُنیا ہے --- اپنے رُکھ چھوڑ کر ادھر گئے ہوں گے --- کسی سیہے کے پیچھے ---"

"تو ادھر جانے سے کیا ہوتا ہے ---"

"سر گھوم جاتا ہے ادھر جانے سے۔ اپنے رُکھوں کو چھوڑ کر ادھر جانے والے کو کُچھ ہو جاتا ہے۔ میں چھوٹا تھا تو دیکھتا تھا کہ جو کُتّا ادھر جاتا ہے وُہ ہلکایا جاتا ہے اور اُس کے مُنہ سے جھاگ نکلتی ہے۔"

"اور ہم تم اگر جائیں تو؟"

"میں اور تم؟" ماسا نے پیلو کھا کر اپنے چپکے ہوئے پیٹ کو تھپکا جیسے بہت کھا لیا ہو اور کہنے لگا "میں اور تم تو پہلے سے ہلکائے ہوئے ہیں چیوا ---"

"ہیں ؟" چیوا کُچھ دُکھی ہوا "اور جو کوئی اور جائے تو ---"

"وُہ بھی ہماری طرح کا ہو جائے ---"

"می آؤں۔ می آؤں" مور بولا۔

ماسا نے کان لگا کر سُنا کہ شائد دوبارہ بولے پر وُہ نہ بولا چُپ رہا "یہ اب اُدھر جھیل کے آسے پاسے پھرتا ہے، رُکھوں میں کم آتا ہے"

"مور کتنے برس کا ہوتا ہے ماسا --- یہ تو اِن رکھوں میں ہمیشہ سے ہے"

"ہاں ---" ماسا نے سر ہلایا "یہ تو مجھ سے پہلے کا ہے۔ پتہ نہیں مور کتنے برس کا ہوتا ہے۔ پر اب یہ بُوڑھا ہوتا ہے۔ اس کی آواز اب مُشکل سے رُکھوں کو پار کر کے بستی تک جاتی ہے۔ پہلے تو جانتے ہو جب یہ بولتا تھا تو لگتا تھا گھاگھرا کنارے کھڑا بولتا ہے --- اور سر پر کھڑا بولتا ہے ---"

"یہ رُکھ کیوں سُوکھ رہے ہیں ماسا ؟"

ماسا چُپ رہا اور پھر مُنہ پُھلا کر دوسرے پاسے دیکھنے لگا جیسے بچّہ رُوٹھ کر بیٹھتا ہے۔

"بتاؤ ناں ماسا ----"

"بس جو آگیا وُہ آگیا ---" ماسا بولا۔

"وُہ تو میں جانتا ہوں پر رُکھ کم ہو رہے ہیں --- پُرانے تو کھوکھلے ہو کر گرتے ہیں پر اُن کی جگہ نئے تو آتے ہی نہیں --- میں ادھر گیا تھا ریت کی طرف --- نہیں نہیں رُکھوں سے باہر نہیں گیا تھا۔ یونہی وہاں کھڑا ہو کر دیکھتا ہوں تو پتہ ہے کیا دیکھتا ہوں؟ --- کنارے کے رُکھ گرتے ہیں تو اُن کی جگہ ریت آجاتی ہے --- ریت رُکھوں کو چاٹتی بڑھتی جاتی ہے --- کیوں ماسا؟"

"پتہ نہیں کیوں --- پر یہ ہے کہ ---" ماسا کُچھ بتانے لگا اور چُپ ہو گیا۔

"بولو ماسا ---"

"تیرے پاس اور بیر ہیں ؟"

چیوا مسکرایا "نیچے ہیں جھاڑیوں میں --- میں تجھے لا دوں گا --- تُو بتا ---"

"تُو پھر اُدھر چلتے ہیں۔ نیچے --- تو میں بتاتا ہوں"

وُہ دونوں پھدک کر نیچے آئے اور رُکھوں کی چھاؤں، پتّوں اور سوکھی ٹہنیوں اور جھاڑیوں میں چلنے لگے۔ اُن کے چلنے سے پتّے ہِلتے اور کوئی جنور نکل بھاگتا۔

"مینہ برسنا کم ہو گیا ہے اس لئے رُکھ بھی کم ہو چلے ہیں" ماسا بڑبڑا رہا تھا "دیکھ چیوا پچھلے چھ سات برس میں کتنی بار برسا ہے --- بستی والے باجرہ اور تِل مٹّی میں رکھتے ہیں تو وُہ رکھے رہتے ہیں اور مینہ نہیں پڑتا۔ اب تو اُن کا بیج بھی سُوکھ سڑ کر پُرانا ہو گیا ہے اور اُگنے جوگا نہیں رہا --- ایک بار مینہ آیا تھا اور وُہ بھی ایسا کہ دُھول کو اوپر اٹھایا اور ختم ہو گیا --- بڑے پانی نہ ہوتے تو یہ سب بھی اب تک ادھر رُکھوں میں آجاتے --- ہیں ؟ کیا سواد آئے جو یہ سارے ادھر آجائیں ---"

"ہاں ہاں ---" چیوا نے سر ہلایا اور ہنسا "کیسا سواد آئے ہاہا --- ہاہا"

ماسا کھڑا ہوا اور مُنہ کھول کر دانت پورے کے پورے نکال کر ہنسنے لگا۔ وُہ ہنستا تو تھا پر اُس کی آواز اب کم نکلتی تھی۔ رُکھوں میں بیٹھے پنکھ پکھیرو تڑبک کر اُڑنے لگے۔ پر اب وُہ بھی کم تھے اور رُکھوں کے پتّے بھی چھدرے تھے اور سُورج کی روشنی جو پہلے کم نیچے تک آتی تھی اب زیادہ آتی تھی۔

"سب آجائیں تو بڑا سواد آئے" چیوا ہنستا ہنستا چُپ ہوا۔ ماسا نے اُس کی طرف دیکھا تو وُہ سر جھٹک کر بولا "چھ سات برس پہلے پاروشنی کے ساتھ بھی وُہی ہوا تھا جو گاگری کے ساتھ ہوا تھا"

"کیا ہوا تھا؟"

"جو آگیا وُہ آگیا ---" ماسا غصّے سے بولا "تو اُن جھاڑیوں کی طرف چل جہاں بیر لگے ہیں"

وُہ پھر چلنے لگے۔

"وُہ مرا ہوا آیا تھا ---"

"جو آگیا وہ آگیا ---" ماسا غصّے سے بولا "تُو ان جھاڑیوں کی طرف چل جہاں بیر لگے ہیں"۔

وہ پھر چلنے لگے۔

"تُو مجھے یہاں لے آیا اور خود چلا گیا ۔۔۔"

وُہ دیکھتے رہے بہت دیر تک دریا کے اُدھر دوسرے کنارے کو دیکھتے رہے اور اُس بھید کو پانے کے لئے دیکھتے رہے جو وہاں تھے ، وُہ جو کبھی تھے ، وُہ سارے کے سارے ادھر تھے ۔ اُن کے اور اُن کے بیچ گھاگھرا تھا ۔ رُت بدل چکی تھی اور شام سمے پانی پر سے چلتی ہوا اُسے چُھوتی، جُثّے کو کھنکا کر نکور کرتی جاتی تھی ۔

"میں تو تمہیں ساتھ نہیں لایا تھا تم خود میرے پیچھے پیچھے چلے آئے تھے ۔۔۔" ورچن ہنسا ۔ ورچن جواب ایسے ہنستا تھا جیسے اپنے آپ پر ہنستا ہو "اور جب میں نے درشتدوتی کو پار کرنے کے لئے اپنے لیڑے اُتارے اُس میں چلا تو پانی ابھی میرے گھٹنوں تک آیا ہو گا جب تم اپنے بے انت پاؤں اور ہاتھوں سے مجھے چمٹ گئے اور میں نے جانا کہ میرا وُہ برتن بن گیا جس میں مَیں زمین میں جاؤں گا ۔۔۔"

"تو اور کیا ۔۔۔" ڈور گا بھی ہنسا پر اُسی طرح جُھکا ہوا "میں کئی دن اور کئی رات تمہارے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا اور میں نے دیکھا کہ تم پانیوں میں اُترتے ہو اور مجھے چھوڑتے ہو ۔ میں تمہیں جانے دیتا تھا ۔۔۔ پر تم مجھے یہاں اس بستی میں گھاگھرا کے کنارے تو لے آئے اور پھر چلے گئے ۔۔۔ کہاں گئے تھے؟"

ورچن نے ایک ڈھیم اُٹھا کر گھاگھرا پر پھینکی جو بُھربُھری تھی تو ایک جگہ پر نہ پڑی بلکہ اُس کے حصّے بٹ گئے اور موٹے مینہ کی طرح پانی پر برسے اور پانی پھیلتے گئے ۔

"مجھے آئے ہوئے کئی دن ہو گئے ۔۔۔ پر تو نے اس سے پہلے یہ نہ پُوچھا کہ کہاں گئے تھے ۔۔۔ اب کیوں پوچھتے ہو؟"

"تمہارے بالوں میں ریت اور مٹی تھی اور تمہارا پیٹ پچکا ہوا تھا ۔ تم چلتے تھے تو تمہاری ٹانگیں تمہارا بوجھ سہارتی نہ تھیں اُسے گرانے کو پھرتی تھیں ۔۔۔ ماس پر جُھریاں تھیں اور

تمہاری آنکھیں کہیں اور تھیں اور مجھے نہ دیکھتی تھیں ۔ آج مجھے دیکھتی ہیں تو پُوچھتا ہوں ۔۔۔"

"میرے بالوں میں نِری مٹّی اور ریت نہیں ۔۔۔ سفیدی بھی ہے"

"میں نے دیکھا نہیں ۔۔۔ ہاں اب دیکھا تو ہے ۔۔۔ پر ابھی سے ایسا کیوں ۔۔۔؟"

"ایسا ہی ہونا تھا ۔۔۔ جو ایک جگہ پر ٹِکے نہیں وُہ جڑیں نہیں پکڑتا اور پھر گُھومتا ہے اور اُس کے بالوں میں مٹی اور ریت رہتی ہے ۔ اور وُہ سب کچھ دیکھتا ہے جو بستی سے پرے ہے اور دریا سے پرے ہے اور وُہ نرا اپنی بستی کے لئے نہیں ہوتا ، دوسری بے انت بستیوں میں رہنے والے بے انت لوگوں کے لئے بھی ہوتا ہے اور اُن کے لئے کُڑھتا ہے اور سوچتا ہے اور دیکھتا ہے ۔۔۔ اور یُوں وُہ کُچھ جلدی سے بوڑھا ہو جاتا ہے کہ وُہ اپنے برس ذرا شتابی سے گذار لیتا ہے ۔۔۔ میں اپایاندی تک تو ٹھیک تھا پر اُس کے پار آیا تو مجھے کُچھ ہوا ۔۔۔ اور اُس کے بعد مین کہاں تھا اور کیوں تھا اور کس حال میں تھا اور مجھے کیا کاٹا اور میرے جُثّے میں کونسے زہر گئے میں نہیں جانتا ۔ نہ میں سویا نہ میں جاگا ۔ نہ میں راستے پر چلا نہ بھٹکا اور بس میں اُسی حالت میں تھا جب میں نے آسمان پر دھوئیں کی ایک لکیر دیکھی اور میں نے جانا کہ یہ پکلی کے آوے کا دھواں ہے اور میں نے ایک ہلکی ٹھنڈ اپنے اندر چلتی محسوس کی تو میں نے جانا کہ میرا دریا آس پاس ہے اور پھر تم وہاں آوے کے قریب تھے اور میں تمہارے پاس گیا اور پُوچھا کہ ۔۔۔"

"تم نے پُوچھا تھا ۔۔۔ ٹھہرو میں بتاتا ہوں" ڈور گا نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا "تم نے پُوچھا تھا کہ یہ پاروشنی کی بستی ہے؟"

"ہاں ۔۔۔ کسی ایک جگہ پر واپس آنے کے لئے چاہیے تم بُھوکے ہو اور تمہارے جُثّے میں زہر ہو اور تم مرتے ہو اور پیاس سے تمہاری زبان کڑکڑاتی ہو ۔۔۔ تم واپس آتے ہو تو کسی ایک کے لئے ۔۔۔"

"تو پھر تم ابھی تک بستی میں کیوں نہیں گئے ۔۔۔ پاروشنی سے کیوں نہیں ملے؟"

"اُس نے کبھی میرا پُوچھا؟!"

"وُہ کسی سے کیا پُوچھے ۔۔۔ وُہ سارے بھید آپ جانتی ہے ۔۔۔۔۔ پر جب وُہ مجھے دیکھتی تھی تو وُہ سارا سفر دیکھتی تھی جو میں نے اور تم نے موہنجو سے یہاں تک کیا اور اُس جدائی کو دیکھتی تھی جو اُس کے جُثّے میں پلتی تھی ۔۔۔"

"اُس سویر ۔۔۔ میں نے اُسے دیکھا تو اُس کا پیٹ ساتھ لگا ہوا تھا تو میرا مُنہ کُھل گیا کہ اِسے کیا ہوا ۔۔۔ اُس کی رنگت پھیکی تھی اور اُس کی آنکھوں میں جیسے بے انت پکھیرو ڈوبتے تھے ۔۔۔ تب مُجھے سمرو نے بتایا ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ وُہ رویا نہ تھا"

"میں نے اُسے بہت کہا کہ یہ تو کوئی مُشکل بات نہیں ۔۔۔ ایک عورت کئی بچّے جَنتی ہے اگر ایک ہوا اور رویا نہیں تو کیا ہوا ۔ پر وُہ مانتی نہ تھی اور وُہ مجھ سے الگ ہو گئی جیسے میرا قصور ہو اور وُہ سمرو سے بھی پرے ہو گئی ۔۔۔ جیسے دریا کے بیچ کوئی ٹیلا ہو جو کناروں سے دُور ہو گیا ہو ۔۔۔ تب میں یہاں سے چلا گیا ۔ میں یہاں کیا رہتا ، میں نے پوٹلی میں آٹا باندھا ، چھپر سے باہر پاؤں رکھا اور جہاں اُس پاؤں کا نشان تھا اُس مٹّی کو بھی پوٹلی میں سنبھالا اور چلا گیا ۔۔۔ پتہ نہیں یہ کتنے برس پہلے کی بات ہے ۔۔۔ کتنے برس ہو گئے ؟"

"بہت سارے ۔۔۔" ڈور گا کی آواز میں تھکاوٹ تھی ۔ وُہ بھی بڑا بوڑھا ہو گیا تھا ، اتنے برسوں میں وُہ ابھی گھاس پھونس تو نہیں ہوا تھا ۔ وہ کام کاج کا تھا ۔ آوے کا سارا کام اُسی نے سنبھال رکھا تھا ۔۔۔ اور چکلی کا بھی ۔۔۔

"اِس بات کو چھ سات برس تو ہو گئے ۔۔۔ اور اِن برسوں میں مَیں نے تمہارا بہت دھیان کیا ۔۔۔ تم اپنے لئے سانس لینے والے پہلے بندے تھے جس کے ساتھ میں نے بات کی ، جیسے میں نے پانی کو پہلی بار دیکھا تھا اور موہنجو کو پہلی بار دیکھا تھا اور باہر کی دنیا کو پہلی بار دیکھا تھا تو تم پہلے بندے تھے جو اپنے لئے سانس لیتے تھے ۔۔۔ تم اگر مجھے ساتھ نہ لاتے تو میں اب تک اُسی دیوار کے اندر رہتا ، جُھکا ہوا جنور ہوتا ۔۔۔ تم کیا کرتے رہے اتنے ڈھیر برس ؟"

"رِگ وید میں آیا ہے کہ اُنہوں نے آہی کو موت کے گھاٹ اُتارا جو اُن کا وَیری تھا اور سات دریاؤں کو جاری کیا اور اُنہیں ایسے کھولا جیسے وُہ رُکے ہوئے فوارے تھے ۔۔۔ میں ان دریاؤں کے کنارے آباد بستیوں میں رہا ۔ میں نے وہاں اپنا بیج بویا ۔۔۔"

"رِگ وید ؟" ڈور گا نے مُنہ کھولا ۔

"یہ اُن کی کہانی ہے جو اُدھر آ چکے ہیں اور اب دھیرے دھیرے وہاں سے نیچے اُترتے ہیں کہ یہاں کا سبزہ اور ہریالی اور پانی تو وُہ پی چکے اور کھا چکے ۔۔۔"

"کیا یہ ساتوں سندھو ہیں ؟"

"نہ ۔۔۔ الگ ہیں ۔۔۔ اور اُن میں سے ایک گھاگھرا ہے جسے وُہ اب سرسوتی ہی بولتے

ہیں اور اسکنی جسے وُہ چندر ا بھاگا کہتے ہیں ۔۔۔ وا تستا ، ارجکیا ۔ شُتدری ۔ پاروشنی جسے ایراوتی بھی بتاتے ہیں اور بڑا سندھو ۔۔۔ اور میں نے سب کا پانی پیا اور اس پانی کا سواد ایک جیسا ہے ۔ اِن میں کُھلی مٹّی جب مُنہ میں جاتی ہے تو تالو اِسے جانتا ہے ۔۔۔ میں ہری یوپیا میں بھی رہا ۔۔۔"

"یہ ہری یوپیا وُہی ہے جہاں تم موہنجو سے پہلے جانا چاہتے تھے ۔۔۔ پر نہ گئے ؟"

"ہاں ۔۔۔ بس یہ جانو کہ یہ دونوں جُڑواں ہیں ۔۔۔ ایک جیسے ہیں ۔۔۔ بس دریاؤں کا فرق ہے ۔۔۔ میں جب پہلی بار ہری یوپیا میں گیا تو یُوں لگا جیسے اپنی پُرانی بستی میں جاتا ہوں ۔ میں جانتا تھا کہ گھر جو ہیں وُہ پہاڑ پاسے کی سیدھ میں ہیں اور لمبائی میں ہیں ۔۔۔ ان کی گلیاں چھ چھ کَرو ہوں گی ۔ درمیان میں بچاؤ کی عمارت ہو گی ۔ چوک میں چوکیدار کا چھپر ہو گا اور گھر کئی کئی کوٹھوں کے ہوں گے جن میں نہانے کے کمرے ہوں گے تالاب ہوں گے اور تندور ہوں گے ۔۔۔ اور پکّی گلیوں کے بیچ نالیاں اینٹوں سے ڈھکی ہوں گی ۔۔۔ تب وہاں کے لوگوں نے پُوچھا کہ تم پہلے سے کیسے جانتے ہو تو میں نے کہا کہ میں موہنجو دیکھ چکا ہوں اس لئے ۔۔۔ اور اُنہوں نے بھی یہی کہا کہ موہنجو اور ہری یوپیا ایک ہیں ۔۔۔ یہ مُہریں برتن اور مٹّی کے کھلونے پہلے گھاگھرا سے ادھر آئے اور پھر ادھر سے موہنجو گئے ۔۔۔ ہری یوپیا کی بستی کے باہر کنک کُوٹنے اور پیسنے والوں کے گھر ہیں ۔۔۔ یہ خاص لوگ ہیں جن کو وُہ واہیک کہتے ہیں ۔۔۔"

"میں انہیں جانتا ہوں ۔۔۔"

"کیسے ؟ ۔۔۔" وُہ اچنبھے سے بولا ۔

"وہ لوگ بے انت برسوں سے ۔۔۔ جب سے ہری یوپیا ہے تب سے کنک پیستے ہیں اور وہاں گھروں کے اندر تاریکی میں وُہ جُھکے ہوتے ہیں بڑی بڑی چکیوں کے اُوپر اور وُہ وہاں سے اُٹھ نہیں سکتے ۔ اُن میں سے کئی ہیں جو آلتی پالتی مارے اپنی چکّی کے آگے اتنی مدت سے بیٹھے ہوئے ہیں کہ اب وہ اپنی ٹانگوں کو سیدھا نہیں کر سکتے اور اُن کو اٹھا کر ادھر ادھر رکھا جاتا ہے ۔۔۔ اُن کی ٹانگیں جُڑ گئی ہیں ۔۔۔ یہ بھی جھکے ہوئے لوگ ہیں میری طرح کے ۔۔۔ ہر بستی میں ایسے لوگ ہوتے ہیں ۔۔۔"

"میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جہاں وُہ کنک پیستے ہیں وہاں سے گذریں تو چکیوں کے پاٹ گرر گرر ایک گہری گُونج کے ساتھ چلتے ہیں اور انہیں یہی لوگ چلاتے ہیں اور وہاں سے عمارت

کے اُوپر جو روشنی کے چوکور سوراخ ہوتے ہیں اُن میں سے سفید آٹا ایک گھنے اور بھاری بادل کی طرح باہر آتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اندر وُہ کتنا گھنا اور بھاری ہو گا اور اُن کے سانسوں میں جاتا ہو گا ۔۔۔ اگر وُہ سانس لیتے ہیں تو ۔۔۔ پر میں اندر نہیں گیا ۔۔۔"

"تم جب ہری یوپیا سے نکلے تو پیچھے مڑ کر دیکھا ؟"

"کیوں پُوچھتے ہو؟"

"شائد وہاں بھی کوئی ڈور گا ہو جو تمہارے پیچھے آتا ہو اور پھر گم ہو گیا ہو یا پکڑا گیا ہو اور اُسے پھر سے اُدھر اُس بڑے گھر میں لے گئے ہُوں جہاں سے وُہ گہری گُونج آتی ہے اور جن کے سوراخوں میں سے آٹے کا سفید بادل نکلتا ہے اور ۔۔۔ تمہیں پیچھے مڑ کر دیکھ لینا چاہئے تھا"

"اگر وُہ وہاں ہوتا تو تمہاری طرح مجھے پیچھے سے آ کر چمٹ جاتا ۔" ورچن مسکرایا ۔۔۔ رُتوں نے جو دُور دیسوں میں بسر ہوئیں اُس کے مہاندرے کو کُملا دیا تھا ۔ ڈور گا دوگنے برسوں کا تھا ، جھکا ہوا تھا پر کُملایا ہوا نہ تھا "ڈور گا جب میں نے پکلی کے آوے کا دھواں آسمان پر دیکھا تو جانا کہ میں اپنوں میں آ گیا ہوں پر اُس سمے دریا کے اونچے کنارے پر ماتی کے تینوں اپنی بیل گڈ کو دگڑ دگڑ دوڑاتے جاتے تھے اور اُس کے پہیے بہت دُھول اڑاتے تھے ۔۔۔"

"اِس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے ؟"

"نہیں ہے پر دُھول کُچھ زیادہ تھی ۔ مجھے پتہ ہے کہ اگر گڈ کے آگے جُتے بیل چاہے جتنا مرضی تیز دوڑیں پر اُن کے سُموں اور پہیوں سے اُڑتی دُھول کہاں تک جاتی ہے ۔۔۔ ایک خاص بُلندی تک پر اُس سے اوپر نہیں ۔۔۔ پر یہ بہت اوپر تھی ، آسمان تک پھیلتی تھی ۔"

"شائد اس لئے کہ مینہ کم ہوا ہے ۔ تمہارے جانے کے بعد مینہ بہت کم ہوا ہے" ڈور گا نے گردن کھجلاتے ہوئے اوپر دیکھا "دیکھو آسمان خالی ہے ۔ باجرے اور تل کا بیج تو کب کا سڑ چکا ، بستی میں اب ایک دانہ بھی نہیں ۔۔۔ بس اسی لئے دُھول بیٹھتی نہیں اُڑتی رہتی ہے"

"اور بڑے پانی؟"

"وُہ آتے ہیں پر ٹھہرتے نہیں ۔ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں"

گھاگھرا کے دُور تک منظر آتے پاٹ پر سُرخی تھی جو سیاہی میں ملتی تھی اور گُھل گُھل کر پھیلتی تھی ۔ ہوا میں ایک سفید پکھیرو پَر تولتا تھا پر پانی میں نہ جاتا تھا بس اڑتا تھا پانی کو تاکتا تھا اور پَر تولتا تھا ۔ گھاٹ پر سروٹ کی تین کشتیاں ہچکولے کھاتی تھیں اور بڑی گلی میں ٹھہری ہوئی دُھول شام کی تاریکی کو مدھم کرتی تھی ۔

"می آؤں ۔ می آؤں" مور کی آواز تو آئی پر ایسے جیسے سَر میں وہم آتے ہیں ، مدھم اور مرتے ہوئے ۔

ورچن اٹھا اور مشقت سے قدم رکھتا ہوا کنارے پر چڑھنے لگا ۔ بیل گڈ کے پہیوں کے نشان ابھی موجود تھے ۔

بھکشو ٹیلا اپنی جگہ بدل چکا تھا ۔ اب وُہ راستے سے خاص دور جا کر بیٹھا تھا ، پر تھا اتنا ہی جتنا چھ سات برس پہلے تھا اور جتنا تب تھا جب اس بستی میں پہلی بار کنک کُوٹی گئی ۔ لِنگ ٹیلے پر کسی نے ایک دیا جلایا تھا جس کی مدھم روشنی میں لِنگ کا سایہ ڈولتا تھا اور بڑا ہو کر آسمان کو چُھوتا تھا ۔ اُس کے پاس گیندے کے چند مرجھائے ہوئے پُھول پڑے تھے ۔۔۔ بستی کے اندر ہونے لگا تو چند کتّے غرّاتے ہوئے آگے آئے پر ورچن شانت رہا ۔ نہ بولا نہ کُچھ اُن سے کہا اور وُہ اُس کی بُو جان گئے اور دُمیں ہلاتے پیچھے ہو گئے ۔ وُہ جو چھ برس سے کم تھے وُہ بھونکتے رہے تھوتھنیاں لمبی کر کے غرّاتے رہے پر اُنہوں نے جب اپنے سے بڑوں کو دُم ہلاتے چاؤں چاؤں کرتے دیکھا تو جانا کہ یہ بندہ اِسی بستی کا ہے اور وُہ بھی چُپ ہوئے اور پیچھے ہو گئے ۔

گھر کے اندر اندھیرا تھا ۔۔۔ پر پانی گرنے کی آواز آتی تھی ۔۔۔ اور کنویں والے کمرے سے آتی تھی ۔ پاروشنی پانی سے بھرا اور چھلکتا ہوا بوکا دونوں ہاتھوں سے اٹھائے سر پر ڈالنے کو تھی ۔۔۔ اُس نے ورچن کو چھپر تلے کھڑے دیکھا اور اُس کے اندر اتنے برسوں بعد ایک بار پھر مور بولا "۔۔۔ می آؤں ۔ می آؤں ۔"

پیڑھی پر بیٹھی پاروشنی نے گھٹنوں پر دونوں کُہنیاں ٹکا کر سر جھکایا اور چولہے میں پھونک مار کر اُپلوں کو دُھکانے کا جتن کیا پر اُن میں سے سفید دھواں ایسے اُٹھا جیسے اُن پر پانی ڈال دیا گیا ہو اور وُہ دُھواں چھپر تلے مٹّی کے تھڑے پر لیٹے ورچن کے نتھنوں میں گیا تو اُس نے اِسے اپنے اندر تک کھینچا جیسے وُہ بس اِسی دُھوئیں کی آس میں سات ندیوں کے آس پاس کی بستیوں سے لوٹ آیا تھا ۔۔۔ صرف اسی اُپلوں کے دھوئیں کے لئے جو اُس کے نتھنوں میں جاتا تھا تو بتاتا تھا کہ میں پاروشنی کے چُولہے میں سے اٹھا ہوں اور وُہ میرے سامنے پیڑھی پر ایسے بیٹھی ہے کہ اُس کے کُولہے اُس پر بھار ڈالتے ہیں اور وُہ جم کر بیٹھی ہے ۔

وُہ ہری یوپیا سے سیدھا ادھر نہیں آیا تھا ۔ وُہ جدھر گیا تھا اُدھر کا بھید اُس نے کسی کو نہیں بتایا تھا ۔ چھ سات برس کی مُدت بہت مُدت ہوتی ہے اور کہیں ٹِک کر ہی گذرتی ہے ۔۔۔ وُہ

گھاگھرا کے اوپر اُس بستی میں تھا جسے کالی بنگن بولتے ہیں ۔۔۔ یہ بستی بہت بڑی تھی اور وہاں کے رہنے والے انہیں نہیں جانتے تھے جو اُسی دریا کا پانی پیتے تھے ۔۔۔ وہاں بھی پکی نالیاں تھیں ۔ پانی رکھنے کے لئے پکے گڑھے تھے پر وہاں کے لوگ موہنجو اور ہڑی والوں سے زیادہ نرم اور ملوک تھے ۔ وہاں بھاگ دوڑ نہ تھی ۔ اور سب سے بڑی بات جو ورچن کے پاؤں روکتی تھی وُہ یہ تھی کہ وہاں ابھی اونچی ناک والے نہیں گئے تھے ۔ یہ نہیں کہ وُہ اُسے جانتے نہیں تھے پر جیسے وُہ ہڑی اور موہنجو میں تھے ، مال ڈنگر چراتے ہوئے وُہ پکے گھروں سے آ گئے تھے ویسے وُہ کالی بنگن میں نہ تھے ۔۔۔ وہاں ورچن ٹھہرا اور وہاں منڈی بھی تھی ۔ اُس کے دو بچے ہوئے اور وُہ دھیرے دھیرے جڑیں پکڑنے لگا ۔ پھر ایک شام وُہ کالی بنگن کی بڑی گلی میں گھومنے کو نکلا ۔۔۔ اُسے اپنی بستی سے نکلے چھ برس سے اوپر ہو چکے تھے ۔۔۔ اُس کو گھاگھرا میں ڈالے ہوئے چھ برس سے اوپر ہو چکے تھے جو رویانہ تھا ۔ وُہ جانتا نہ تھا ، کہ وُہ اُس کا تھا یا سمرو کا اور پھر بھی اُس کے لئے اُس کی آنکھیں بھیگتی تھیں تو اُس سیاہی میں گھلتی شام میں اُس کے نتھنوں میں اُپلوں کے دھوئیں کی بُو آئی ۔۔۔ کالی بنگن کے تنوروں میں بالن کے لئے من چھٹی ڈالتے تھے پر جانے کیوں آس پاس کسی تنور میں یا شائد چُولہے میں اُپلے سُلگتے تھے اور دُھواں دیتے تھے اور وُہ دُھواں ورچن کے نتھنوں میں آیا تو وُہ پھر واپس نہ گیا اور وُہیں سے کالی بنگن کی بڑی گلی سے سیدھا باہر نکلا اور کھیتوں میں بیٹھے اپنے کو خالی کرتے لوگوں سے پرے ہوتے ہوئے وُہ گھاگھرا کے کنارے اُوپر کی طرف جانے لگا ، جدھر سے دریا آتا تھا اور جدھر اُس کی بستی تھی ۔۔۔ اور اب پاروشنی چُولہے میں رکھے اُپلوں کو پھونکیں مار مار کر دُھکاتی تھی اور اُن کا دُھواں ورچن کے نتھنوں میں دُھوم مچاتا تھا ۔

"تم سمرو سے ملے ؟" ۔۔۔ وُہ سر اُٹھا کر بولی ۔۔۔ اور یہ پہلی بات تھی جو اُس نے کہی ۔ یہ پہلی بات تھی جو اُس نے اتنے برس بعد اُس سے پُوچھی کہ تم سمرو سے ملے ۔۔۔ وُہ جب آیا تھا تو گھر کے اندر تاریکی تھی پر پانی گرنے کی آواز آتی تھی ۔ پاروشنی پانی بھرا بوکا دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے سر پر ڈالنے کو تھی تو اُس نے اُسے چھپر تلے کھڑے دیکھا تھا ۔۔۔ ورچن آپ ہی آپ مسکرایا کہ پاروشنی اب بھی پانی بنا نہیں رہ سکتی تھی ، پانی اُسے جانے کیا دیتا تھا اور پھر اُس نے بوکا زمین پر رکھا ، اپنے آپ کو لیڑوں کے اندر کیا اور بنا کچھ کہے ، کچھ پُوچھے وُہ چُولہے کے آگے پیڑھی پر بیٹھ کر اُس کے لئے اَن پانی کا بندوبست کرنے لگی تھی ۔۔۔ اور اب اُس نے پہلی بار مُنہ کھولا تھا اور پہلی بات کہی تھی ۔۔۔ تُم سمرو سے ملے ؟

"نہیں ۔۔۔ ابھی نہیں ۔۔۔ میں جب ادھر آیا ہوں تو میرے بالوں میں ریت اور مٹی تھی اور میرا پیٹ پچکا ہوا تھا ۔ ماس پر جُھریاں تھیں اور میری آنکھیں کہیں اور تھیں دیکھتی نہ تھیں ۔ میں اپایاندی تک تو ٹھیک تھا ۔۔۔ کبھاندی بھی میں نے پار کر لی ۔۔۔ اور پھر مجھے کُچھ ہوا ۔۔۔ اور جب میں نے پکلی کے آوے کا دُھواں دیکھا ہے تو میں ایسا ہی تھا اور ڈور گا نے مجھے اپنے پاس رکھا ۔۔۔ مُجھے ادھر آئے کئی دن ہو گئے ہیں پر میں آج ادھر آیا ہوں ۔۔۔ میں ابھی سمرو سے نہیں ملا"

"وُہ اپنے چھپر میں ہوتا ہے اور وُہ تمہارے لئے بہت دُکھی ہوتا ہے ۔ جب وُہ سوتے میں دیکھتا ہے تو کئی بار تمہیں دیکھتا ہے ۔۔۔ تم کہاں تھے ؟"

اُپلوں کے دُھوئیں کے لئے اور اس سوال کے لئے وُہ لوٹا تھا کہ تم کہاں تھے ۔۔۔

اُس نے اپنے سفر کے دن رات اُسے سنائے ۔۔۔ وُہ سواد جو اُس کی زبان تک آئے اور اُس کے کے تالو میں پُھوٹے اور وُہ رُتیں جو اُس کے پِنڈے پر بیتیں اور وُہ تھکاوٹ جو ہر مسافر کے پاؤں میں سارا وقت بیٹھی رہتی ہے جب وُہ گھر سے باہر ہوتا ہے ، چاہے آرام سے ہو مزے سے ہو اور کھاٹ پر پڑا رہے تب بھی وُہ تھکاوٹ اُس کے پاؤں میں بیٹھی رہتی ہے اور وُہ جاتی ہے تو اُس سمے جب وُہ واپس آتا ہے اور ایک گھر کے اندر پاؤں رکھتا ہے تو گھر سے باہر اور درمیان وُہ چلی جاتی ہے ۔ تو ورچن کے پاؤں بڑے نرم اور ہلکے ہو رہے تھے اور وُہ باتیں کر رہا تھا پچھلے برسوں کی جو اُس نے بستی سے دُور بتائے ۔

"بستی میں دُھول بہت اوپر تک جاتی ہے ۔۔۔" آخر میں ورچن نے کہا ۔

"کس بستی میں ؟" پاروشنی سبز توریاں ہانڈی میں ڈال رہی تھی تو یہ سُن کر کہ بستی میں دُھول بہت اوپر تک جاتی ہے وُہ ٹھٹھکی اور بولی ۔

"اِس بستی میں ۔۔۔ جسے ہم نے آج تک کوئی نام نہیں دیا ۔۔۔ ڈور گا کہتا تھا مینہ بہت کم آتا ہے اس لئے ۔۔۔"

پاروشنی چُپ رہی اور ڈوئی سے توریوں کو ہلاتی رہی ۔ ہانڈی نویں نکور تھی اور اُپلوں کا دُھواں اُسے چاٹ چاٹ سیاہ کر رہا تھا ۔

"میں تو کہہ چکا اب تم کہو ۔۔۔" اُسے چُپ پا کر ورچن نے کہا ۔

"میں ویسی ہی رہی جیسی تھی ۔۔۔ سویرے بستی کی جھجھروں اور مٹکوں میں پانی بھرتی تھی ۔ اپنا کھیت کھودتی تھی ، سب لوگوں کے ساتھ اُوپر دیکھتی تھی کہ مینہ برسے ۔۔۔ خالی

آسمان دیکھتی تھی ۔ تمہیں پتہ ہے کہ باجرے کا بیج ختم ہو گیا ہے ۔۔۔ ہم کوئی سنبھال کر تو رکھتے نہیں تھے ۔ ایک بار بویا اور دوسری بار کاٹتے ہوئے اگلی بار کے لئے رکھ لیا ۔۔۔ تو وُہ مٹی میں دبا رہا اور پانی کے بغیر سُوکھ سڑ گیا ۔۔۔ دُھروا کو ہلکائے کُتوں نے کاٹ لیا جو کسی سیہے کے پیچھے رُکھوں سے نکل کر ریت کی طرف نکل گئے تھے ۔۔۔"

"دُھروا گیا ؟"

"نہیں اُس نے اپنے کاٹے پر آک کا دودھ نچوڑا اور اب ٹھیک ہے ۔"

"وُہ خود بھی تھوڑا سا ہلکایا ہوا ہے ۔۔۔" ورچن مسکرایا پر پاروشنی دھیرے دھیرے باتیں کرتی رہی "اور ڈورگا اچھا بھلا ہوتا ہے اور چونک جاتا ہے اور کان پر ہتھیلی جما کر کہتا ہے ، سُنو سُنو ۔۔۔ اور ہم کچھ نہیں سُن پاتے لیکن وُہ کہتا ہے کہ میں سُنتا ہوں اور تم مُجھے سُن کر بتاؤ کہ میں کیا سُنتا ہوں ۔۔۔ اور چیوا ابھی تک رُکھوں سے نہیں لوٹا ۔۔۔ مامن ماسا کے پاس ہے ۔۔۔"

"جانے وُہ ہیں بھی یا نہیں ۔۔۔"

"وُہ ہیں ۔۔۔" پاروشنی یقین سے بولی "وُہ تمہاری اور میری طرح ہیں ۔۔۔ میں جب بھی جھیل کو جاتی ہوں تو وُہ رُکھوں میں ہوتے ہیں ۔۔۔ اب وُہ نیچے نہیں آتے ، مجھ سے بات نہیں کرتے پر میں جانتی ہوں کہ وُہ وہاں ہیں ۔۔۔"

"جھیل کو جاتی ہو؟"

"بہت کم ۔۔۔ وہ سُوکھ گئی ہے "

اور ورچن کی آنکھوں میں وُہ رات گہری ہوئی جب پاروشنی کے اندر گھنے اندر جہاں نم تاریکی تھی وہاں کچھ بولتا تھا اور اُن دونوں پر پُورا چاند پڑتا تھا اور وُہ رُکھوں کے بیچ جھیل کے پاس اُس کلراٹھی زمین پر جہاں کبھی جھیل تھی لیٹے تھے اور وُہ وہاں تھے جہاں پرندے مرنے کے لئے آ جاتے تھے اور اُن کے جسموں تلے پرندوں کی ہڈیاں کڑکڑاتی تھیں اور پاروشنی کلراٹھی زمین پر ایسے پڑی تھی جیسے پتّوں اور ٹہنیوں والا ایک سالم رُکھ وہاں گر پڑا ہو ۔۔۔ وہ پتے بُوٹے جو پکلی نے اُس کے پنڈے پر اُلیکے تھے ۔۔۔

پاروشنی ڈوئی چلاتے ہوئے رُکی اور اُدھر دیکھا جہاں ورچن تھڑے پر بیٹھا تھا اور وُہ بہت کم دکھائی دیتا تھا ۔ اُپلوں کی روشنائی پاروشنی کے مُہاندرے کو تو لشکاتی تھی پر وہاں سے مُشکل سے ویہڑے تک جاتی تھی اور تھڑے پر بیٹھے وُرچن تک نہ پہنچتی تھی ۔ تاریکی بہت گہری تھی

اور اس میں ایک گرم بے چینی تھی ۔۔۔ پاروشنی نے ورچن پر نظر ڈالی اور وہ جان گئی کہ اُس کی آنکھوں میں کیا ہے اور وُہ کہاں ہے ۔۔۔ اور وُہ اُس کے پنڈے پر اُلیکے بیل بوٹوں میں ہے ۔۔۔ اور وُہ یہ بھی جان گئی کہ وہاں کسی اور بستی میں وُہ اسی طرح تھڑے پر بیٹھ کر اَن پانی کی اُڈیک میں کسی ایسے ہی مُہاندرے کو دیکھا کرتا تھا جس پر چولہے میں جلنے والی آگ کا لشکارا پڑتا تھا ۔۔۔ اور وُہ اُسے چھوڑ کر آ گیا تھا ۔

اور اُس سمے مور بولا "می آؤں ۔ می آؤں" پر ایسے بولا جیسے آخری بار بولتا ہے اور اُسے صرف ورچن اور پاروشنی نے سُنا ۔

"یہ اب بھی ہے ؟" ورچن اندھیرے میں بولا ۔

"ہاں ۔۔۔ پر اب اس کے پَر جھڑنے لگے ہیں اور اس کی جھاڑو جھالر کے رنگ پھیکے ہوتے جا رہے ہیں ۔ پچھلی بار جب میں ادھر گئی تو میں پاس سے گذر گئی پر اُس نے مجھے دیکھا نہیں ۔۔۔ اُس کی آنکھیں بوڑھی ہو کر کم دیکھتی ہیں ۔۔۔ اور تمہیں پتہ ہے ڈوبو مٹی بھی اب پِیڈی ہو گئی ہے ۔ ایک روز میں نے پندرد کو اُس پر چلتے دیکھا ۔۔۔"

"تُو بھی اُس پر چلی ؟" ورچن اچنبھے میں بولا۔

"نہیں ۔۔۔ میں نے پاؤں کا بھار ڈال کر دیکھا ہے کہ وُہ پِیڈی ہو چکی ہے پر مُجھ میں ہمت نہیں ہے ۔۔۔ میں نے اُس کے درمیان جو راستے بنا رکھے ہیں اُن پر چلتی ہوں ۔۔۔ میں اُس پر نہیں چل سکتی جس میں میرے سامنے کئی جنور اور بندے دھیرے دھیرے دھنس کر نیچے ہوئے اور گم ہوئے ۔ اور کیا پتہ وُہ کہیں سے پِیڈی ہو چکی ہو اور کہیں سے ابھی ڈوبو ہو ۔۔۔ اُوپر سخت دکھائی دے اور نیچے سے وہی گہرا کیچڑ اتنا کہ رُکھ ڈُوب جائے اور اُس کا ٹہنی پتہ بھی گم ہو جائے تو پتہ نہ چلے ۔۔۔"

ورچن نے یہ نہ پُوچھا کہ ڈوبو مٹی جو تب سے تھی جب سے رُکھ تھے ، بستی اور گھاگھرا تھے تو اب یہ پِیڈی کیسے ہو گئی کیونکہ یہ تو ہر کسی کی سمجھ بُوجھ میں آتا تھا کہ ڈوبو مٹی پر ہر برس بڑا پانی آتا تھا اور ٹھہرتا تھا اور اتنی دیر ٹھہرتا تھا کہ سارے برس میں وُہ جتنی خُشک ہوتی تھی اتنی پھر گیلی ہو کر نرم کیچڑ میں بدلتی تھی ۔ تو اگر وُہ پانی اب اُس تک پُہنچے ہی نہیں تو وُہ ڈوبو کیسے رہے ۔۔۔ وہ تو سُوکھے گی اور پھر مینہ بھی کم ہوا تو اور خشک ہو گی ۔۔۔ اور پندرد ہرن اُس پر چلتا تھا ۔

ہانڈی پک گئی تو پاروشنی نے اُسے اٹھا کر برابر کے خالی چولہے پر رکھ دیا ۔ اور پھر دہکتے

ہوئے اُپلوں پر مٹی کے توے کو جما دیا --- یہ توا یوں تو پکلی نے پکا کر دیا تھا پر چولہے پر چڑھنے سے اب یہ سُرخ پتھر کی طرح لگتا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد پاروشنی نے توے کو اُنگلی سے چھوا اور پھر سی کر کے پیچھے ہو گئی ۔ وہ اتنا گرم ہو چکا تھا کہ اُس پر روٹی پک سکے ۔ وُہ چاہتی تو بستی کے تنور پر جا سکتی تھی پر وُہ آج جانا نہیں چاہتی تھی ۔ ورچن دُور سے ہانڈی کے گول تھلے کو دیکھتا رہا جس پر چھوٹی چھوٹی چنگاریاں چمک کر بجھتی جاتی تھیں --- بہت برسوں پہلے جب وہ ایسے ہی روٹی کے لئے مُنہ کھولے بیٹھا رہتا تھا تب اُس کی میّا جب ہانڈی پکاتی تو بعد میں دیر تک اُس کا تھلا اسی طرح تاریکی میں جگمگاتا رہتا --- اور وُہ اُسے اچنبھے سے تکتا کہ یہ کیسے ہوتا ہے ۔ اور آج بھی وُہ اِسے تاریکی میں چمک کر بجھتے دیکھتا تھا جیسے ہانڈی کے سیاہ تھلے میں ایک تاروں بھرا آسمان چمک کر بجھ رہا ہے --- اور وُہ اِسے اچنبھے سے تکتا تھا --- میّا اور پاروشنی ایک ہیں ؟

سبز توریوں میں رُت بدلنے کا سواد اور سندیسہ تھا اور ورچن نے اُن کی تازگی کو دیر تک مُنہ میں رکھا --- کھانے کے بعد وُہ اُس کے قریب پیڑھی پر بیٹھا رہا اور اُس کے وہاں ہونے کو اپنے پاس ہونے کو محسوس کرتا رہا ۔ وُہ بھی پیڑھی پر تھی اور اُس کے کُولہے اپنا بوجھ ڈالے اُسے ایسے رُکھ کی طرح کرتے تھے جس کا تنا نیچے سے بڑا ہوتا ہے اور سارے کو سہارتا ہے --- چولہے میں اُپلے سفید راکھ تلے مدھم پڑ رہے تھے اور دریا کی طرف سے ٹھنڈک ہولے سے چلتی آتی تھی ۔

"اب تو رہے گا یا پھر جائے گا؟"

"میں نہیں جانتا ---" ورچن جُڑے ہوئے گھٹنوں سے تھوڑی اُٹھا کر بولا "میں کوئی من مرضی سے تھوڑا جاتا ہوں --- میری مرضی تو ادھر تیرے پاس ہے --- ادھر اِس چولہے کے پاس جس میں سُلگتے اُپلے تیرے مہاندرے کو ایسے لشکاتے ہیں جیسے بادلوں کی چمک سے کالے ہرن کا جُسّہ لشکتا ہے --- پر میں اپنے آپ میں نہیں ہوتا اور نکل جاتا ہوں ، جیسے ماسا گیا ، چیوا گیا --- وُہ بھی من مرضی سے تو نہیں گئے اُنہیں جانا پڑا ہے ۔ میں بھی رہ نہیں سکتا ۔ میرے تلووں میں چیونٹیاں کروٹ لیتی ہیں کہ چل چل --- اور میں چل دیتا ہوں اور جب پہلی رات آتی ہے اور میں کسی اَن جانی مٹی پر لیٹتا ہوں اور اُس کی باس میرے اندر جاتی ہے اور پھر اُس آسمان کو دیکھتا ہوں جو دیکھا ہوا ہے پر وہاں سے کوئی اور لگتا ہے --- تو پھر میرے اندر بُلبلے چھوٹتے ہیں جیسے نیچے مچھلی ہو تو اُوپر پانی پر چھوٹتے ہیں اور پھر --- میں اُس بڑے جُثّے کا ایک حصّہ بن جاتا ہوں جو یہ سب کچھ ہے --- ہمارے آس پاس ، اُوپر اور نیچے ، آسمان مٹی تارے اور دریا اور سب کچھ جو اِن میں سانس لیتا ہے اور رینگتا ہے تو میں اُس بڑے جُثّے کا ایک حصّہ بن جاتا ہوں اور تب تک بنا رہتا ہوں جب تک وُہ مجھے اپنائے رکھتے ہیں --- اور پھر ایک ایسا سانس آتا ہے جو مُشکل آتا ہے اور اُس میں کہیں اُپلوں کا دھواں اور گھاگھرا کی ٹھنڈک تیرتی ہے اور پھر میں ایسے میں من مرضی کے بغیر اُس بڑے جُثّے سے اپنے آپ کو الگ کر لیتا ہوں اور اپنی بستی کی طرف لوٹتا ہوں ۔

"بندہ رُکھ تو نہیں جو ایک جگہ جڑیں پھیلا کر حیاتی ختم کر دے ، یہ تُو نے کہا تھا --- اگر سارے ایسے ہی کریں تو بستیاں کیسے آباد ہوں --- یہ تو اجڑ جائیں"

"بستیاں بندے نہیں اُجاڑتے ۔ ان کے سانس بھی ہماری طرح ہوتے ہیں ، جب تک آتے رہتے ہیں تو یہ آباد رہتی ہیں اور بند ہو جائیں تو اُجڑ جاتی ہیں --- ہاں ان کے سانس ہم سے کُچھ زیادہ ہوتے ہیں ۔"

"تُو اُسے چھوڑ آیا ؟"

"کسے ؟"

"اُسے --- جو میری طرح چولہے کے پاس بیٹھی تھی اور اُس کا مہاندرا اُپلوں کی روشنائی سے لشکتا تھا --- اُسے"

"ہاں ---"

پاروشنی اُٹھی اور اپنی تھکاوٹ کو سنبھالتی چھپّر تلے بچھے پرالی کے ڈھیر میں جا لیٹی ۔ ورچن نے اُس کی جانب دیکھنے کی کوشش کی پر وہاں صرف اُس کے پاسا پلٹنے سے جو پرالی چرمراتی تھی اُس کی آواز تھی ، نہیں تو تاریکی تھی ۔ وُہ پیڑھی سے اٹھا ، کمر پر ہاتھ رکھ کر سیدھا ہوا اور پھر تھڑے پر جا کر لیٹ گیا --- اُس نے اپنی لُونگی کے لڑ ڈھیلے کئے تاکہ آرام سے بھرے پیٹ کے ساتھ سانس لے اور سوئے --- وُہ پاروشنی کو دیکھ نہ سکتا تھا پر اُس کے کان ادھر لگے تھے اور پرالی چرمراتی تھی --- وُہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ پاروشنی جو پاسے پلٹتی ہے اُسے آنے کو کہتی ہے --- یا تھکاوٹ سے ایسا کرتی ہے ، پر جان نہ سکا ۔

"پاروشنی ---" اُس نے پُکارا اور اپنی آواز کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھا --- "میں اس بستی کے لئے نہیں تیرے لئے لوٹ کر آیا ---" اُس نے اندھیرے میں اُس کے پنڈے کو جانا اور یہ جانا کہ وُہ ویسی ہی ہے جیسے اُس رات رُکھوں کے بیچ ۔ کلراٹھی زمین پر جہاں کبھی جھیل

تھی ۔ تب وُہ اُسے دیکھ سکتا تھا اور اُس کے پِنڈے پر دیکھنے کو بہت کُچھ تھا ۔۔۔ وُہ اُس کے برابر لیٹنے کو تھا کہ پاروشنی اپنی ہتھیلی کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گئی اور سرگوشی کی "۔۔۔۔ وُہ اس کوکھ میں یُوں ٹھہرا جیسے ایک پہاڑی کھوہ میں ہرن آباد ہوا ۔ ٹھہرا اور پھر چلا گیا ۔۔۔ اور تم پُوچھتے ہو کہ وُہ کہاں ہے ؟"

ورچن کا پِنڈا جو دُھنخنے لگا تھا ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا ۔ اُس کا ہاتھ جہاں تھا رُک گیا ۔ اور وُہ ٹھیک طرح سے بول نہ سکا ۔ "تم بُھولتی نہیں ۔۔۔"

"نہیں ۔۔۔" پاروشنی کی آواز آئی اور اُس نے جانا کہ اُس کی آنکھیں سُوکھی نہیں ہیں ۔

"تم میں ابھی بہت گرمی ہے جس میں بہت کُچھ پھوٹے گا ۔۔۔"

"اور سُوکھے گا ۔۔۔ گرمی زیادہ ہو تو ڈوبو مٹّی بھی سُوکھ جاتی ہے ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ پر ۔۔۔ تم ایک بار پھر ویسی ہو جاؤ گی" ورچن کا ہاتھ آگے ہوا تو پاروشنی کا ہاتھ اُس پر آیا ۔۔۔ "نہیں ۔۔۔"

اور ورچن چپکے سے اٹھ کر تھڑے پر جا لیٹا ۔ پاروشنی اب پاسے نہیں پلٹتی تھی پر وہاں سے اُس کے دُکھ کی ایک ہلکی آواز کبھی کبھی آتی تھی اور ورچن کے اندر تک جاتی تھی ۔۔۔ اُسے اُس نے گھاگھرا میں نہیں اپنے اندر ڈبویا تھا ۔۔۔ وُہ چُپ رہا کہ وُہ اپنے روگ کے ساتھ اکیلی رہنا چاہتی تھی ۔۔۔

تھوڑی دیر بعد ورچن کا گلا سُوکھنے لگا ۔۔۔

"وساکھ کی راتیں اتنی گرم تو نہیں ہوتی تھیں ۔۔۔"

"پاروشنی تھوڑی دیر چُپ رہی جیسے اپنے آپ کو سنبھالتی ہو اور پھر بولی ۔۔۔ "ایسی ہی تھیں"

"نہیں ۔۔۔ ان برسوں میں بڑا فرق پڑ گیا ہے ۔ اتنی گرم نہیں تھیں"

"مجھے نہیں لگتا ۔۔۔"

تم ادھر تھیں اس لئے ۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ اس سمے ٹھنڈک ہوتی تھی اور جُسے کے لُوں دانوں کی طرح اُبھرتے تھے ۔۔۔"

"اور اس کے باوجود تمہیں پیاس بہت لگتی تھی ۔ تم ساری رات اٹھ اٹھ کر پانی پیتے تھے ۔۔۔ کیا تھا تمہارے اندر جو اتنا پانی مانگتا تھا ۔۔۔"

"مجھے ؟" ورچن سوچ میں پڑ گیا اور پھر اُس نے جانا کہ وہ ابھی اپنے روگ کے ساتھ ہے اور کہیں اور ہے "تم بھی تو پانی بِنا نہیں رہ سکتیں ۔ آج جب میں آیا ہوں تو ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔" پاروشنی کی آواز میں اب وُہ دُکھ کچھ کم تھا "مجھے پتہ تھا کہ تم آؤ گے اور یہ بھی پتہ تھا کہ تم رات کو اٹھ کر اپنے سرہانے ہاتھ پھیرو گے پانی کے لئے ۔۔۔ تو ذرا دیکھو اپنے سرہانے ۔"

ورچن نے وُہیں لیٹے لیٹے بازو سیدھا کر کے ہتھیلی پھیلائی تو وہاں تھڑے کے ساتھ ایک جھجھکی لمبی گردن تھی جو ٹھنڈی تھی ۔

"رات کو پیاس لگے تو پی لینا ۔ اب میں سوتی ہوں" ۔۔۔ اُس کے پاسا پلٹنے کی چرمراہٹ ہوئی اور پھر تھوڑی دیر بعد اُس کے کانوں میں پاروشنی کی چوڑی ناک اور کھلے موٹے ہونٹوں سے برابر کے نکلنے والے گہرے اور بھرے ہوئے سانس کی آواز آنے لگی ۔

پیاس مجھے تو نہیں سمرو کو بہت لگتی ہے ۔۔۔ اور یہ ابھی تک نہیں جان سکی کہ ورچن کون ہے اور سمرو کون ہے ۔

ورچن نے بھی پاسا پلٹا اور سونے کا جتن کرنے لگا ۔

اور پیاس بہت تھی ۔ یہ پیاس کا خواب تھا یا پیاس تھی ۔ اُس کا پِنڈا بھیگ رہا تھا اور ہاتھ گلے پر تھا جس کے اندر خشکی کی تریڑیں پڑ رہی تھیں ۔ زبان پر اور مُنہ میں اور گلے کے اندر ناگ پھنی سُوکھتی تھی اور کانٹے بکھیر کر اُسے بے جان کرتی تھی ۔ وُہ ڈری ہوا لگتا رہا کہ تھوک خشک ہو چکی تھی اور یہ پیاس اُس کے اندر پھیلی جاتی تھی اور وُہ سُکڑتا جا رہا تھا ۔ اُس کا مُنہ کُھلا ہانپتا تھا جیسے پیاسے جنور ہانپتے ہیں ۔۔۔ اور پھر وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا ۔۔۔

جھجھر اُس کے سرہانے دھری تھی ۔

سمرو نے جھجھر کی گردن پر ہاتھ دھرا ۔

ہاں اور پھر رات کی چُپ تھی ۔ چیتر کی چاندنی پھیکی پڑتی تھی اور وُہ دونوں بے سُدھ منہ کھولے ٹھنڈے اور تھکن سے ٹوٹتے سوتے تھے ۔۔۔ اور پاروشنی بازوؤں میں مُنہ رکھے اوندھی سوتی تھی ۔۔۔ تب پہلی بار جھجھر میں پانی کم ہوا تھا ۔۔۔ سارے جانتے تھے کہ وُہ ہر سمے سُوکھتا رہتا ہے ، اُس کا تن پانی بنا مرجھاتا رہتا ہے اور پانی سے بھری ایک جھجھر سارا وقت اُس کے پاس دھری رہتی ہے ۔۔۔ جھجھر کی گردن پر ہاتھ رکھتے ہی وُہ اُس کی ٹھنڈک سے جان جاتا کہ پانی یہاں تک ہے اور اتنا ہے ۔۔۔ اُس رات جب پاروشنی بازوؤں میں مُنہ رکھے اوندھی سوتی تھی اور سمرو کا گلا خشک ہوا اور اُس نے جھجھر کے گلے کے گرد انگلیاں لپیٹیں تو اُسے کچھ ہوا تھا ۔۔۔ شک ہوا تھا کہ سوتے وقت جہاں تک پانی تھا اب اُس سے ذرا نیچے ہے اور اُس نے پیا نہیں تھا ۔۔۔ یہ چھ سات برس پہلے کی بات ہے ۔

اور آج پھر اُسے کچھ ہوا ۔۔۔ پر یہ شک نہ تھا ۔۔۔ یقین تھا ۔۔۔ وُہ اب جانتا تھا ۔ جب وُہ سویا تھا تو جھجھر کے مُنہ سے پانی چھلکتا تھا اور اب وُہ نیچے جا چکا تھا ، گردن کے آدھے تک بیٹھ گیا تھا ۔ سمرو اُٹھ بیٹھا ۔۔۔ کیا پچھلے چھ سات برس میں پانی کم نہیں ہوا یا میں نے دھیان نہیں کیا اور اگر دھیان کیا ہے تو آج کیوں کیا ہے ۔۔۔ یہ پانی جو کم ہوتا ہے تو کیوں ہوتا

ہے ۔۔۔ اُس کے اندر پیاس تو تھی پر اب ڈر بھی سُوکھنے لگا ۔۔۔ ایک لمبا گھونٹ بھرنے کے بعد وُہ پھر لیٹ گیا ۔۔۔ پانی کم کیوں ہوتا ہے ۔۔۔؟ لیٹے ہوئے اُس نے بازو سیدھا کر کے انگلیاں جھجھر کی گردن کے گرد لپیٹ دیں جیسے وُہ جواب دے گی ۔۔۔ جھجھر کی مٹّی اُنگلیوں سے کہے گی کہ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ مُجھ میں پانی کیوں کم ہو جاتا ہے پر ۔۔۔ اُس نے نہیں بتایا ۔۔۔ اور تب سمرو پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری بستی میں اب گرمی بڑھتی جا رہی ہے اور وُہ پانی کو سُکھاتی ہے ۔ پر نہیں ۔ رُت کیسے بدل سکتی ہے ۔۔۔ وُہ پھر لیٹ گیا اور نیند کے نرم پیروں والے چُپ پکھیرو اُس کے آنکھوں میں اترتے چلے گئے ۔

اور تب وُہ نیند میں کہیں گیا ۔

اُس نے پانی کو دیکھا ۔

اُس کے آس پاس اوپر نیچے آنکھوں اور بالوں میں پانی ہے اور وُہ ڈوبتا ہے اور ابھرتا ہے اور ابھرتا ہے تو اوپر بھی پانی ہے اور نیچے بھی پانی ہے ۔ مُنہ میں اور گلے میں اور اُس کا سانس کم ہونے لگتا ہے اور پھر پانی اور نیچے ہوتا جاتا ہے ۔ اُس کے کندھوں سے نیچے کمر تک اور پھر گھٹنوں سے پاؤں تک اُترتا ہے اور پھر وہاں سے بھی مٹّی کے اندر جذب ہوتا ہے اور پھر پاؤں تلے اُس کی نمی رہ جاتی ہے اور پھر گرمی بڑھتی ہے اور سب کچھ سُوکھتا ہے ۔۔۔ وہ ایک ایسی جگہ کھڑا ہے جس کے دونوں طرف اونچے خشک کنارے ہیں جو دُور تک جاتے ہیں ۔ اِن کناروں کے بیچ ایک خشک راستہ ہے کئی کَرو چوڑا اور اُس پر وُہ کھڑا ہے ۔ پاؤں کے نیچے سُوکھی ہوئی سپیاں ہیں ، کنکر ہیں اور ٹھیکریاں ہیں اور ہر طرف ریت ہے اور جھاڑیاں ہیں ۔ سب اجاڑ ہے اور وُہ اکیلا کھڑا ہے اور اُس کا گلا سُوکھ رہا ہے ۔ اُس کے کانوں میں عجیب بولیاں ہیں اور وُہ کسی اور سمے میں ہے جو اُس کا نہیں ۔۔۔ پر اُس کی پیاس نہیں جاتی اُس کا جُسہ سُوکھتا ہے اور زبان پُھول کر باہر آ رہی ہے اور عجیب بات ہے اتنی گرمی ہے پر اُسے پسینہ نہیں آ رہا ۔ دُھوپ جلاتی ہے پر پسینہ نہیں آتا ۔۔۔ اور پیاس ۔

"سمرو" ۔۔۔ کسی نے اُسے پکارا ۔

"سمرو ۔۔۔" پاروشنی نے اُسے دُور سے دیکھا ۔ وُہ گھاگھرا میں اُترتا جاتا تھا اور پانی اُس کے کانوں تک آئے ہوئے تھے اور اگر وُہ ایک قدم بھی آگے ہو تو پورا ڈوبتا تھا "سمرو ۔۔۔" پاروشنی نے چیخ کر اُسے بلایا ۔

اِس اجاڑ میں کون ہے جو مجھے جانتا ہے ۔۔۔ مجھے روکتا ہے ۔

ابھی ورچن اپنے تھڑے پر سوتا تھا کہ وُہ اٹھی اور بستی سے نکل کر دریا کی جانب چلنے لگی ۔ راستے میں سمرو کا چھپر تو تھا پر وُہ سویا ہو گا اُسے پتہ تھا پر اُسے یہ پتہ نہ تھا کہ وُہ یہاں ہو گا گھاگھرا میں چلتا ہوا ڈوبنے کو ۔۔۔ وُہ سروٹوں میں سے ہاتھوں میں راہ بناتی اُنہیں ہٹاتی کنارے کے نیچے آئی اور پھر دریا میں اُتری اور اُس سے چند ہاتھ پر ٹھہر گئی ۔ پانی میں سویر کی ٹھنڈک گھلی تھی اور پنڈے کے اندر تک جاتی تھی، ٹھٹھرتی تھی ۔۔۔ سمرو!

وُہ چونکا ۔۔۔ وُہ گھاگھرا میں تھا اور پاروشنی کمر تک پانی میں کھڑی اُسے بلاتی تھی ۔

اُس کا سانس ایسے آ جا رہا تھا جیسے جانے کو ہے اور وُہ اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے باہر آیا اور کنارے کی خشک ریت پر گر پڑا۔

"تم سوتے میں چلتے ہو؟"

"اُس نے آنکھوں پر انگلی اور انگوٹھا دبا کر اُن میں سے پانی نکالا اور اُسے دیکھنے لگا" ورچن آگیا ہے ؟"

"ہاں ۔۔۔ تم کیسے جان گئے ؟"

"میں کل ادھر آیا تو وُہ ڈور گا کے ساتھ ادھر بیٹھا تھا اور شام کو میں اپنے چھپر سے دیکھتا تھا جب وُہ ادھر سے گذر کر ادھر بستی کو گیا ۔۔۔"

"تم نے بلایا نہیں ؟"

"نہیں ۔۔۔ مجھے پتہ تھا جب میری باری آئے گی تو وُہ آپ ہی آ جائے گا مجھ سے ملنے ۔۔۔"

"پر تم اس سمے جب سب سوتے ہیں گھاگھرا میں کیا کرتے تھے ؟"

"میں ؟" وُہ اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ "ریت اُس کے گیلے جُثے سے چمٹی ہوئی تھی اور گیلی ہوتی تھی

"پتہ نہیں ۔۔۔ مجھے پتہ نہیں ہوتا ۔۔۔ اور میں ادھر آتا ہوں ۔ پہلے پیاس ہوتی ہے اور پھر میں ادھر آتا ہوں اور گھاگھرا میں چلنے لگتا ہوں اور پانی میری ناک میں اور مُنہ میں جاتا ہے اور سانس اور پانی مل کر میرے پھیپھڑوں میں غرر غرر کرتے ہیں تو میں جاگتا ہوں ۔ پر آج ایسا نہیں ہوا ۔ آج تو میں چلتا گیا اور تم نے مجھے جگایا۔۔۔"

سمرو نے اپنے سامنے بیٹھی اُس عورت کو دیکھا جس کے ماتھے کی ایک رگ اس لئے ہولے ہولے پھڑک رہی تھی کہ وہ اُس کے لئے فکر کرتی تھی ۔ اُس کے مہاندرے میں سے ایک ایسی کالک پھوٹتی تھی جو بتاتی تھی کہ وُہ اُس کے لئے ایسے فکر میں رہتی ہے جیسے اُس کی اپنی میا رہا کرتی تھی ۔ "وُہ چیتر کی پھیکی چاندنی تھی پاروشنی جب تو میرے پاس آئی تھی ۔۔۔"

"کیا کہتے ہو ؟" پاروشنی نے سر جھٹکا "اُس کو تو بہت برس ہو گئے ۔۔۔"

"تم کو بہت برس ہو گئے پاروشنی ۔۔۔ اتنے برس گُذرے نہیں جتنے تم نے گذار دیئے ۔۔۔ اور تم نے اپنے آپ کو سُوکھا رکھا صرف اس لئے کہ وہ ایک رویا نہ تھا اور تم اُسے اِس گھاگھرا میں ڈال آئی تھیں ۔۔۔ اتنے برس گذرے نہیں جتنے تم نے گزار دیئے ۔"

"بے انت برس گذر گئے ہیں پر تم کو اُن کی خبر نہیں کہ وُہ گذر گئے ہیں اور مجھے ہے ۔۔۔ جس سمے میں نے اُسے اور اُس ایک پکھیرو کو جو میری کشتی میں آگرا تھا پانی میں ڈالا تو اُس سمے ایک برس ہو گیا تھا اور جب میں کنارے پر آئی تھی تو دوسرا برس بیت گیا تھا اور جب میں واپس اپنی گلی میں آئی ہوں تو تیسرا برس بھی پلک جھپکتے گذر گیا تھا اور پھر ایسے ہی ہوتا چلا گیا اور اب تو مجھے پتہ نہیں کہ کتنے برس ہو گئے اور سمرو تم بھی پوچھتے ہو اور ورچن بھی ۔۔۔ تو میں تمہیں بتاؤں کہ اُسے پانی میں ڈالنے کے بعد میں خود بھی پانی میں گئی اور اب میں جو ہوں وُہ ہوں جس پر بہت سارے برس بیت گئے ہیں تو میں ویسے کیسے ہو جاؤں جیسے کہ تھی ۔۔۔ جیسے ورچن کہتا تھا کہ میں اُس بڑے جُثے کا ایک حصّہ بن جاتا ہوں جو یہ سب کچھ ہے تو میں بھی ایسے ہو چکی ہوں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ وُہ اس زمین سے الگ ہو جاتا ہے پر میں جُڑ چکی ہوں اور میں اب آسمان ، مٹی تارے اور پانی ہوں کچھ اور نہیں ہوں ۔۔۔ تمہارا بدن کانپتا ہے" اُس نے سمرو کا بازو پکڑ کر اُسے اٹھایا "چلو اپنے آپ کو خشک کرو"

سمرو ایک گُم مہاندرے کے ساتھ اُٹھا ۔ پاروشنی اُسے تھامے ہوئی تھی اور وُہ اُس پر بوجھ ہوا اور اُس کے کندھے پر سر رکھا تو اُس کی آنکھوں میں پانی اُترا ۔ پاروشنی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا جیسے دلاسہ دیتی ہو اور کنڈ کو تھپکا ۔

"رات مجھ میں پانی پھر کم ہو گیا تھا ۔۔۔" وُہ ٹھٹھرتا ہوا بولا ۔

پاروشنی نے پھر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا "میں تمہاری میا ہوں تم ڈرو نہیں ۔۔۔"

پکلی یہ نہ جان سکی کہ ڈورگا راتوں کو اٹھ کر کہاں جاتا ہے ۔

یہ تو نہیں کہ وُہ اُس سے چُھپ کر جاتا تھا ۔ وُہ رات کو لیٹتا اور کبھی سیدھا ٹانگیں پھیلا کر نہ لیٹتا بلکہ جیسے وُہ جُھکا ہوا تھا اُسی طرح ایک بچے کی طرح اپنے بازو پر سر رکھ کر پڑ جاتا، تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھتا اور چھپّر سے نکل جاتا ۔۔۔ سویر ہونے لگتی تو وُہ لوٹتا پر مٹی میں لتھڑا ہوا جیسے وُہ برسوں سے اس میں دبا ہوا تھا اور اب زور لگا کر نکل آیا ہے ۔۔۔ وُہ پوچھتی تو وُہ چپ رہتا ۔

اُس نے آوے سے دُور رُکھوں کے پاس زمین کا ایک ایسا ٹکڑا دیکھا تھا جو ویسا ہی تھا جیسا کہ موہنجو کے بھٹے کے قریب تھا ۔ یہاں کی مٹی بُھسبھری نہ تھی یعنی اس میں ریت زیادہ تھی اور وُہ چِکنی سی تھی ۔ وُہ رات کو وُہیں جاتا اپنی کسّی سمیت اور اُسے کھودتا ۔ وُہ یہ تو جانتا تھا کہ جتنا گہرا کھودو اتنی اچھی مٹی ملتی ہے ۔ وُہ ہر رات مٹی ایک بڑے مرتبان میں بھر کر اپنے کاندھوں پر اٹھاتا اور آوے پر لے آتا ۔

پکلی نے دیکھا کہ آوے کے قریب اُس نے مٹی سُوکھنے کو ڈالی ہے اور سُوکھنے پر اُسے ڈنڈے سے کُوٹ کُوٹ کر مہین کرتا ہے اور کنکر پتھر الگ کرتا ہے ۔ کنکر پتھر اگر مٹی میں رہ جائے تو آوے پر چڑھنے سے وُہ پُھولتے ہیں اور برتن بھانڈے میں سوراخ کر دیتے ہیں ۔۔۔ تو پکلی نے یہی سمجھا کہ وُہ آوا چڑھانے کی تیاری کرتا ہے ۔۔۔ پھر اُس نے دیکھا کہ مٹی میں پانی ڈال کر اُس نے گھانی بنائی اور ہاتھوں اور پیروں سے اُسے اچھی طرح مسلا اور باریک کیا جیسے آٹا گوندھتے ہیں ۔۔۔ ہاں اُس نے مٹی میں تھوڑی ریت بھی ملائی تاکہ اُس کی چکناہٹ کم ہو ۔ مٹی تیار کر کے اُس نے اُسے گڑھوں میں ڈال کر ڈھک دیا تاکہ وُہ خشک نہ ہو جائے ۔ تب بھی پکلی نے یہی جانا کہ وُہ اِس مٹی کو باسی کرتا ہے کیونکہ ایسی مٹی سے برتن پکا پیڈا بنتا ہے ۔ یُوں کئی دن گذر گئے پر اُس نے برتن نہ بنائے ۔

پکلی کے مُنہ میں اب دو ایک دانت ہی رہ گئے تھے اور وُہ کُچھ کھاتی تو اُس کا منہ پچک جاتا ۔ اُس نے سخت کام کاج اب ڈورگا اور اپنے بچوں پر چھوڑ دیا تھا ۔ سُکرا اور پُنڈا اب چاک گھمانا سیکھ چکے تھے اور وُہ صرف برتنوں پر چتر مور بیل بُوٹے بناتی رہتی ۔۔۔ جس برتن پر بیل بُوٹے نہ اُلیکے گئے ہوں اور وُہ بالکل سادہ کورا ہو اُسے بُسا برتن کہتے تھے اور دوسرے کو سجا ہوا کہتے تھے اور پکلی کے آوے سے آج تک کوئی ایسا برتن نہ نکلا تھا جو بُسا ہوا ہو، اُسے اس پر بہت مان تھا ۔ اُس کی گیری بھی بڑی پکّی ہوتی تھی ۔ وُہ اُسے اتنا پیستی اتنا باریک کرتی کہ اُس پر سانس لینے سے وُہ ساری اُڑنے کو آتی ۔ تو آوے میں پکنے پر اُس میں لِشک بہت آتی ۔ پکلی یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ گیری کہاں سے آتی ہے ۔ سال میں ایک دو بار اُدھر سے تپڑی واس گذرتے تو وُہ اُن سے برتنوں کے بدلے گیری لے لیتی ۔ اُن میں سے کسی نے اُسے بتایا تھا کہ یہ صرف پہاڑوں میں ہوتی ہے ۔ پکلی صرف یہ جانتی تھی کہ پہاڑ پاسا کونسا ہے پر یہ نہیں جانتی تھی کہ سچ مچ کا پہاڑ کیسا ہوتا ہے ۔۔۔ تو ڈورگا رات کو اُٹھ کر چلا جاتا ۔۔۔ سویرے لوٹتا تو مٹّی میں مٹی دکھائی دیتا ۔

ایک سویر پکلی نے پُوچھا تو نہیں پر ڈورگا خود ہی بولا "میں جُھکا ہوا بندہ ہوں پر یہ جھکاؤ میرا اپنا نہیں بلکہ اُس زور کا ہے جو بے انت برسوں سے میرے جُثّے پر ایک بڑے کُچھو کی طرح سوار تھا ۔ پر میں خود جُھکتا ہوں تو نرا تیرے سامنے کہ تُو نے مجھے گھر کا سواد چکھایا ، مُجھے وہ کچھ دیا جو بے انت برسوں پہلے کبھی میرے ایسے بندوں کے پاس ہوا کرتا تھا ، ایک آسرا اور بال بچّے اور چُولہے پر ہانڈی اور پھر یہ سب کچھ مُجھ سے چِھن گیا اور مجھے جنور بنا دیا گیا ۔ میں سیدھا آسمان کو دیکھتا تھا پر مجھے جُھکا دیا گیا ۔۔۔ تو پھر یہ ہے کہ میں پھر سے سیدھا ہونا چاہتا ہوں ۔۔۔ تم سب کی طرح ۔۔۔ اور میں جو کُچھ کرتا ہوں تم وہم نہ کرنا ۔۔۔ میں اپنے لئے کُچھ کرتا ہوں ۔۔۔"

کُچھ دن گئے تو ڈورگا پکلی کے آوے سے دُور دریا کے قریب مٹّی ڈالتا تھا اور پھر کسّی کے ساتھ اُسے پدھرا کرتا تھا ، ایک طرف سے اونچا کرتا ہے اور دوسری طرف سے نیچا کرتا ہے ۔ پھر اِس مٹی سے ایک آوا بناتا ہے ۔ پکلی نے دیکھا تو جان نہ سکی کہ وُہ کیوں ایسا کرتا ہے "تُو ایسا کیوں کرتا ہے؟ ۔۔۔ آوا اِدھر جو ہے جو میرے والا ہے ؟"

"ہے پر جو میں پکاؤں گا اُس کے لئے مجھے اپنا آوا چاہئیے ۔۔۔ برتن پکانے والے سے ذرا بڑا اور اُس سے الگ ۔۔۔"

"وہ کیا ہے جو آوے میں پک سکتا ہے پر وہ برتن نہیں ہے ۔۔۔ جھجھر ۔ صحنک ۔

گھڑا ۔ چاٹی ، چھونی ، کُنی ، ڈولا، گڈوا ، مَٹ ، دَوری ، جھانواں ، توے یا مرتبان کے سوا اور کیا ہے جو آوے میں پک سکتا ہے ؟“

”اور بھی ہے ۔۔۔“ ڈور گا بولا ۔

اب وُہ رات کو نہ جاتا تھا ۔ اپنا کام کاج لپیٹ کر وُہ پچھلے پہر آوے کو چلا جاتا ۔ پکلی نے دیکھا کہ وُہ اپنی بنائی ہوئی مٹّی کو اب گڑھوں میں سے نکال کر اُدھر لے جاتا ہے اور اُس سے کُچھ بناتا ہے ۔۔۔ وُہ وہاں گئی نہیں کہ یہ اُس کا اپنا جِی تھا کہ وُہ کیا کرے اور کیا نہ کرے ۔۔۔ پر دُور سے وُہ دِکھتا تو بھاگتا ہوا ۔ اُس کے ہاتھ میں لکڑی کے سانچے ہوتے اور وُہ انہیں ادھر ادھر لئے پھرتا ۔۔۔ اور پھر ایک سویر پکلی مُنہ کھولے سوتی تھی اور اُس کے دو اور دانت اندھیری کھوہ ایسے کُھلے مُنہ میں ایسے تھے جیسے ابھی اُس کے اندر گر جائیں گے تو اُس کے گلے میں اور تھنوں میں ایک خاص بُو آئی جو آوے کے جلنے کی تھی ۔ گندمند جلانے سے یہ بُو ہر پاسے پھیل جاتی ہے اور اسی لئے سارے آوے بستیوں کے باہر اور ذرا ہٹ کر بنائے جاتے ہیں ۔ پر یہ کونسی رُت ہے آوا چڑھانے کی، پکلی نے آنکھیں ملتے ہوئے سوچا۔ پھاگن چیتر اور وساکھ کے پہلے دو چار دن تو ٹھیک ہوتے ہیں پر اب ۔۔۔ ہاڑ میں جب کہ مینہ جھکڑ بھی جُھل سکتے ہیں تو آوا چڑھانا تو بودن بات تھی ، تھوڑی مَت والی ۔۔۔

ورچن پانی بھرا ایک کُجّا ہاتھ میں پکڑے سروٹوں کے اندر بیٹھا اپنے پیٹ کو خالی کر رہا تھا تو اُس سویر اُس کی ناک نے بھی آوے کی بُو اُس تک پہچائی ۔۔۔ اور سمرو بھی سوتا تھا اور وُہ اب بہت دیر تک سوتا تھا ۔۔۔ زمین تیار کرنے اور بونے کے جو اوزار وہ بناتا تھا اب کم بناتا تھا کیونکہ باجرے اور تِل کی فصل جو کم ہو گئی تھی ۔ اور یوں ہوتا ہے کہ بازو پر باندھنے کو مُہریں اور گلے میں ڈالنے کی مالائیں بھی تبھی اچھی لگتی ہیں جب فصل اچھی ہو ، دانہ اُگے اور بُوٹا بنے اور یہاں بہت مُدت سے ایسا نہیں ہوا تھا ۔ وُہ سُورج سر پر آئے اُٹھتا تھا اور اکثر اپنے چھپّر میں بیٹھنے کی بجائے رُکھوں کے پاسے چلا جاتا تھا ۔۔۔ اور کئی بار اُس نے ماسا اور چیبوا کو بھی دیکھا او سوچا کہ ہم میں کون بستی میں ہے اور کون رکھوں میں ۔۔۔ میں یا یہ دونوں ؟ کُچھ پتہ نہیں ۔ اُن کے لئے اُن کی بستی وُہ ہے جس میں وُہ کُودتے ہیں اور اپنی بستی کے پار ادھر ہم کو جنور سمجھتے ہیں ۔۔۔ تو سمرو ابھی سوتا تھا جب آوا جلنے کی بُو اُس کی ناک تک پہنچی ۔

اور جب ورچن سروٹوں میں سے اٹھ کر ادھر گیا اور سمرو اپنے چھپر میں سے نکل کر ادھر پہنچا تو آوے کی موہری میں سے کھرپڑ کے جلنے سے ایک نیم سیاہ دھواں آسمان کو اٹھتا تھا اور ڈور گا

بڑے سُکھ سے راکھی بیٹھا تھا ۔۔۔ عام طور پر پکاوٹ کے لئے دو دن بُہت ہوتے ہیں پر اِن دو دنوں اور دو راتوں کو آوے کی راکھی کرنی پڑتی ہے کہ کوئی اِسے خراب نہ کر دے ، کوئی جنور اِس کے اوپر چڑھ کر اِسے ڈھا نہ دے تو ڈور گا راکھی بیٹھا تھا ۔۔۔ اُس نے اُن دونوں کو پہلے دُور دیکھا اور وہ بہت دور تھے اس لئے جانے نہ گئے، پھر جوں جوں پاس آئے تو ڈور گا نے اُن میں سے ایک کو پہچانا کہ یہ وہی ہے جو میرے آگے آگے چلتا تھا اور میں نے اسے ایک روز سروٹوں کے درمیان چلتے دیکھا تھا جب یہ نظر نہ آتا تھا پر جہاں جہاں اس کے پاؤں پڑتے تھے وہاں سے چھوٹی چڑیاں اڑتی تھیں اور پتہ چلتا تھا کہ اِن سروٹوں کے اندر کوئی چلتا جاتا ہے ۔۔۔ وُہ ورچن کی چال کو بہت جانتا تھا ۔۔۔ جتنی دیر میں وُہ ورچن کے بارے میں پکّا ہوا اتنی دیر میں سمرو بھی دکھائی دینے لگا ۔

یہ دونوں ایسے چلے آتے ہیں جیسے ایک جنور ہو اور یہ دونوں اُس کے آگے پیچھے کی ٹانگیں ہیں جو ہیں تو الگ پر ایک ہی جُثّے سے جڑی ہوئی ۔۔۔ کس کے جُثّے سے ؟ ۔۔۔ جواب اپنے آپ میں گُم ہو رہی تھی جیسے پانی ریت میں گم ہوتا ہے ۔۔۔ وُہ بہت وکھری پاروشنی تھی جو اُس نے اُن رُکھوں میں دیکھی تھی جہاں اُس کی موجودگی خالی ہوئی تھی جس سے میل کرنے کو وُہ آیا تھا اور وُہ پاروشنی سارے رکھوں میں ایسے پھیلتی تھی کہ اُس کی مہک سے بندہ جنور تو کیا رُکھ اور بُوٹے بھی اپنے آپ کو زمین سے تڑاتے تھے ۔ اور اب وُہ گُم ہو رہی تھی ۔۔۔ یہ دونوں اُسے دیکھتے تھے اور اِن کے سامنے وُہ گُم ہوتی تھی جیسے پانی ریت میں گم ہوتا ہے ۔۔۔

”یہ سویرے سویرے بُو تم پھیلاتے ہو ؟“ ورچن نے دُور سے آواز دی ۔

”آوے کو جلائیں تو بُو آئے گی ۔۔۔“ ڈرو گا مسکراتا ہوا کہنے لگا ”اگلی بار اس میں کُترن کی ایک ٹہنی ڈال دوں گا تو بُو کم ہو جائے گی ۔“

سمرو کا مہاندرہ لال ہو رہا تھا ”تم چھ سات برس پہلے گھاگھرا میں نہائے تھے اور آج تک اُس کے پانیوں میں تمہاری بُو ہے ۔۔۔ تمہارا کُچھ نہ کُچھ کرنا پڑے گا“

”سمرو یہ نہایا بھی تو ہزار برس کے بعد تھا ۔۔۔“ ورچن کے چہرے پر بھی خوشی پھیلی ”مُجھے چاہئے تھا کہ جب میں اسے کاندھوں پر اٹھا کر درشندوتی پار کروا رہا تھا تو ایک ڈبکی لگاتا اور نیچے ۔۔۔ جب یہ پار ہو جاتا تو پھر اوپر آتا ۔۔۔۔“

”لو میں تمہیں نیچے جانے دیتا تھا ۔۔۔“ ڈور گا کھسیانا ہو گیا میں نے تمہیں زرو سے پکڑ

رکھا تھا۔"

"اچھا تو تم مجھے ڈبکی لگانے سے روک لیتے ۔۔۔" ورچن اُس کے بودن ہونے پر بھی خوش ہوا ۔۔۔ وُہ ہنسنے لگا اور اُس کے ساتھ سمرو بھی ان دونوں کو ایسے دیکھ کر ڈور گا بھی نہ رہ سکا اور وہ بھی مُنہ کھول کر ہنسنے لگا ۔۔۔ وُہ بہت دنوں بعد ہنسے تھے ۔

ڈور گا خالی ہو گیا ہے ۔ ہنستے ہوئے ورچن نے سوچا ۔۔۔ وہ دیکھ رہا تھا ۔۔۔ ان چھ برسوں میں یہ جھکا ہوا انسان اور جُھک گیا ہے ۔ جو برس اُس پر بیتے تھے وہ اب پھر لوٹتے تھے اور اُس کے مُنہ مہاندرے پر اپنے نشان گہرے کرتے تھے ۔ یہ اب بہت کم دن رہے گا اور پھر اس کا سانس بند ہو گا اور یہ پار جائے گا ۔ وُہ جانتا تھا کہ اس جھکے ہوئے انسان کے پار جانے میں سانس بند ہونے سے وُہ ایسا دُکھی ہو گا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا ۔۔۔ پر اب یہ کیا کرتا ہے ، سویرے سویرے آوے کو جلا کر کیا پکاتا ہے ۔۔۔ اور ابھی چند دن پہلے جب وُہ بالوں میں ریت اور آنکھوں میں تھکن کے ساتھ گرتا اُجڑتا اُس کے پاس آیا تھا تو جو دُھواں اُس نے دیکھا تھا وُہ اِس آوے کا نہ تھا ۔ وُہ آوا تو ادھر پکلی کے چھپر کے ساتھ ہے تو اس نے یہ کیوں بنایا اور اب کیوں چڑھایا ۔۔۔

ڈور گا بھی ہنس رہا تھا پر وُہ ورچن کو دیکھتا تھا اور اُسے جانتا تھا کہ یہ کس دُکھ میں ہے ، یہ جب اُس دن ادھر آیا تھا تو صرف بستی کے لئے ، گھر کے لئے نہیں لوٹا تھا اُس کے لئے لوٹا تھا جو خود لوٹ چکی تھی اور اب اُس کی آنکھوں میں وہی اجاڑ اور بیابانی تھی جو وہ اپنے سفروں میں گذارتا آیا تھا اور ڈور گا جانتا تھا کہ اُس کے سر میں بھی یہی سوال ہے کہ آوا ادھر کیوں ہے ۔۔۔ "تم جاننا چاہتے ہو کہ میں نے اپنا آوا کیوں بنایا ہے اور کیوں چڑھایا ہے" ڈور گا ہنستے ہنستے رُکا "تو دو روز رُک جاؤ پھر خود ہی جان جاؤ گے کہ میں کیا پکاتا ہوں اور پھر تم میرا ساتھ دو گے ۔۔۔"

"ساتھ کس لئے دیں گے ؟" سمرو نے ہنسی روکی اور پُوچھا۔

"ایک موہنجو بنانے کے لیے ۔۔۔"

"کیا کہتے ہو ؟" ورچن کا ہاتھ اُس کے کندھے پر آیا ۔

"تم ایک جُھکے ہوئے کو اور کیوں جھکاتے ہو ؟" ڈور گا پھر مسکرانے لگا اور اُس کے ہاتھ کے بھار سے اپنے کندھے کو پرے کر لیا "تم آجانا اور دیکھ لینا"

ورچن کو پھر دکھ ہوا کہ وُہ بندہ جسے وُہ ریت اور رُکھوں اور ندیوں میں سے ادھر لے آیا تھا ، اب گھاس پھونس ہو رہا تھا اور اسی لئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا تھا ۔

"آؤ میرے چھپر تلے بیٹھتے ہیں ، ادھر تھوڑی دیر میں دھوپ جُسّے کو جلانے لگے گی ۔۔۔" سمرو نے کہا ۔ اور دُھوپ آنے سے پہلے ہی ہوا میں بُوٹا مُرجھا دینے والی گرمی تھی ۔۔۔ ایک بہت گرم دن آنے کو تھا ۔ ان دنوں پہلے اتنی گرمی نہیں ہوتی تھی پر اب ہونے لگی تھی ۔

"پر میں تو کہیں نہیں جا سکتا ۔۔۔" ڈور گا بولا "میں تو راکھی پر ہوں اور ادھر سے اُدھر نہیں ہوں گا جب تک یہ آگ اپنا کام نہ کر لے ۔۔۔ تم چاہتے ہو کہ یہ میرا آوا بیٹھ جائے ؟"

"تم دن رات ادھر رہو گے ؟"

"ہاں ۔۔۔ میں ادھر بھی تو دن رات ایک کرتا تھا اُن کے لئے ۔۔۔ اب اپنے لئے کرتا ہوں" وُہ بولا اور ایسے بولا کہ وہ جان گئے کہ اب اُنہیں جانا چاہئے ۔۔۔ اور وُہ چلے گئے ۔

بُوٹے کی جڑوں میں مٹی کم ہو رہی تھی اور اُسے سانس لینے میں مُشکل پیش آ رہی تھی اور اُس کا وجود کپکپا رہا تھا اور مینہ موسلا دھار برستا جا رہا تھا ۔۔۔

پانی کے ذرّے سفید دھوئیں کی شکل میں پھیل رہے تھے ۔۔۔

جہاں چٹانیں تھیں وہاں مینہ ایک گہرے شور کے ساتھ ۔۔۔

جہاں پتّے اور گھاس تھی وہاں اس کی آواز گُم ہوتی جاتی تھی ۔۔۔

نہ دن اور نہ رات ۔ بس مینہ تھا جو لگاتار گر رہا تھا اور ہلکی نم پُر شور تاریکی تھی ۔۔۔

اور شروع میں جب ہر پاسے تاریکی تھی ۔۔۔

اور تاریکی پانیوں پر تیرتی تھی ۔۔۔ روشن ہو جا ۔۔۔ اور دیکھو وہاں روشنی تھی ۔۔۔

چٹان پر گرتے سارے پانی کا بہاؤ اُس کی طرف تھا جس کی جڑوں میں مٹی کم ہو رہی تھی ۔۔۔ اور یکدم تاریکی پھر پانیوں پر تیرنے لگی ۔

بُوٹے کی جڑوں میں سے مٹی کا آخری ذرّہ بہا تو وُہ گرا ۔ گرا تو رکاوٹ ہوا اور بہتے پانی اُس کے بیچوں بیچ راستے بنانے لگے ۔

وُہ برستے پانی کے بہاؤ کا ایک حصّہ بن کر اپنے گھر سے نیچے آنے لگا ۔۔۔

اور اُس ہلکی پُر شور تاریکی میں جو نہ دن تھا اور نہ رات ۔۔۔

پانیوں کی پگڈنڈیاں اُس کے آسے پاسے رواں تھیں جو کبھی اُس راستے میں آ گرتیں جس میں وُہ بہتا تھا اور کبھی جُدا ہو کر دُور نکل جاتیں ۔۔۔

ایک پہر کا سفر پورا ہوا تو تاریکی ہونے لگی مگر شور بڑھتا گیا ۔۔۔

وُہ برف کی ایک سفید چٹان کے نیچے سے گذرنے لگا جو اُس کے راستے پر یُوں جُھکی تھی کہ ذرا اور جُھکتی تو راستہ روک لیتی ۔۔۔

اور وُہ گذر نہ سکا ۔۔۔ وُہ ذرا اور جُھک کر اُس کا راستہ روک چکی تھی ۔

اور وُہ گذر نہ سکا اور اُس کے ساتھ لگ گیا ۔۔۔ برف کی دیوار نے اُسے روک لیا تھا ۔ وُہ اتنی جُھک چکی تھی کہ اُس کا راستہ رُک چکا تھا ۔۔۔ اُس کے ساتھ بے انت بُوٹے اپنے سر پٹخ رہے تھے پر وُہ آگے نہ جا سکتے تھے ۔۔۔

اور مینہ کے پانی بھی آگے نہ جا سکتے تھے ۔۔۔

پر اُسے تو جانا تھا ۔ یہ پہلی بار تھی کہ وُہ جا رہا تھا ۔ ہر بُوٹا پہلی بار جاتا ہے اور اگر اُس کو باری نہ ملے تو پھر کبھی نہیں ملتی تھی اور اسی لئے وُہ جانا چاہتا تھا ۔۔۔ پانی اُسے اپنے میں ڈبو کر بار بار برف کے تودے کے ساتھ پٹختا تھا پر آگے راستہ نہ تھا ۔۔۔ وہاں بے انت بُوٹے بے بسی سے تیرتے تھے اور ڈوبتے تھے اور اُن میں سے ایک نے کُچھ کہا ۔۔۔ "ہم سے جو پہلے ہوئے ۔ سر مور کی اِن پہاڑیوں میں اور چٹانوں کے بیچ جہاں جہاں ہم اُگ سکتے تھے ہم اُگے اور جہاں جہاں ہم بڑھ سکتے تھے ہم بڑھے اور پھر ہمیشہ سے ایسا ہوا کہ بھادوں میں مینہ اُترے اور یُوں اُترے کہ ہم سب اپنی جڑوں سمیت اُن کا حصّہ بن کر بہے اور نیچے گئے ۔ پہاڑیوں سے نیچے اُترے بے انت چھوٹے چھوٹے نالوں کی صُورت میں ایک بڑی ندی میں جا ملنے کے لئے ۔۔۔ اور ہمیشہ سے ہمارے سامنے برف کی یہ چٹان تھی جس کے نیچے سے ہم گذرتے تھے ہم اور ہمارے ساتھ بہتے پانی اور یُوں جُھکی تھی جیسے اور جُھکتی تو راستہ روک لیتی اور اس نے ہزاروں برسوں سے جُھکاؤ ایسے ہی رکھا اور ہمیں گذرنے دیا ۔۔۔ پر اب جانے اس کے جی میں کیا آئی ہے ۔۔۔ اس کے جی میں آئی ہے یا اُس کے جس نے کہا تھا کہ روشنی ہو جا ۔۔۔ اور یہ ہمارے آگے آ گری ہے اور ہمارا راستہ بند کر دیا ہے اور ہم اس کے نیچے سے نہیں گذر سکتے اور ہم جانتے ہیں کہ نیچے بڑی ندی کے کنارے ہماری اڈیک میں ہیں کہ ہم آئیں اور اُن کو بھریں پر اب ہم کیا کریں ۔۔۔ ہم اس کے ساتھ سر ٹکراتے ہیں اور ادھر اُدھر بہتے ہیں اور اپنے آپ کو الگ الگ کر کے چھوٹے چھوٹے نالے نالیاں بن کر ادھر اُدھر گُم ہو رہے ہیں ۔۔۔ ہم ایک بڑی ندی نہ بن پائیں گے ۔"

پر اُس بوٹے نے کہا کہ میں تو جاؤں گا ۔ میری باری ہے ۔ اور وہ برف کی چٹان کے ساتھ ٹکراتا رہا اور اُس کے پتّے چِھل گئے اور ڈنٹھل کُھرچے گئے پر وُہ زور لگاتا رہا اور آخر کار اُس برف کی دیوار کے ساتھ لگ کر ایک چھوٹا سا راستہ اُسے مل گیا جس میں سے کسمساتا ہوا وُہ بہہ نکلا ۔ دوسرے پہر تاریکی پھر گہری ہو گئی ۔ وہاں گھنے رکھ تھے جن میں وُہ مشکل سے گذرا کہ پانی نہ ہونے کے برابر تھے اور وُہ بہہ نہیں سکتا تھا ۔ رُکھوں کے آخر میں وُہ پہاڑوں کے سینے سے جُدا

ہو کر پانی کی ایک پتلی دیوار میں چُنا ہوا میں گرنے لگا اور دیر تک گرتا گیا ۔ اُس کا ماتھا ایک مرتبہ پھر پتھروں سے ٹکرایا اور وُہ نیچے گیا اور دور تک وُہ پانی کے نیچے رہا اور جب اُوپر آیا تو وہاں ایک تھمی ہوئی ندی تھی ۔۔۔

"سرسوتی جو بڑے پانیوں کی ماں ہے اور ساتویں ندی ہے ۔۔۔
اُس کے پانی آتے ہیں ۔۔۔
شاندار اور بُلند آواز میں چنگھاڑتے ہوئے ۔۔۔"

پر وہاں کوئی چنگھاڑ نہ تھی ۔۔۔ ٹھہراؤ تھا ۔۔۔ مدھم چلن تھا ۔۔۔ بُوٹے کے نیچے پتھروں اور گیٹوں کی بجائے ریت بچھ رہی تھی اور شور کم ہو رہا تھا ۔۔۔ اور اُسے پانی دھکیل نہیں رہے تھے بلکہ اپنے ساتھ لئے جا رہے تھے ۔۔۔ تب اُس کی ایک شاخ بہاؤ کے اوپر ابھری اور اُس کے چھلے ہوئے جُثے پر دُھوپ چمکی ۔۔۔ اور دیکھو وہاں روشنی تھی ۔۔۔ اور بہت روشنی تھی ۔۔۔

"وہ اپنے زور سے کنول کے ڈنٹھل اکھیڑتی ہے ۔"
"اور اپنی طاقت والی لہروں سے پہاڑوں کے کنارے توڑتی ہے ۔۔"

پر اس میں اب لہریں کہاں تھیں ۔۔۔ ٹھہراؤ تھا ۔۔۔ مدھم چلن تھا ۔۔۔ جیسے تھکاوٹ ہو اور چلا نہ جائے اور رُکنے کو جی چاہے ۔۔۔ اور یہاں روشنی تھی اور اسی لئے دن بھی تھا اور رات بھی تھی ۔۔ اور اس کے کناروں کے ساتھ بستیاں تھیں جن کے گھاٹ نیچے آتے تھے اور اُن کی سیڑھیاں سُوکھی ہوئی تھیں ۔۔۔ اور ایسی بستیاں تھی جن میں کم لوگ تھے اور ایسی بھی تھیں جہاں سے دھواں نہ اٹھتا تھا ۔۔۔ تو پھر ان کے باسی کدھر گئے ؟ ۔۔۔ اور وُہ اٹک اٹک کر بہتا رہا پر اب نیچے جہاں ریت تھی وہاں تک گرمی پہنچنے لگی ۔۔۔ پانی کم ہونے لگا ۔ سُوکھی فضا کے سانس اُسے اپنے اندر کھینچنے لگے اور سُورج کی تپش اُسے اڑانے لگی ۔۔۔ ندی کے اونچے کنارے پرے ہوتے گئے ۔ بوٹا اب سکھ میں نہیں بہتا تھا ۔۔۔ اور جب سُورج ڈوبنے کو تھا تو بلند کناروں پر ایک بستی تھی ۔ بستی کے آگے ایک دیوار تھی اُس جگہ جہاں کسی زمانے میں ندی کے پانی مار کرتے تھے اور بستی کو ڈبوتے تھے پر اب وہ وہاں تک پہنچتے ہی نہیں تھے ۔ وہاں تک تو پھر بھی کچھ دور تھا وُہ اب دیوار سے بھی ادھر رہ جاتے تھے اپنی ریت کو ننگا کرتے ہوئے ۔۔۔ دیوار گذر گئی ۔

ندی کو ٹھہراؤ روکتا گیا ۔ وہ تیز نہ تھی ، دھیمی تھی جیسے رُکنے کو ہو ۔

اور بستی سے پَرے سروٹوں کے ساتھ کنارے پر لوگ تھے گھٹنوں پر سر رکھے اُسے دیکھتے تھے اور وہاں وہ سب تھے جو بستی میں تھے ۔ اُن کے چُولہے ٹھنڈے تھے اور اُن میں راکھ تھی کہ وُہ کئی روز سے کنارے پر بیٹھے تھے ۔ وہیں کھاتے پیتے تھے اور وُہیں سوتے تھے ۔۔۔ جیسے اُنہیں بے وسائی ہو کہ کچھ ہو گا اور ہم جان نہ پائیں گے ۔۔۔ اور اِسی لئے وُہ گھٹنوں پر سر رکھے اُسے دیکھتے رہتے تھے ۔

چلنے سے جو دُھول اُٹھتی وُہ اب بیٹھتی نہیں تھی ۔۔۔ وُہیں چھپروں اور کوٹھڑیوں کے اُوپر اُٹھی رہتی اور اب وہ زیادہ نرم اور باریک ہو رہی تھی اور اسی لئے دُھوپ اُسے جلاتی رہتی تھی ۔ ہوا میں بھی دُھول ملتی تھی اور اندر سانس میں بوجھ ہوتی تھی ۔۔۔ بارہ ماہوں میں بس اتنے ہی چھینٹے پڑے ہوں گے اور اُن سے نہ ٹھنڈک ہوئی اور نہ ہوا کومل ہوئی ۔۔۔ بس بوندوں کے زور سے دُھول پل دو پل کے لئے اوپر اُٹھتی اور پھر وہیں ٹھہری رہتی ۔

مینہ نہ ہونے سے وُہ اب دریا کی طرف زیادہ دیکھتے ۔

سَون چڑھا اور جُتوں میں سے گرمی بھاپ بن کے اٹھنے لگی ۔ بستی میں چند لوگ رہ گئے باقی ڈوبو مٹی کے ادھر سانجھی زمین پر جا کر اپنے ڈیروں میں رہنے لگے ۔ اُن کے ڈھور ڈنگر بھی جان گئے کہ اب آلکس کے دن پُورے ہوئے ، اُنہیں بڑا پانی آنے سے پہلے زمین کو پدھرا کرنا تھا ، پھر کھودنا تھا پھر بیج ڈالنا تھا ۔ پہلے پہل تو ہر کھیت کو اپنے لئے بہت پانی مل جاتا پر کچھ برسوں سے سارے کھیتوں کے گرد چھوٹی دیواریں بنانے کا رواج ہوا ۔ پانی آتے تو چار دیواری کے اندر رہتے اور وہیں سوکھتے ۔۔۔ اس برس لوگ کم بولتے تھے ۔۔۔ اُن کے اندر کچھ ہو رہا تھا اور وُہ جانتے نہیں تھے کہ کیا ہو رہا ہے ۔ وُہ سر جھکائے اپنی زمین پر جھکے اُسے کھودتے رہتے اور اُسے دیکھتے رہتے ۔ کئی تو اُس سے باتیں کرتے جیسے وُہ جیتی جاگتی میّا ہو ۔۔۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ کام کاج پُورا کر کے سب بستی میں لوٹ آتے اور پھر اُس دن کی اُڈیک میں رہتے جب سویرے سویرے بستی کی گلی میں اور اُس سے پَرے کھیتوں میں ایک سرسراہٹ تیرتی ، پکھیرو کچھ زیادہ بولتے ، ڈھور ڈنگر ڈکرانے لگتے اور وُہ جان جاتے کہ بڑے پانی آ گئے ہیں ۔ پر اس بار جیسے اُنہیں بے وسائی تھی ۔۔۔ جو بھی کھیت میں کام پُورا کر لیتا وُہ اپنا چُولہا چنگیر اُٹھا کر گھاگھرا کے کنارے آ بیٹھتا ۔۔۔

سب سے پہلے تو دُھروا آیا اور بیٹھ گیا ۔۔۔

اُس کے بعد ماتی اور اُس کے تینوں آ گئے اور پھر اگلے چند دنوں میں بستی کے چھپروں تلے

کوئی نہ سوتا تھا ۔۔۔ سوائے اُن کتوں کے جو شام ڈھلے کنارے کی طرف آتے کیونکہ اب اَن پانی کی خوشبو اُدھر سے آتی ۔۔۔ وُہ اپنے حصّے کی روٹی کھا کر دُمیں ہلاتے بستی کو لوٹ جاتے جیسے اُس کی حفاظت کو جاتے ہوں ۔۔۔ پر وہاں تھا ہی کیا ۔۔۔

پاروشنی سب سے اخیر میں آئی ۔۔۔ اور وہاں ماتی کے تینوں پُتر ایک دوسرے میں پروئے اس طرح سوتے تھے کہ وُہ الگ الگ جُسّے نہ لگتے تھے کوئی دریائی جنور لگتے تھے جو گھاگھرا سے نکل کر باہر کنارے پر آ کر لیٹ گیا تھا ۔۔۔ ماتی نے پاروشنی کو دیکھا تو اُس کا بُوڑھا جُسّہ ہلنے لگا ۔۔۔ وُہ ہنستی نہ تھی بلکہ اپنے اتھروؤں کو روکتی تھی اور یُوں اُس کا جُسّہ ہلتا تھا تھل تھل کرتا ۔۔۔

"کیا ہوا ماتی ؟" پاروشنی اُس کے پاس ہو بیٹھی ۔

"کچھ نہیں ۔۔۔" اُس نے اپنا سفید بچّا جھاٹا ہلایا اور اتھرو پونچھے "تو اب آئی ہے ؟"

"میں وہاں اکیلی کیسے رہ جاتی ۔۔۔ آج سویرے دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا ۔۔۔ میں بھی چلی آئی ۔۔۔" اُس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا اور اُدھر دیکھنے لگی جدھر سب لوگ دیکھتے تھے ۔۔۔ گھاگھرا ویسا ہی تھا جیسا کہ اُس نے اُسے دیکھا ، آج یا پہلے ، ہوش میں یا سوتے میں ۔۔۔ اُس میں کچھ فرق نہ تھا ، وُہ بہتا تھا اور اُس کے بہاؤ پر ایک پرندہ مچھلی کے لئے ڈبکی لگانے کو پر تولتا تھا ۔۔۔

"سب ادھر کیوں آ گئے ہیں ؟"

"پہلے دُھروا آیا تھا ۔۔۔"

دُھروا بہت پرے تھا پاروشنی کو دیکھ کر پاس آ رہا تھا اور جب آ گیا تو بولا "پہلے میں آیا تھا ۔۔۔"

"تم آ گئے ہو تو نہ بو بیلوں کو چارہ کون ڈالتا ہے ، باڑے کی رکھوالی کون کرتا ہے ؟"

"وُہ تو پوتر جنور ہیں پاروشنی ۔۔۔ اُنہیں رکھوالی کی کیا ضرورت ہے ۔۔۔ اور چارہ میں ڈال آتا ہوں روز جا کر ۔۔۔ پر ادھر تو آنا تھا ۔"

"پر کیوں ؟"

"بڑے پانی کی راہ دیکھنے ۔۔۔"

"وُہ تو آتے ہیں ۔۔۔ تم ادھر آ کر بیٹھو یا ادھر اپنے باڑے کے باہر تھڑے پر ، وُہ تو اپنے دنوں میں آتے ہیں دُھروا ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔" دُھروا کی ٹھوڑی پر چگّی داڑھی ہوا میں لہرانے لگی "ہاں وُہ اپنے دنوں میں آتے تو ہیں پر میں نے سوچا یَم کے کُتّے یہاں بھی آئیں گے اور وہاں بھی اور میں کوئی گھاس پھونس ہوں جو یُوں بیٹھا رہوں ۔۔۔ یہاں اُن کی آس رکھنے کی بجائے وہاں دریا کے پاس چلا جاتا ہوں ۔۔۔ پھر ماتی آ گئی ۔۔۔ پھر اگلے دن ادھر اور بہت سارے آ گئے ۔۔۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہم سب ادھر ہیں کُھلی ہوا میں اور بڑے پانی کی راہ دیکھتے ہیں ۔۔۔"

"راہ دیکھتے ہیں ؟" پاروشنی کا کلیجہ زور سے دھڑکا ۔۔۔ راہ بُھولنے کا تو نہیں ہے ۔۔۔ پانی تو راہ نہیں بُھولتے ۔۔۔ تو پھر اُن کی راہ کیوں دیکھتے ہیں ۔

اُس شام جب سب سے پرے ہو کر پاروشنی نے اپنے چُولہے میں آگ جلائی اور اپنی ہانڈی چڑھائی تو اُس کا کلیجہ اب بھی دھڑکتا تھا ۔۔۔ وُہ ادھر صرف اس لئے آئی تھی کہ آئے گی اور کہے گی کہ تمہاری مَت ماری گئی ہے جو سب کے سب یہاں آ کر بیٹھ گئے ہو ۔۔۔ اپنے اپنے ڈیروں اور چھپروں کو لوٹ جاؤ ، بڑے پانی تو آنے ہی ہیں تو تم یہاں کیا کرنے آئے ہو ۔۔۔ پر اب گھاگھرا کے دیکھنے سے اُس کا کلیجہ دھڑکتا تھا ۔۔۔ اور اب اگر سارے کے سارے واپس چلے جائیں تو وُہ واپس جانے والی نہیں تھی ۔ وُہ پانی سے اپنی نظریں نہیں ہٹا رہی تھی جیسے اُسے یقین ہو کہ اگر اُس نے نظریں ادھر ادھر کیں تو ۔۔۔ پانی نہیں آئیں گے ۔۔۔ اور جب ہانڈی میں سے پکنے اور گلنے کی ہواڑ آئی اور ہوا میں پھیلی تو کوئی اُس کے پاس آیا اور بیٹھ گیا جو ورچن تھا ۔ اور پھر سمرو آیا اور کچھ دور کھڑا ہو گیا اور پاروشنی نے اُسے بلایا کہ آؤ کچھ اَن پانی کر لو ۔۔۔ وُہ دونوں سر جھکائے اُس کے پاس بیٹھے تھے جیسے وُہ میا ہو اور وُہ دریا کو دیکھتی تھی جو شام کی سیاہی میں ملتا جاتا تھا اور اُس کے بہاؤ کے اوپر اُڑتا پرندہ بھی اُسی سیاہی میں ملتا جاتا تھا ۔

کنارے کے ساتھ ساتھ چُولہوں میں اُپلے سُلگتے تھے اور اُن کی لَو اب دُور سے دِکھتی تھی اور ہر چولہے کے پاس کوئی ایک پاروشنی تھی اور اُس کی پیڑھی کے پاس کوئی ورچن یا سمرو تھا ۔۔۔

ہم سب کتنے ہیں ؟ ۔۔۔ پاروشنی نے ہانڈی میں ڈوئی پھیرتے ہوئے اوپر دیکھا کنارے کے آخر تک ۔۔۔ بلکہ ہم سب کتنے چولہے ہیں ؟ ایک چُولہا ایک پُوری حیاتی ہے ، اُس کا تانا بانا ہے ۔ جب وُہ جلتا ہے تو سانس چلتا ہے اور جب بجھتا ہے تو سب کچھ ٹھنڈا ہو جاتا ہے ۔۔۔

چُولہوں میں سُلگتے اُپلوں پر راکھ ایسے آتی گئی جیسے کلراٹھی زمین پر کلرّ آنے لگتا ہے ۔ کنارا اونچا تھا پر ہوا نہ لگتی تھی کہ ہوا تھمی ہوئی تھی اور اُن سب کے جُسّے جو اپنے اَن پانی پر جُھکے ہوئے تھے پسینے سے بھیگتے تھے ۔۔۔ اور گھاگھرا بھی جیسے ہوا کے ساتھ تھما ہوا تھا وہاں سے بھی ۔

کوئی سرسراہٹ نہ آتی تھی جو یہ بتائے کہ بڑے پانی آنے کو ہیں ۔ اور شام اندھیرے میں گم ہوتی تھی ۔

ورچن نے دیئے کی بتی کو آگ دکھائی تو وُہ تڑتڑا کے جلی بُجھی اور پھر جلنے لگی اور اُس کا شعلہ بھی تھمی ہوئی ہوا میں جیسے تھم گیا اور ٹھہر گیا ۔

گھاگھرا کے کنارے سے جہاں چُولہے سُلگتے تھے وہاں اب دیئے دِکھتے تھے ۔۔۔ اور ہم سب کتنے دیئے ہیں؟

اور ایسے کچھ دن گُذرے ۔۔۔ بھادوں کا اخیر تھا جب وُہ چھپّر چھوڑ کر گھاگھرا کے کنارے آئے اور اب اسوں چڑھ گیا تھا ۔۔۔ ہوا جیسے کہیں اور چلی گئی تھی ، کبھی کبھی آتی اور جھاتی مار کر چلی جاتی ورنہ ہر شے اُس کے بغیر رہتی اور چُپ رہتی ۔ پکلی کے آوے کا دھواں بھی جب کبھی اٹھتا تو بنا پھیلے سیدھا آسمان میں دم سادھے جاتا تھا ۔۔۔ دن کے وقت جب سُورج اُنہیں بیٹھنے نہ دیتا اور اُن کے تلووں تلے زمین بھی جلنے لگتی تو وُہ اٹھ اٹھ کر سروٹوں کے اندر بیٹھتے تاکہ دُھوپ سے بچاؤ ہو پر وہاں ایسا گُما ہوتا کہ سانس رُکتا اور وُہ پسینے میں نُچڑتے پھر کنارے پر دُھوپ میں آ بیٹھتے اور اپنے سر پر ہتھیلیاں جما کر اپنے بھیجے کو پگھلنے سے بچانے کی کوشش کرتے پر جیسے اُن کے سر کے اندر بھی پسینہ پُھوٹتا اور بہتا ۔۔۔ پہلے تو ایسے ہوتا تھا کہ بستی سے ادھر کو جو بھی آتا جیسے بھی کام کاج کو آتا تو وُہ دریا میں ایک دو ڈبکیاں لگا کر جاتا ۔۔۔ جیسے پکی ہوئی بیریوں کے پاس سے گذر جانا مُشکل ہوتا ہے ویسے ہی گرمی میں بہتے دریا کے پاس سے گذر جانا مشکل ہوتا ہے ۔۔۔ پر اب یہ ہوا تھا کہ وُہ اُس کے اندر جانے سے جھجھکتے ۔۔۔ وُہ پسینے سے نُچڑتے رہتے اور گُتّے میں مُنہ کھولے ہانپتے رہتے پر کنارے سے اُتر کر دریا میں نہ جاتے ۔۔۔ کیا جھجھک تھی اور کیوں تھی ۔ بس کہیں اُن کے اندر یہ تھی کہ ہم اگر اس میں اُترے تو شائد کچھ ہو جائے اور یُوں وُہ ایسے تھے کہ پکی ہوئی بیری کے پاس بیٹھے رہتے پر ڈھیم مار کر اُس کے بیر نہ گراتے ۔۔۔ وُہ آپس میں بہت کم بات کرتے تھے ۔ اُن کی ٹھوڑیاں اُن کے گُھٹنوں پر رکھی رہتیں اور اُن کی مہین آنکھیں دریا کے بہاؤ پر جھپکتی رہتیں ۔ وہاں جھاگ نے آنا تھا ۔۔۔ جھاڑیوں کے پتّوں اور ٹہنیوں نے تیرتے آنا تھا اور پھر ۔۔۔ اُس نے بولنا تھا کہ میں آرہا ہوں ۔

وُہ کنارے پر بیٹھے پانیوں کو تکتے رہتے ۔

انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ جب بڑے پانی آئیں گے اور وہ کناروں سے باہر نکل کر دھیرے دھیرے ان کے کھیتوں کی طرف جائیں گے تو وہ ان کے آگے آگے چلیں گے جیسے راہ دکھاتے ہوں اور جب وہ ان کی کھودی ہوئی زمین کو گیلا کر کے وہاں رکیں گے تب وہ بھی اپنے چھپروں اور ڈیروں کو لوٹیں گے پر اس سے پہلے نہیں ۔

پاورشنی پہلے تو ورچن سے پرے تھی اور سمرو سے پرے تھی تو اب وہ شائد اپنے آپ سے بھی پرے ہو گئی اور وہ سب جانتے تھے کہ وہ پرے ہو گئی ہے ۔

سب آئے تھے پر ڈورگا نہیں آیا تھا ۔

"وہ ہم میں سے نہیں ہے اور ہم سے اسے کیا۔ اس لئے اُسے کیا" پکلی منہ کھول کھول کر کہتی ۔۔۔ وہ بھی سب کے ساتھ بیٹھی رہتی پر کبھی اٹھتی اور اپنا آوا چڑھا آتی ۔۔۔ اب اس کے منہ میں دانتوں کی ایک بھی سفیدی نہیں تھی اور سارا اندھیرا تھا بالکل پوپلا ۔ اس کی ٹھوڑی بیٹھ گئی تھی اور ہونٹ پچک گئے تھے ۔۔۔ "وہ اپنے آوے کے پاس بیٹھا ہے ۔۔۔ اپنے بال بچے کی بھی فکر نہیں ۔۔۔ بوڑھے کے جائے ہمیشہ بن باپ کے رہتے ہیں ۔۔۔ اُسے کیا"

اور ایک سویر ورچن اٹھا اور ادھر چلا گیا اور اس نے ڈورگا کو دیکھا اور اس نے ڈورگا کے پاس جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر اسے سندھو کے کنارے ایک شام یاد آئی جس میں ایک اسوا تھا اور پورن تھا اور اسے ہاتھ لگا اور ورچن ۔۔۔ یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا ۔۔۔ اس کا ڈر میرے اندر ہے ۔ تو اس نے ڈورگا کے پاس جو کچھ دیکھا وہ صرف موہنجو میں دیکھا تھا ۔۔۔ پکی سرخ اینٹوں کی ایک چار دیواری ۔۔۔ جو ابھی کمر تک آئی تھی ۔۔۔ اور ڈورگا بے حد مہارت سے ردّے کے اوپر ردّا لگا رہا تھا ۔۔۔ اس بستی میں یا گھاگھرا کے آس پاس کہیں بھی پکی اینٹ کا رواج نہ تھا سوائے دریا کے آگے جو دیوار بنائی جاتی ہے اُس کے لئے ۔۔۔ اس لئے یہاں پکلی کے آوے کے قریب کھلے میدان میں پانچ سات ہاتھ لمبی چوڑی چار دیواری عجیب ان ہونی لگ رہی تھی ۔۔۔ جیسے کسی نے موہنجو کا ایک ٹکڑا اٹھا کر ادھر رکھ دیا ہو ۔۔۔

ڈورگا نے اسے اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا پر مچل مارے بیٹھا رہا جیسے نہیں دیکھا اور گارے کو سنوار سنوار کر پھیلاتا رہا اور پھر اس پر پکی اینٹ رکھ کر دیکھتا رہا کہ کتنے گارے میں وہ ٹھیک بیٹھتی ہے اور پھر اچھی طرح سے جمتی ہے ۔۔۔ ورچن پاس ہوا تو بولا "ڈورگا کیا بناتے ہو"؟

"ایک چھوٹا سا موہنجو ۔۔۔" ڈورگا نے جب سر اٹھایا تو ورچن کو اچنبھا ہوا کہ اس کا مہاندرا جیسے کچھ برس پیچھے چلا گیا ہو ۔ وہ اب اتنا بوڑھا نہیں لگ رہا تھا ۔ اس نے ایک اینٹ اٹھا کر آگے کی "اسے اٹھا کر دیکھو"۔

"بھاری ہے ۔۔" ورچن نے کہا

"ہاں ۔۔۔ اور یہ میں نے بنائی ہے اور میں یہ اینٹ ہزار برس سے بنا رہا ہوں پر ورچن میں صرف بناتا رہا ہوں ۔۔۔ تم جانتے ہو کہ بھٹے کی چاردیواری میں کچھ پتہ نہ تھا کہ ہم جو اتنی ڈھیر ساری اینٹیں پکاتے ہیں تو وہ کہاں جاتی ہیں اور ان سے کیا بنتا ہے اور جب میں اس چاردیواری سے باہر نکلا تو میں نے پہلی مرتبہ وہ دیوارِیں اور حویلیاں اور کنک گودام دیکھے جو میری بنائی اور پکائی ہوئی اینٹوں سے بنے تھے پر ان میں لوگ اور تھے جو رہتے تھے ۔ ایسے لوگ جو کبھی بھٹے کے اندر نہیں گئے تھے اور انہیں پتہ نہ تھا کہ ایک اینٹ بنانے میں اور پکانے میں کتنا پسینہ بہتا ہے اور کتنا منہ خشک ہوتا ہے اور کتنا جسہ جھلستا ہے ۔۔۔ اور وہ لوگ میری بنائی ہوئی اینٹوں میں رہتے تھے اور تب جب میں کشتی پر سوار ایک کونے میں منہ چھپائے بیٹھا تھا اور تمہیں دیکھتا تھا اور اس موہنجو کو دیکھتا جو میری پیٹھ سے پرے ہٹتا جاتا تھا تو میں نے یہ سوچا تھا کہ کبھی میں اپنے لئے بھی اینٹ بناؤں گا اور پکاؤں گا اور اس سے ایک چاردیواری بناؤں گا اور دیکھوں گا کہ اس کے اندر رہنا کیسا لگتا ہے "۔

ورچن پچھلے کئی دنوں سے بند ہوا تھا ۔ وہ کھل نہ سکتا تھا پر ڈورگا کی بات سن کر کھل گیا اور مسکرانے لگا "تو پھر کیسا لگا"؟

دیکھ لو ۔۔۔ ڈروگا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تین چار پلانگ لمبے اور چوڑے احاطے کے اندر لے گیا ۔۔۔ "میں آخر اپنے گھر میں ہوں۔

"تم تو ہو ۔۔۔ تم تو ہو" ورچن کچھ کہنے کو تھا پر چپ رہا اور ڈورگا جان گیا کہ وہ کچھ کہنے کو تھا "کہو تو سہی ۔۔۔ تم پیلی ہو اور تمہیں تو سکھ ہونا چاہئیے کہ میں نے جو پسینہ بہایا تو اپنا گارا بنایا اپنی آگ جلا کر اپنی اینٹ پکائی ۔۔۔ پہلی بار پر تم کچھ کہتے کہتے چپ ہوئے ہو ۔۔"

"تم اس میں رہو گے"؟

"ہاں" ۔ ڈورگا میں اچنبھا تھا ۔

"کب تک"؟

"کب تک ؟ ۔۔۔ جب تک میں ہوں ۔ اور پھر میرے جائے اس میں رہیں گے ۔۔۔ اور پھر ان کی اولاد تب تک ۔۔۔"

ورچن نے سر جھٹکا "پر تم نے دیر کر دی" ۔۔۔

"کیسی دیر؟" ڈورگا نے اس کا کندھا پکڑ کر منہ اپنے سامنے کیا ۔ "کیسی دیر؟" ۔۔۔ میرا خیال ہے تم دھوپ میں چلتے آئے ہو اور تمہارا بھیجہ کچھ پگھل گیا ہے ۔۔۔ اور تم ایسی باتیں

کرتے ہو" ۔۔۔ وہ گیلی دیوار کے سائے میں رکھی جھجھر سے اس کے لئے پانی کا ایک پیالہ بھر لایا "لو اپنے آپ کو ٹھنڈا کر لو"

ورچن نے پیالا اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اس میں لرزتے پانی کو دیکھا "تم نے دیر کر دی ہے ۔۔۔" اور پھر ایک ہی سانس میں پیالہ ایسے خالی کیا کہ اس کی وراچھوں سے بہہ کر پانی کی دھاریں زمین پر گریں ۔

ابھی ڈورگا اسے پانی دے رہا تھا اور ویسا تھا جیسا کہ وہ خود تھا اور ابھی اس کا مہاندرہ یوں بدلا کہ وہ پھر سے بوڑھا ہو گیا ۔ نہ صرف بوڑھا ہوا بلکہ بہت بوڑھا ہو گیا اور اس کا سر لرزنے لگا اور اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور اس کی ناک چکنے اور پھیلنے لگی اور اس نے کان پر ہاتھ رکھ کر ادھر کیا جدھر رکھوں کا ذخیرہ تھا اور بیٹھی ہوئی آواز میں بولا ۔۔۔ "سنو"

ورچن نے ادھر کو دھیان کیا ، آنکھیں بند کر کے کان پر ہاتھ رکھ کر ادھر کو پورا دھیان کیا پر ادھر کچھ نہ تھا چپ تھی ۔

"تم نے سنا" ؟ ڈروگا نے پوچھا ۔

"نہیں ۔۔۔"

"صرف میں سنتا ہوں" ۔۔۔ ڈورگا بولا ، "اور میں ڈرتا نہیں ۔۔ وہ مجھے بلاتا ہے اور میں جاؤں گا"۔

"کون ڈورگا" ؟

"وہی جو ڈکراتا ہے ۔۔۔ جس نے میرے جسّے کو ادھیڑا تھا وہی بلاتا ہے" ۔۔۔

ورچن نے ایک بار پھر کوشش کی کہ کچھ سن لے پر وہاں سننے کو کچھ نہ تھا اور اس نے یہی جانا کہ ڈورگا بوڑھا ہے اور دھوپ میں اینٹیں اٹھاتا ہے اور گارا بناتا ہے تو اس کے بھیجے پر بھی اثر ہو گیا ہے اس لئے وہ مسکرانے لگا "تم بھی ایک پیالہ پانی پی لو اور اپنے کو ٹھنڈا کر لو ۔۔"

"تم جانتے نہیں کہ وہ مجھے بلاتا ہے" ؟ ڈورگا نے دکھ سے کہا ۔ "تم سنو تو سہی ۔۔۔ تم سنتے ہی نہیں"۔

"ہاں میں سنتا ہوں" ۔۔۔ ورچن نے ہاتھ میں پکڑا پیالہ زمین پر رکھا اور پھر جھجھر کو گلے سے پکڑ کر اس پر الٹا دی ۔۔۔ کچھ پانی پیالے سے باہر گرا ۔ "تم چلے جانا اگر وہ بلاتا ہے لیکن ابھی یہ پانی پیو" ۔۔۔

ڈورگا نے پیالہ تھاما اور ایک گھونٹ بھر کر رکھ دیا ۔ "تم سمجھتے ہو کہ میں ڈھیلا ہو گیا ہوں اور

سنتا ہوں جب کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے ۔ تم بنا شک چل کر دیکھو وہاں وہ ہے اور وہ ڈکراتا ہے اور مجھے بلاتا ہے"۔

ورچن نے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کو منہ پیڈا کر لیا ۔۔ "نہیں نہیں ڈورگا تم ڈھیلے کیسے ہو سکتے ہو ۔۔۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو" ۔۔۔

"جھجھر میں اور پانی تو نہیں ہے ۔"؟

"نہیں ۔۔۔ دریا کا لاتے ہو" ؟

"نہیں ۔۔۔ پاروشنی کے کنوئیں میں سے نکال کر لاتا ہوں ۔۔۔ اس کا سواد الگ ہے ۔۔ تم جان نہیں سکے"؟

لگتا تھا کہ یہ سواد اپنا ہے"

ورچن ہنسنے لگا ۔۔۔"۔۔۔ اور ڈورگا" ۔۔۔ ورچن یکدم چپ ہوا ۔۔۔"تم جانتے ہو کہ سارے کے سارے لوگ ادھر گھاگھرا ۔ کے کنارے دن رات کرتے ہیں ۔ چولہے چنگیریں اور پیڑھیاں چھپروں سے نکال کر وہاں لے آئے ہیں تاکہ بڑے پانی کو آتا دیکھ سکیں" ۔۔۔

"ہاں مجھے پتہ ہے" ۔۔۔ ڈورگا نے کہا ۔۔۔ "مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ مجھے بھی ان کے ساتھ ہونا چاہیئے ۔ میں اب اس بستی کا ہوں پر تم سمجھو کہ میرے لیے پکی اینٹوں کی یہ چار دیواری بنانا ایسا ہے کہ جب میں ایک اینٹ لگاتا ہوں تو میں اور زندہ ہوتا ہوں اور وہ سارے سانس جو میرے تھے پر دوسروں نے لئے میرے پاس واپس آتے ہیں ۔ بس دو چار دن کا کام ہے اور یہ پورا ہو جائے گا ۔ پھر میں اس کے اوپر چھت ڈالنے کو سروٹ لاؤں گا اور پھر تمہارے ساتھ جا بیٹھوں گا ۔۔۔ میرا چولہا اور چنگیر تو پکلی لے جا چکی ۔۔۔

"میں چلتا ہوں ۔۔۔"

وہ ڈورگا سے کچھ دور آیا ہو گا کہ اس کی آواز پیچھے آئی "ورچن" ۔۔۔

وہ مڑا ۔ ڈورگا اس کی طرف دیکھتا تھا ۔" دیکھو مجھے خیال نہیں رہا پوچھنے کا ۔۔۔ پاروشنی اپنے چھپر میں نہیں ہے ناں ۔ تو ایک عجیب بات ہے ۔ پتہ نہیں ہے کہ نہیں پر مجھے عجیب لگی "۔۔۔

"کیا؟"

"تم ادھر آ کر سنو" ۔۔۔ ڈورگا نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ادھر ۔۔۔

ورچن پھر واپس ہوا "ہاں کیا کہتے ہو"؟

ڈورگا تھوڑا سا بودن لگ رہا تھا کہ میں یہ کیا کہنے لگا ہوں پر اس نے کہہ دیا ۔۔۔ "میں جب کنوئیں میں بوکا پھینکتا ہوں تو وہ ۔۔۔ دیر سے پانی کو لگتا ہے"۔

"کیا ؟" ورچن نے تیوڑی چڑھائی "کس کنوئیں پر"؟

"میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں پاروشنی کے کنوئیں سے پانی بھرتا ہوں اور کچھ دنوں سے ایسا ہے کہ ۔۔۔ دیکھو جب میں بوکا اٹھا کر کنوئیں میں گراتا تھا تو مجھے پتہ ہوتا تھا کہ میں ایک دو تین بار اوپر نیچے سانس لوں گا ، تو چوتھے سانس پر یہ پانی کو جا لگے گا اور چھپاک کی آواز آئے گی ۔۔۔ پر ۔۔۔ کچھ دنوں سے ایسا ہے کہ تین بار سانس لینے کے بہت بعد آواز آتی ہے" ۔

ورچن سمجھا تو سہی پر اسے ایسے دیکھا جیسے نہ سمجھا ہو ۔۔۔ "اچھا"

"ہاں" ڈورگا کے چہرے کی کالک گہری ہوئی ۔ "پانی نیچے ہو گیا ہے"

"اچھا" ورچن نے سر کھجایا "نہیں" ۔۔۔

"ہاں" ۔۔۔

ورچن کے اندر یہ بات دور تک گئی اور بہت دیر کے بعد چھپاک سے کہیں گری کہ پانی نیچے ہو گیا ہے ۔۔۔

کچھ دن اور گزرے اور ایسے ہی گزرے ۔۔۔

انہوں نے اشوں کی سانس سکھانے والی دھوپ سے بچاؤ کے لئے کنارے کے ساتھ ساتھ سروٹوں کے چند چھپر بنا لئے ۔۔۔ یوں تو جن کے ذمے ڈھور ڈنگر کا چارہ تھا وہ سویرے سویرے اپنے ڈیروں کو جاتے اور ان کے لئے چارہ بنا کر ان کے آگے ڈال آتے ۔۔۔ پر اب وہ ڈنگروں کو بھی ساتھ لے آئے اور کنارے کے ساتھ سروٹوں کے چھپروں تلے باندھ دیا ، ایسے اب وہ گھٹنوں پر سر رکھے نرا گھاگھرا کو نہ دیکھتے بلکہ ڈنگروں کی دیکھ بھال میں جی لگاتے اور پھر شام ہوتی تو کنارے پر آ بیٹھتے کیونکہ جب بھی بڑے پانی آتے تھے تو شام کے وقت ہی آتے تھے ۔۔۔ چارہ سوکھا ہوتا تھا اور کم ہوتا تھا ۔ جو بیٹھے تھے ان میں کومی بھی تھی ۔

سانجھے کام کاج کے سوا ہر کوئی اپنی من مرضی سے کچھ نہ کچھ اور بھی کرتا تھا جیسے کھیت کھودنا اور بیج ڈالنا تو سانجھا کام تھا ۔ چھپروں کے گھڑوں میں پانی بھرنا ۔ چھپر بنانا ۔ برتن پکانا ۔ دریا میں سے مچھلیاں پکڑنا یا رکھوں میں جا کر جنور مارنا تو اپنا اپنا کام تھا ۔۔۔ یوں کومی کا کام اُپلے تھاپنا تھا اور پھر انہیں سکھا کر سب میں بانٹ دینا تھا ۔ یہ نہیں کہ بستی میں اور کوئی اُپلے نہیں تھاپتا تھا ۔ سبھی اپنے ڈنگروں کے گوبر کو کام میں لاتے تھے پر کومی گوبر سے ایسی چیزیں بناتی

جیسے پکی مٹی سے برتن بناتی تھی ۔۔۔ وہ اپلوں کی صورت نکالتی تھی اُن کی شکلیں بناتی تھی ۔ وہ یہ جانتی تھی کہ کس جنور کا گوبر کیا کھانے کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ اسے سکھانے کے بعد جلایا جاسکتا ہے ایسے کہ وہ بالکل دھواں نہ دے یا اس میں بُو نہ ہو ۔۔۔ اور پھر بھی اس میں آگ زیادہ بنے ۔۔۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کتنا گوبر کتنی مٹی میں ملا کر لیپ دیں تو وہ پکّا ہوتا ہے اور کیڑوں مکوڑوں کو دور رکھتا ہے کیونکہ گوبر کے لیپ میں چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے پاس نہیں آتے ۔۔۔ کُومی بھی یہاں تھی سب کے ساتھ پر اب وہ کچھ اپنے دھیان میں نہیں رہی تھی ۔ وہ اُپلے تھاپتی اور پھر اُنہیں کسی دیوار کے ساتھ لگانے یا میدان میں سکھانے کی بجائے پانی میں پھینکتی جاتی ۔۔۔ اور یہ کام وہ منہ پیڈا کر کے بڑی لگن سے کرتی ۔۔۔ وہ ایسا کیوں کرتی تھی ،اس سے کون پوچھتا ،بس وہ ایسا کرتی تھی ۔

اور ان بیٹھنے والوں میں گجرو ۔ کولا ۔ گوگا ۔ شُکرا اور بُوٹی تھے اور کاری ۔ جنّو ۔ لکّھی ۔ چولی اور ہرمی بھی تھیں اور پھر ۔ بچے تھے جو بڑوں کے منع کرنے کے باوجود پانی میں اُتر جاتے اور سارا دن نہاتے رہتے ۔

بستی میں رہ جانے والے کتّے پہلے تو شام ڈھلے ادھر آجاتے اور ہر چولہے کے سامنے کھڑے ہو کر دُم میں ہلا ہلا کر اپنا حصہ مانگ لیتے اور پھر رات کو جیسے راکھی کرنے واپس چلے جاتے پر اب وہ آلکس سے مارے گئے تھے اور واپس بستی کو نہیں جاتے تھے ، وہیں اِدھر اُدھر پڑے رہتے تھے ۔۔۔ بستی جو بندوں کے بغیر تھی اس کی راکھی کرنے سے کیا فائدہ ۔۔۔ ایسا لگتا تھا جیسے ٹیلے پر پھیلی ہوئی چھپروں کی بستی اب ہمیشہ کے لئے اجڑ چکی ہے اور لوگ اب یہیں دریا کے کنارے ہی بسیرا کریں گے ۔

دیر ہو رہی تھی ۔ پر سب تسلی میں تھے کہ اب وہ آتے ہوں گے ۔۔۔ ہم انہیں سنیں گے ، ان کی جھاگ دور سے دکھائی دے گی اور اس کے پیچھے وہ آجائیں گے ۔

عورتیں سارا دن اپنے لیڑوں میں تروپے لگاتی رہتیں ۔ سمرو، مہریں بنانے کا سامان ساتھ لے آیا تھا اور وہ انہیں نت نئے روپ دیتا پر توڑ دیتا ۔۔۔ وہ جب سے ادھر گھاگھرا کے کنارے پر آیا تھا تب سے وہ سوتے میں کہیں نہیں گیا تھا ۔۔۔ اور اس کو پیاس بھی کم لگتی تھی ۔ ہاں پاروشنی نے اسے رات گئے دیکھا تھا کہ وہ اٹھتا ہے اور دریا کے اندر جا کر پانی پر منہ رکھ کر اسے جنوروں کی طرح شڑپ، شڑپ اپنے اندر اتارتا ہے اور وہ جانتی تھی کہ وہ پیاسا ہے ۔ پر اس نے سمرو کو یہ نہیں بتایا کہ تو اب بھی رات کو سوتے میں چلتا ہے اور اسی لئے وہ اس خیال میں تھا کہ اب اسے پیاس نہیں لگتی اور اب وہ سوتے میں کہیں نہیں جاتا ۔

مرد کھیتی میں کام آنے والے اوزاروں کی مرمت کرتے رہتے اور رات گئے پہلے تو اپنی عورتوں کے ساتھ ہوتے تھے پر اب وہ اس کام سے بھی پرے ہو گئے تھے ۔۔۔

دھروا جو شروع میں منہ کھولے بڑبڑاتا تھا اور باتیں کرتا تھا اب چپ رہتا تھا ۔

ایک گھبراہٹ اور بے چینی تھی جو دھیرے دھیرے ان سب میں تیرنے لگی تھی ۔ یہ گھبراہٹ ان کے جثوں میں مرتے پکھیروں کی طرح پھڑپھڑاتی تھی اور وہ جان نہ پاتے تھے کہ ایسا کیوں ہے ۔

گجرو اور چمرو بارے لوگ کہتے تھے کہ جو انہیں بولتا سنے گا وہ اپنی حیاتی سے زیادہ جئے گا کیونکہ یہ دونوں بہت ہی کم بات کرتے تھے ۔ ہاتھ کے اشاروں سے اور سر کے ہلانے سے وہ پرے نہ ہوتے بس سر جھکائے کام کرتے رہتے ۔ سوتے ، کھاتے پیتے ، کام کرتے اور اپنی گھر والیوں کے پاس جاتے پر بات نہ کرتے ۔۔۔ اور یہ کوئی اچنبھے والی شے نہیں تھی بس وہ ایسے ہی تھے پر وہاں گھاگھرا کے کنارے جب ایک شام کوئی بھی چولہا نہ جلا اس لئے کہ کسی کا جی نہ چاہا کہ اُپلے سلگائے تو گجرو پہلے بولا اور بعد میں چمرو نے اس کا ساتھ دیا "ہماری ناک میں جو اُپلوں کے جلنے کی بو نہیں آتی تو سمجھو ہم نے سانس نہیں لیا ۔۔۔ ہم میں جب سے سمجھ بوجھ آئی ہے تب سے شام ڈھلے ہماری ناکوں نے اپلوں کے دُھوئیں کو ایسے سُونگھا ہے کہ وہ ہمارے سارے جثے میں پھیلتا ہے اور بتاتا ہے کہ شام ہوئی اور اب خالی چنگیریں روٹیوں سے بھریں گی ۔۔۔ پر آج شام ایسا نہیں ہوا ۔۔۔ صرف اس لئے کہ بڑے پانیوں کے آنے میں دیری ہوئی جا رہی ہے اور ہم مارے گھبراہٹ میں ہیں ۔۔۔"

اُن سب کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لئے وہ ان دونوں کے گرد ہو گئے کہ دیکھیں یہ کیا کہہ رہے ہیں ۔

"اچھا تو تمہاری مت میں کیا آتا ہے کہ ہم کیا کریں"؟ بوٹی بولا ۔ بوٹی بستی میں کتوں کے ساتھ مل کر راکھی کرتا تھا ۔ یہ تو نہیں کہ وہاں چُرانے کو بہت کچھ تھا یا بستی میں کوئی ایسا تھا جو دوسروں کی چیزوں پر نظر رکھتا ہو پر کبھی ایسا ہوتا کہ بستی کے آس پاس رات دو رات ٹھہرنے والا کوئی تیپڑی واس ادھر آجاتا اور جو کچھ ہاتھ لگتا لے جاتا ۔۔۔ اور راکھی کی ضرورت یوں بھی تھی کہ کوئی ڈھور ڈنگر کھل کر کہیں چلا نہ جائے ادھر ڈوبو مٹی کی طرف یا ریت میں ۔۔۔ تو اس لئے اسے بوٹی راکھا بھی بولتے تھے اور اسے نے یہی پوچھا کہ تمہاری مت میں کیا آتا ہے کہ ہم کیا

کریں ۔۔۔ وہ دونوں جبّو کے پاس آئے اور کہنے لگے "جبّو تم اس گھاگھرا کے کنارے کب سے ہو ۔۔۔ کچھ یاد ہے ؟" جبّو ایک ایسی بوڑھی تھی جو اس سے بھی بوڑھی تھی جس سے اسے کسی نے بھی پہلی بار دیکھا تھا ۔۔۔ وہ چلتی پھرتی کم تھی اور آنکھیں بند کئے چھپر تلے لیٹی رہتی تھی ۔ پاروشنی اسے کھانے پینے کو دے آتی تو جبّو بھی یہاں تھی سو اس نے بھی کہا کہ تم دونوں جو شور کرتے ہو تو ہم کیا کریں ۔۔۔

"تم سب میرے بعد آئے" ۔۔۔ وہ بولی ۔۔۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کب سے ہوں پر یہ ہے کہ جب میں نے چلنا پھرنا سیکھا تو رکھوں میں پہلی بار مور بولا تھا" ۔

"تو پھر کبھی ایسا ہوا کہ بڑے پانی نہ آئے ہوں"؟ وہ دونو اُس پر جھکے ۔

جبّو نے ان کے بے چین زور والے جسّے دیکھے اور پھر حیرت سے بولی "ایسا کیسے ہو سکتا ہے ؟ ایسا تو کبھی نہیں ہوا ۔۔۔ اور نہ ہو گا" ۔

اب آلکسی کا مارا ہوا لنگ کا بھکشو بھی اپنے کو گھسیٹتا آگے آیا "میں تمہیں بتاؤں ۔۔۔ میں بتاؤں"

"نہ تم نہ بتاؤ" ۔۔۔ سکھی جو تنور بخناتی تھی اور اپنی روٹی کے بدلے سب کی روٹیاں لگاتی تھی کہنے لگی "۔۔ تمہیں اور تمہارے لِنگ کو روٹی ملتی ہے ۔ سرسوں کا تیل اور گُٹّے کے پھول ملتے ہیں ۔ تم بس اسی لئے ہو ۔ تم نے کیا بتانا ہے ۔ نہ کام نہ کاج ۔ تم کیا بتاؤ گے "

بھکشو گردن پر بڑھا ہوا ایک ناخن چلاتا پیچھے ہو گیا ۔ تب وہ دونوں کہنے لگے جبّو کہتی ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا پر اب کی بار دیری ہو رہی ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ گھاگھرا ہم سے روٹھ گیا ہو اور اس کے من میں یہ آتا ہو کہ ہم اسے منائیں ؟۔۔

"کیسی بے سمجھی کی بات کرتے ہو" ۔۔۔ پاروشی پہلی بار بولی ۔ "گھاگھرا تو ہم خود ہیں ، ہم سب ۔۔۔ تو ہم اپنے آپ سے کیوں روٹھیں گے ۔۔۔۔"

"نہیں ایسا ہی ہوا ہے" ۔۔۔ وہ دونوں تیز بول بولے "اور ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا ہو گا ۔"

"یہ ٹھیک کہتے ہیں ۔۔۔" دھروا نے اپنی داڑھی ٹھوڑی کے ساتھ چپکانے کی کوشش کرتے ہوئے سرہلایا "ہمیں کچھ کرنا چاہیے ، کتنے دن ہو گئے ہیں اسے دیکھتے ؟ گھٹنوں پر ٹھوڑیاں رکھے اسے آس سے دیکھتے"

"کیا ؟" ان سب کے مہاندرے گُرو اور چمرو کو دیکھتے تھے کہ دیکھیں یہ کیا کہتے ہیں ۔

"جب بچہ روٹھتا ہے تو ہم اسے کچھ کھانے کو دے کر اور گھگھو گھوڑے دے کر مناتے ہیں اور جب گھر والی منہ پرے کرے تو اسے کنگن اور منکے دیتے ہیں اور ۔۔۔ اگر پانی روٹھ جائیں تو انہیں ۔۔۔ اب یہ ہمیں نہیں پتہ کہ پانیوں کو کیا چاہیے ۔۔۔"

"میں بتاتا ہوں" بھکشو اب ایک نئے زور سے آگے آیا "بڑے پانی آنے میں دیری ہوئی تھی ۔ کتنے لوگ آتے ہیں ادھر لِنگ پر پھول چڑھانے تیل ڈالنے اور آگ کی جگہ میں آگ جلانے ۔۔۔ تو ایسا کرو گے تو یہی ہو گا ۔ بڑے پیپل کے تنے میں اب کوئی دیا جلا کر نہیں رکھتا ۔۔۔ رکھوں ۔ بوٹوں اور پانیوں میں بھی تو جان ہوتی ہے اور ہماری جان ہوتی ہے تو ہم ان کا دھیان کیوں نہیں کرتے ۔ تو یہی ہو گا ۔"

پاروشنی کی آواز دھیمی تھی پر اس کی آنکھیں سرخ ہوتی تھیں ۔ "لنگ پر پھول چڑھانے یا نہ چڑھانے سے کچھ نہیں ہوتا" ۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ بڑے پانی ابھی تک کیوں نہیں آئے ۔۔۔ یہ ہمارا دوش ہے ۔ ہم برے ہیں ماتا کے آگے سر نہیں جھکاتے ۔ اُن پوتر بیلوں کو چارہ بھیجتے ہیں تو بڑبڑا کر اور خوشی کے بغیر ۔۔۔ ہماری برائیوں کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے ، ہاں میں تمہیں بتاتا ہوں ۔"

"بڑے پانی جانے کیوں نہیں آئے ۔ پر اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ۔۔۔ یہ صرف وہ پانی ہی جانتے ہیں کہ وہ کیوں نہیں آئے ۔" پاروشنی کی آواز مدھم تھی اور وہ یہ کہہ کر پرے ہو گئی

"میں بتاتا ہوں" ۔ بھکشو نے سرہلایا ۔ "مجھ سے پوچھو ۔ جو شے تمہیں سب سے بھلی لگتی ہے وہ گھاگھرا کو دے دو ۔۔۔ دے دو تو یہ مان جائے گا ۔۔۔ اور پانی آئیں گے ۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا ہو گا ۔ میں نے رات اس سے باتیں کی تھیں اسے سنا تھا ۔ تم بھی جانتے ہو کہ میں پانیوں کی زبان سمجھتا ہوں ۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے ایک کان دریا کی طرف کیا اور پھر تھوڑی دیر اپنے میں گم ہونے کے بعد بولا "ہاں پانی کہہ رہے ہیں کہ وہ تم سے روٹھے ہوئے ہیں" ۔

صرف پاروشنی ۔ ورچن اور سمرو بیٹھے رہے باقی سب بکھر گئے ، کوئی اپنے ڈیرے کو، کوئی کھیت کو، کوئی چھپر کی طرف ۔۔۔ وہاں سے کوئی ایسی شے لانے کو جو اس نے گھاگھرا کو منانے کے لئے اس میں ڈالنی تھی ۔ وہ اتنے جوشیلے ہو رہے تھے کہ انہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ اب رات ہے اور اندھیرا ہے ۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ؟ سمرو بولا" ۔

"یہ ان کی گھبراہٹ ہے ۔۔۔ یہ سہارا ڈھونڈھتے ہیں پر ان کو ایسا کرنے دو ان کا بوجھ ہلکا ہو گا"

کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی پونجی گھاگھرا کنارے آتے ساتھ لے کر آئے تھے انہوں نے جانے کیا کچھ پانی میں پھینکا ۔۔۔ رات تھی ، دکھائی نہ دیتا تھا کہ وہ کیا پھینک رہے ہیں ۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آنے لگے ۔۔۔ اور جو کچھ وہ لائے تھے اسے دریا میں رکھنے لگے ۔۔۔ وہ کیا لائے تھے صرف وہ جانتے تھے کہ رات تھی اور دکھائی نہ دیتا تھا کہ وہ کیا لائے ہیں ۔۔۔ وہ جو شے پانی میں ڈالتے وہ خاموشی سے بہنے لگتی یا ڈوب جاتی سوائے ایک شے کے جو رونے لگی ۔۔۔ اور پاروشنی جہاں تھی وہیں پتھر ہوئی "۔۔۔ ورچن وہ روتا ہے" ۔۔۔

ورچن نے کان لگا کر سنا ۔۔۔ اور وہاں اب تو کچھ نہ تھا کیونکہ جو کچھ تھا ڈوب چکا تھا اور بہہ چکا تھا ۔۔۔ کچھ نہیں ہے ، ایسا نہیں ہے ۔

پاروشنی چپ رہی ۔

پر ادھر کنارے پر اب ایسا تھا جیسا کہ گرمیوں کی شام میں بستی میں ہوا کرتا تھا ۔ وہ ہنستے تھے اور باتیں کرتے تھے اور ان کے اندر جو گھبراہٹ تیرتی تھی وہ جا چکی تھی ۔ چولہوں میں اُپلے سلگنے لگے اور ان کا دھواں رات کی سیاہی میں بھی مدھم نظر آتا تھا ۔ ورچن اپنے گھٹنوں پر سر رکھے اس اندھیرے کو دیکھتا تھا جس میں گھاگھرا بہہ رہا تھا ۔۔۔

ہاں وہ جو سب ندیوں میں سے پیاری ندی ہے ۔ سات بہنوں والی ۔۔۔
سرسوتی ۔ تم پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہو ۔ ہمیں نفرت سے بچانا ۔
سات بہنیں جو تین جگہوں سے پھوٹی ہیں اور پانچ قبیلوں کو فائدہ دیتی ہیں اور بڑی ندیوں سے بھی بڑی سرسوتی ۔۔۔
اور ہماری دوستی اور جھکاؤ قبول کر ۔۔۔
ہمیں اپنے سے جدا کر کے ۔۔۔ دور دیسوں میں نہ بھیج دینا ۔

ورچن نے آخری لفظوں کو دیر تک اپنے ہونٹوں تلے رکھا ۔ ہمیں اپنے سے جدا کر کے ۔۔۔ دور دیسوں میں نہ بھیج دینا ۔

پاروشنی کے چولہے میں بھی اُپلے سلگتے تھے اور اس کی چنگیر روٹیوں سے بھرتی تھی ۔ سمرو اور ورچن سر جھکائے روٹی کی مہک میں تھے اور اسے کھاتے تھے ۔۔۔ کُتا آج بھی تھا اور نہ سروٹ سرسراتے تھے اور نہ ہی دریا کی کوئی بولی تھی ۔۔۔ ہر شے تھمی ہوئی تھی ۔

ایسی خاموشی تھی کہ پرالی پر لیٹے ہوئے جب پاسا پلٹتے تو چرمراہٹ دور تک جاتی ۔۔۔ پاروشنی کی آنکھیں کھلی تھیں ۔ وہ سر کے نیچے بازو رکھے ادھر دیکھتی تھی جدھر رات کے پچھلے پہر میں دریا سیاہی میں ایک اور سیاہی تھا ۔

وہ اٹھی تو پیرالی کی چرمراہٹ اس کے پاؤں تلے دب گئی ۔ کنارے پر لوگ نیند میں بے سدھ تھے ۔ وہ بے سدھ تھے کہ ہم تو جو کرنا تھا کر چکے اور اسے منا چکے تو اب بڑے پانی آ رہے ہوں گے ۔۔۔ وہ انہیں پھلانگتی ان کے پھیلے ہوئے بازوؤں اور ٹانگوں سے بچتی سروٹوں کی طرف چلنے لگی ۔ تھوڑی دیر میں وہ سب پیچھے رہ گئے جو سوتے تھے ۔ اور ان میں ورچن اور سمرو بھی تھے ۔۔۔ سروٹ اور کاہی کا جھنڈ جو سدا سراسراتا رہتا تھا گم کھڑا تھا ۔ وہ اسی میں سہجے سے جھجکے بنا داخل ہوگئی کہ وہ اسے جانتی تھی ۔ وہ نرا چلتی تھی دیکھتی نہ تھی اور سیاہی جو تھی تو دکھائی نہ دیتا تھا ۔۔۔ جہاں اس کے پاؤں پڑتے ان کے آسے پاسے کچھ رینگ جاتا تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ کچّھو ہیں جو اس کے پاؤں سے بچنے کو ادھر ادھر سرکتے ہیں ۔۔۔ سروٹوں کی تیز دھاریں اس کی باہوں پر سرخ لکیریں کھینچتی جاتی تھیں پر وہ ان کی کاٹ سے بے پرواہ چلتی جاتی تھی ۔ سروٹ ختم ہوئے تو آگے اونچا کنارہ تھا اور وہ جھک کر بے تکان اس پر چڑھنے لگی ۔ اوپر پہنچ کر وہ پل بھر کے لئے رکی صرف اس کی ناک اس نمی کو محسوس کرتی تھی جو اس کے سامنے تاریکی میں چھپی ہوئی تھی ۔ وہ اپنے پیر جماتی سنبھالتی دوسری طرف اترنے لگی ۔ اس کے ننگے پاؤں تلے جب کنکریاں چبھیں تو یہ دریا کا راستہ تھا ۔۔۔

اس نے آسے پاسے دیکھے بغیر اپنے سینے پر بندھا لیڑا ڈھیلا کر کے کھول دیا ۔ لیڑے کی پکڑ سے چھوٹتے پر اس کی چھاتیاں پل دو پل کے لئے ایسے تھرتھرائیں جیسے چنکارے ہرن کی پیٹھ پر زہریلی مکھی بیٹھنے سے وہ ہلتی ہے پل دو پل کے لئے ۔۔۔ اور پھر وہ اپنے بوجھ کو سہار کر باقی بدن کا ایک خاموش حصہ بن گئیں ۔ دریا کی باس کو انہوں نے ایک ناک کی طرح سونگھا اور اپنے اندر رچایا ۔

پھر پاروشنی نے اپنی لونگی کے لڑ کھولے ۔۔۔ وہ کسی ہوئی تھی ۔ اس کے کولہوں کے گرداگرد ماس یوں دبا اور ابھرا ہوا تھا جیسے رات ان پر کوئی برساتی کیڑا چل گیا ہو ۔

وہ سیدھی کھڑی ہوگئی ۔۔۔ وہ اپنی نسل کا خاص قدبت لئے ہوئے تھی ۔

اس نے پانی میں پہلا قدم جھجکتے ہوئے رکھا اور پھر زمین کی مانند اس پر چلنے لگی ۔۔۔ دس بارہ کرو کے بعد پانی اتنا گہرا ہوا کہ وہ اس میں بیٹھ جائے تو گردن تک آجائے اور وہ اپنے آپ کو دھو سکے ۔ وہ بیٹھ گئی ۔۔۔ پر اس نے اپنے آپ کو دھویا نہیں ۔ وہ ایسا کرنے نہیں آئی تھی سننے آئی تھی ۔

اس نے اپنا کان بہتے پانی کے ساتھ لگایا تو وہاں اس کے چلنے کی سرسراہٹ تھی ۔۔۔ وہ اپنے پورے جُثے سے سننے لگی ۔۔۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور کان تر ہیائے ہوئے پکھیرو کی طرح ترسے جاتے تھے ۔۔۔ کچھ سننے کے لئے بہتی آہٹ کے لئے ۔۔۔ پر وہاں سوائے اس دھیمی سرسراہٹ کے جو پانی کے بہنے کی تھی اور کچھ نہ تھا ۔ دریا خاموش تھا ۔۔۔ بہت دیر ہو رہی تھی ۔۔۔ اب تک اس کے بولنے کی آواز آجانی چاہیے تھی ۔۔۔ جھاگ ہچکولے لیتی آنی چاہیے تھی ۔ بڑا پانی دیر سے آئے گا ۔۔۔ اتنی دیر سے کہ جانے وہ بیج جو مٹی میں ہیں اس کی نمی سے تب پھوٹتے ہیں کہ نہیں ۔ پانی سرد تھا اور جُثے کو کپکپاتا تھا ، بھلا لگتا تھا پر ٹھنڈا تھا ۔۔۔ اوپر آسمان خالی تھا اور نیچے دریا چپ بہتا تھا اور اس میں پاروشنی بیٹھی تھی ۔ اس کے پاؤں تلے کی ریت پانی چلنے سے دھیرے دھیرے کھسکتی تھی اور اسے کے تلووں میں جلون کرتی تھی ۔ اسے کچھ چُھوا ۔۔۔ کوئی شے اس کے جُثے کے ساتھ لپٹی اور کھلی اور پھر لپٹ کر اس کے ساتھ لگنے لگی ۔۔۔ وہ ڈری نہیں کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ ایسا ہو ۔ جس سمے وہ پانی میں آتی تھی وہ یہی تو چاہتی تھی ۔ اس کے اندر اس لپیٹ کی چاہت تھی ۔ تو وہ ڈری نہیں ۔ اس نے ہاتھ پانی میں ڈال کر اپنے جُثے کے گرد لپٹے بوٹے پر انگلیاں رکھیں ۔۔۔ یہ تم تھے جس کے لئے ہم سب کئی دنوں اور کئی راتوں سے چولہے چنگیریں لئے کنارے پر بسیرا کرتے تھے اور تم نے ایک عجیب خوف ہم میں بویا تھا کہ ایسا نہ ہو تم نہ آؤ ۔ سب کے اندر یہ خوف تھا پر کوئی کچھ کہتا نہ تھا ۔ سبھی یہ کہتے تھے کہ پانی آئے گا پر ہر ایک کا اندر کہتا تھا کہ نہیں شائد نہ آئیں اور باہر یہ کہتا کہ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ نہ آئیں تو اس بار کیوں نہ آئیں اس لئے آئیں گے ۔۔۔ تو بس ہم تمہارے لئے تو دن رات اپنے گھٹنوں پر سر رکھے دریا کی ہموار زمین کو تکتے تھے کہ اس پر کوئی جھاگ تیرے یا کوئی پہاڑی بوٹا ابھرتا ڈوبتا آئے تو ہم جانیں کہ اس کے پیچھے بڑے پانی آتے ہیں ۔۔۔ سلما کا بوٹا ادھر ہوتا ہے جدھر گھاگھرا پھوٹتا ہے اور تم سلما ہو ۔۔۔ پاروشنی نے اسے ایک جاندار کی طرح بڑے رکھ رکھاؤ سے پانی سے باہر نکالا ۔۔۔ ہاں یہ سِلما تھا جو ایک لمبے سفر کے

بعد اس تک پہنچا تھا ۔۔۔ کتنے برس پہلے میں ادھر ایسے ہی آئی تھی ۔ پر تب میں نہانے کو آئی تھی ۔ اور ایک ٹہنی میرے ابھاروں کے گرد کسی لرزتے ہاتھ کی طرح لپٹی تھی اور میں نے جانا تھا کہ بڑے پانی آتے ہیں اور ادھر کنارے پر ماتی کی پُتروں کی گڈ دگڑ گڑ کرتی دھول اڑاتی جاتی تھی اور میں یہاں سے نکل کر کدھر تھی ۔۔۔ ہاں بستی کو لوٹتے سمرو کے پاس رکی تھی اور اس نے پوچھا تھا کہ یہ تیرے ہاتھوں میں کیسی ٹہنی ہے اور میں نے جھوٹ بولا تھا کہ پکلی کے لئے ہے کیونکہ بڑے پانی آنے کا پتہ چل جائے تو کسی کو بتاتے نہیں اور جب وہ آجائیں تب بتاتے ہیں کہ پہلے میں نے جانا تھا کہ یہ آتے ہیں ۔ اسے یاد آیا کہ وہ سمرو کے پاس بیٹھی تھی تو اس کا جُثہ نچڑ رہا تھا اور وہ اس کے کولہوں کو دیکھتا تھا ۔ ہاں تب میں نہانے کو آئی تھی پر آج اس رات جب کنارے پر ایک اور بستی ہے جو سوتی ہے میں اٹھ کر ادھر جو آئی تو نہانے کے لئے نہیں بلکہ صرف جاننے کے لئے کہ پانی آرہے ہیں یا نہیں اور مجھے اس لپیٹ کا اور اس چھونے کا جو میرے بدن کو پھر سے بے چین کرتا ہے انتظار تھا اور اب ۔۔۔ میں انہیں بتادوں گی کہ وہ آرہے ہیں، چھپاؤں گی نہیں، وہ سب اتنے دنوں سے گھبراہٹ میں ہیں اور وہ اجیرن اور اجاڑ ہیں ۔

پاروشنی نے بوٹے کو سونگھا اور پھر اپنا دایاں کان پانی کے ساتھ لگا کر سانس روکا تا کہ وہ دریا کے بولنے کو سن سکے ۔۔۔ اس ہلکے شور کو سن سکے جو اب ادھر آنا تھا ۔۔۔ پر ابھی وہی سرسراہٹ تھی پانی کے گم بہنے کی اور کچھ نہ تھا ۔۔۔ پاروشنی نے کان لگائے رکھا اور اس دوران اس کا جُثہ پانی کی سِیت سے ٹھنڈا ہونے لگا ۔۔ تھوڑی دیر بعد اسے لگا کہ اگر وہ پانی سے نہ نکلی تو اسے ضرور تاپ چڑھے گا اور وہ مرے گی پر اس نے اپنے آپ کو باندھے رکھا اور کان لگا کر بیٹھی رہی ۔۔۔ صرف وہی سرسراہٹ تھی پانی کے گم بولنے کی اور کچھ نہ تھا ۔

"می آؤں ۔ می آؤں" ۔۔۔ رکھوں میں سے مور کی بجھتی اور بوڑھی آواز آئی اور پاروشنی نے ٹھٹک کر سر اٹھالیا ۔۔۔ مور نے جان لیا تھا تو وہ کیوں نہ جان سکی ۔۔۔ وہ جاننا نہیں چاہتی تھی اس لئے ۔۔۔

وہ پانی میں سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بوٹا ہاتھ میں پکڑے کنارے پر آگئی ۔ اپنے آپ کو لیڑوں میں کرنے کے بعد وہ سروٹوں میں ہوئی اور ان سے نکل کر جدھر کنارے پر لوگ سوتے تھے ادھر جانے کی بجائے بستی کی طرف چلنے لگی ۔۔۔ اس کی مہین آنکھوں میں پانی تیر رہے تھے اور اس کا جُثہ ٹھٹھر رہا تھا ۔ بستی رات میں تھی اور چپ پڑی تھی ۔ کُتے ادھر کنارے کی طرف جا کر چولہوں کے پاس لیٹ چکے تھے اور اب ادھر ایک غیر موجودگی تھی کہ یہاں تھے اور اب نہیں ہیں ۔۔۔

وہ اپنے گھر کی گلی میں آئی اور دُھول پر چلتی کواڑ کھول کر چھوٹے کمرے میں آگئی ۔ برابر میں راہداری تھی جو پانی کے کمرے میں جاتی تھی جہاں کنواں تھا ۔۔۔ اور اسے یاد آیا کہ وہ شائد ایک پہر دریا میں بیٹھی رہی کان لگا کر بیٹھی رہی پر اس نے اپنی پیاس کو کم نہ کیا اور اسے اب یاد آیا کہ ادھر اس کا اپنا کنواں ہے ۔ کنوئیں والے کمرے میں صرف راہداری آتی تھی اور یہاں پہنچ کر دن میں بھی پاروشنی دیر تک دیکھتی رہتی اور تب جا کر اسے منڈیر پر رکھا بوکا اور اس سے بندھی سلما کی رسی دکھائی دیتی ۔۔۔ اور اب تو باہر بھی رات تھی اور پوری کالک کے ساتھ تھی ۔۔۔ اسے بہت دیر تک کچھ سجھائی نہ دیا اور جب کچھ دکھائی دیا تو وہ ڈورگا کا سیاہ وجود تھا جو منڈیر پر بیٹھا اسے تکتا تھا ۔ وہ جھجھک گئی کہ یہ کیا ہے اور یہاں کیا کرتا ہے اور پھر ڈورگا خود ہی بولا "میں آپ ہی چپ رہا کہ تو ٹھٹھک نہ جائے ۔"

"تم اس سمے یہاں کیا کرتے ہو؟"

میں اس سمے ہر رات پانی لینے ادھر آتا ہوں" اور اس نے بوکے پر ہاتھ رکھا ۔۔۔ "اور اسے باہر کھینچنے میں میرا زور لگا تو میں کچھ ہانپ گیا ۔ بس یہاں دم لیتا ہوں کہ ٹھیک ہو جاؤں تو چلوں ۔۔ اور تم ادھر کیا کرتی ہو ؟"

"میں تو اپنے گھر میں آئی ہوں ۔۔۔"

"ہاں ، پر سارے لوگ اُدھر ہیں تو تم اکیلی اِدھر کیا کرنے آئی ہو ؟"

"میں بس اب آگئی ہوں ۔۔۔ مجھے پانی دو"

ڈورگا نے بھرا ہوا بوکا اٹھا کر اسے جھکایا اور پانی کی دھار کے نیچے پاروشنی نے ہتھیلیاں جوڑ دیں ۔ تاریکی کی وجہ سے وہ فوراً دھار نیچے نہ آئیں اور تھوڑا سا پانی فرش پر چھینٹے اڑاتا گرا ۔ ان میں سے کچھ چھینٹے پاروشنی کی ٹانگوں پر پڑے ۔۔

"تم ادھر سو رہو ڈورگا"

"تم میں ڈر ہے اس لئے"

"نہیں مجھ میں کچھ بھی نہیں ہے ۔ میں خالی ہو گئی ہوں جیسے منڈیر پر رکھا بوکا ہوتا ہے ۔ مجھ میں ڈر نہیں ۔۔۔ تم جاؤ"

ڈورگا اپنی جھجھ بھرنے کے بعد جانے لگا تو وہ اندھیرے میں کہیں رکا" ۔ ایک عجیب بات ہے جو میں نے ورچن سے کہی تھی تم سنو گی؟" ۔

"سناؤ" ۔۔۔

ڈور گانے جھجھر کو سر سے اتار کر کہیں منڈیر پر رکھا اور ایک گہرا سانس لے کر کچھ بولنے کو تھا کہ پھر چپ ہوا اور پھر کھانسا اور پھر جھجھر کو اٹھا کر سر پر رکھتے ہوئے جانے لگا۔ "تم خود ہی جان لوگی"۔۔۔ اور چلا گیا۔

پاروشنی ویہڑے میں گئی اور تھڑے پر بچھی پرالی پر لیٹ گئی۔ اس کے پاسے پلٹنے سے پرالی چرمراتی تھی اور پاسے وہ بہت پلٹتی تھی کہ وہ پہلے خالی تھی تو اب بھر چکی تھی اور اسے گھبراہٹ نے بھرا تھا اور ایک ڈر نے بھرا تھا جیسے اس کا جسم خشک ریت کی طرح اپنے اندر چوستا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ جب سے وہ ہے اور یہ دریا ہے اور اس کے ساتھ بستی ہے اور بستی کے لوگ ہیں اور اُدھر رکھ ہیں جن میں خشک جھیل ہے اور اس پر گرنے والے پرندے ہیں اور مور ہے اور کھیت ہیں اور آوے کا دھواں سیدھا آسماں کو جاتا ہے اور جب سے وہ جنم لیتے ہیں تو روتے ہیں اور جب سے ایک نے جنم لیا اور نہ رویا اور اس رات کل جگ کے پکھیرو مینہ کی طرح پانیوں پر گرے تو جب سے یہ سب کچھ ہے تو اس سب کچھ میں بڑے پانی کا آنا بھی تھا تو باقی سب کچھ ویسے ہی ہے پر وہ اس بار نہیں آئیں گے۔۔۔ پہلی بار۔۔۔ اور یہ پاروشنی جان گئی تھی اور گھبراہٹ اس کو بھرتی تھی۔

"می آؤں می آؤں"۔ رکھوں میں مور بولا

مور کے رانگلے پر ڈھیلے پڑ رہے تھے جیسے الگنی پر سوکھتا کپڑا ہو جو ڈھلکتا ہو اور دھوپ سے اس کا رنگ اڑتا ہو تو اس کے رنگ بھی اب پھیکے ہو رہے تھے۔ وہ اپنی بوڑھی ٹانگوں پر کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں دیکھتی نہ تھیں اور اس کے اوپر پیپل کے ایک گنجے ہوتے رُکھ میں وہ دونوں بیٹھے تھے اور ادھر کو دیکھتے تھے جدھر سے وہ آئے تھے پر ابھی مور کو دیکھتے تھے۔

"اسے اب اُکا دکھائی نہیں دیتا مامن ماسا دیکھ لو پچھلے کئی روز سے اپنی جگہ سے ہلا نہیں یہیں کھڑا ہے۔"

"ہاں یہ اتنے روز سے ادھر ہے جتنے روز بستی والے دریا کنارے بسیرا کر کے پھر واپس اپنے چھپروں کو لوٹے ہیں بس اتنے روز سے۔"

"اِسے کچھ ہوگا تو نہیں؟ ۔۔۔ اِن رُکھوں میں صرف ہم تین ہی تو بندے ہیں باقی تو جنور ہیں ۔۔۔ اِسے کچھ ہوگا تو نہیں؟"

"نہیں۔ یہ تب سے ہے جب سے میں ہوں اور مجھے ابھی کچھ نہیں ہوا تو اسے کیا ہوگا"۔

مور نے گردن لمبی کی اور پھر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر اپنی مہین ٹانگیں جو مشکل سے اسے سہارتی تھیں آہستہ آہستہ اٹھاتا وہ ادھر سے چلا گیا جہاں وہ اتنے روز ٹھہرا تھا جتنے روز بستی والے دریا کنارے ٹھہرے تھے۔

"تو وہ واپس چلے گئے تھے۔" چیوا نے کہا

"ہاں۔ وہاں بیٹھ کر کیا کرتے۔۔۔ سب سے پہلے پاروشنی گئی اسے میں نے دیکھا اور پھر ورچن اور سمرو اسے دیکھنے کو گئے کہ وہ کہاں گئی ہے اور پھر دوسرے سارے۔۔۔ اور پھر وہیں ورچن نے کہا کہ اگر ایک بار بڑے پانی نہیں آرہے تو کیا ہوا اگلی بار آجائیں گے۔ میں نے ایسی بستیاں دیکھی ہیں جو دریاؤں کے کنارے بستیاں ہیں پر ان کے پانی کناروں سے باہر آ کر کھیتوں میں نہیں پھیلتے تو بھی وہ بستیاں ہیں اور وہاں فصلیں ہیں اور جنور ہیں تو ہمارے پاس دریا تو

ہے ۔ یہ تو یہاں ہے ہم اس کا پانی نکال کر کھیتوں کو لے جاتے ہیں ۔۔۔"

"اچھا یہ اس نے کہا ورچن نے ۔۔۔ وہ ادھر جو جاتا ہے ۔ کالی بنگن اور ہری یوپیا کو تو وہ جانتا ہے ۔۔۔"

"وہ جانتا تو ہے" ۔۔۔ ماسا نے دانت نکو سے "پر وہ نہیں جانتا ۔ نہیں جانتا" ۔

"تو ۔ پھر کیا ہوا مامن ۔۔۔ پھر کیا ہوا ؟" چیوا نے اس کی پسلیوں میں ایک ٹہنی چبھوتے ہوئے کہا ۔ "پھر پکلی کے آوے کے سارے بھانڈے وہ لے گئے ۔ جھجریں ، گھڑے ، مٹ اور مرتبان اور وہ سب کچھ جس میں پانی ڈھویا جاسکتا تھا اور پھر میں نے ان کو دیکھا کہ وہ گھاگھرا سے بے کر ادھر رکھوں تک آتے ہیں ، جہاں تک کھیت کھودے ہوئے ہیں ، ان کا خیال تھا کہ سب سے پہلے ان کھیتوں میں پانی ڈالا جائے جو دریا سے دور ہیں ۔۔۔ تو یہ ہوا کہ پہلے پہل تو ہر کوئی جہاں جی چاہتا تھا پانی انڈیل دیتا تھا اور جب وہ بڑی دیر ادھر سروٹوں کو پار کر کے اونچے کنارے پر چڑھ کر دوسری طرف جا کے پھر پکلی کے آوے کے پاس سے ہوتے ہوئے زیبو بیلوں کے باڑھے کے قریب سے گزر کر ادھر پہنچتے جہاں انہوں نے کھیت میں دو چار گھڑے پانی ڈالا تھا تو اتنی دیر میں وہ خشک ایسے ہو جاتا کہ اس جگہ کا بھی پتہ نہ چلتا جہاں پانی ڈالا گیا تھا ۔۔۔ ہا ہا ۔ ہا ۔ ہا ۔" ماسا کی پوری بتیسی کھلی اور وہ ہنسنے لگا پر اس ہنسی میں زور نہ تھا پہلے یہ ہوتا تھا کہ وہ ہنستا تھا تو رکھوں کے سارے پکھیرو ٹھٹھک کر اڑتے تھے پر اب اس کی ہنسی میں زور نہ تھا وہ ان تک پہنچتی نہ تھی اور یوں بھی اب وہ کم ہو گئے تھے ، ٹھٹکتے بھی تو کتنے وہ اب کم ہو گئے تھے ۔

اسے ہنستا دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے چیوا بھی ہنسا کیونکہ ماسا ہمیشہ اس بات پر ناراض ہوتا تھا کہ اگر میں ہنستا ہوں تو تم نے بھی میرا ساتھ دینا ہے ہم رکھوں میں ایک جیسے ہوں گے تو چیوا بھی ہنسا اور پھر چپ ہو گیا ۔۔۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ماسا کی پسلیوں میں پھر ٹہنی چبھوئی اور وہ آنکھیں بند کر کے اونگھ میں تھا ۔۔۔ تو وہ آنکھیں کھول کر حیرت سے ادھر ادھر تکنے لگا جیسے اسے پتہ نہ ہو کہ وہ کہاں ہے اور پھر یکدم اس نے چیوا کا منہ ہاتھ میں بھینچ کر اس کے گال پر چوما اور کہنے لگا ۔۔ "میں اب بات کرتے کرتے سو جاتا ہوں ۔ میں کیا کہہ رہا تھا" ۔

"جہاں وہ گھڑے سے پانی ڈالتے تو واپسی پر سوکھ جاتا تھا" ۔

"ہاں ۔۔۔ تو پھر انہوں نے یہ کیا کہ صرف ایک کھیت کو چنا کہ اسے پانی دے لیں گے تو پھر دوسرے کو دے لیں گے ۔ تو وہ جھجھریاں اور گھڑے اور مٹ اٹھائے جنوروں کی طرح دریا اور کھیتوں کے بیچ مشقت کرتے رہے اور ان کا پسینہ زیادہ بہا اور کھیت کو پانی کم ملا ۔۔۔ فاصلہ

زیادہ تھا اور کھیت کب سے سوکھا تھا اس پر مینہ بھی نہیں برساتھا تو سارے دن میں ساری بستی نے مل کر کھیت کے اتنے حصے کو گیلا کیا جتنے حصے پر ہم دونوں جو بیٹھ جائیں تو وہ نظر نہ آئے ۔۔۔ ہاہا ۔۔۔" ماسا پھر سے ہنسنے لگا ۔

"نہیں ماسا" چیوا نے فوراً اس کے کھلے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔ "پہلے بات پوری کر پھر ہنس" ۔۔۔

"تم کیوں نہیں دیکھ رہے تھے ؟ تم دیکھ لیتے خود ۔۔۔ تم اصل میں ابھی تک وہیں ہو ۔۔ وہاں سے آئے نہیں اور اسی لئے ان کے لئے دکھی ہوتے ہو ۔۔۔ پر تم تو میرے لئے بیر لینے گئے تھے ہاں مجھے یاد آیا میرے بیر کہاں ہیں ؟

"وہ پیلو" ؟

"ہاں وہی ۔۔۔"

"پہلے بات پوری کرو پھر دوں گا ۔۔۔"

ماسا کی مہین آنکھیں سرخ ہو کر ابلنے لگیں اور وہ ٹہنی پر بیٹھا اچھلنے لگا ۔ "کیا کرنے آئے تھے میرے رکھوں میں ۔ جانتے نہیں یہ میرے ہیں ۔۔۔ بودن اور چھوٹے سر والے میں تمہاری گردن دبا دوں گا ۔۔۔ دبا دوں؟" اس نے چیوا کی گردن پر بنا بوجھ ڈالے ہاتھ رکھا اور جب وہ کچھ نہ بولا تو ماسا فوراً نرم پڑ گیا اور اچھلنا بند کر کے آرام سے کہنے لگا "ہاں تو میں کیا بتا رہا تھا"

"سارے دن میں ساری بستی نے ذرا سا کھیت گیلا کیا ۔"

"ہاں ۔۔ ایسا ہی ہوا ۔۔ اور پھر دوسرے روز بھی وہ اسی کام میں جت گئے ۔۔۔ ان کے پاؤں سوج گئے اور سانس چڑھ گئے اور وہ چلتے ہوئے گر جاتے اور ان کے کھلے منہ سے ہونکنے کی آوازیں مجھے یہاں تک سنائی دیتیں ۔۔۔ اور پھر پاروشنی اپنے چھپر میں سے آئی اور کہنے لگی ۔۔۔"

"می آؤں ۔ می آؤں" مور کہیں دور بولا

"۔۔۔۔ پاروشنی ان میں نہیں تھی جو دریا کا پانی بھرتے تھے اور کھیتوں میں انڈیلتے تھے ۔ وہ ان سب سے الگ رہی جیسے جانتی ہو کہ یہ ہوتا نہیں جو یہ کر رہے ہیں تو وہ اپنے چھپر سے آئی اور کہنے لگی ۔ "وہ بستیاں اور ہوتی ہیں جن کے دریا کا پانی بھر کر کھیتوں میں لے جایا جاسکتا ہے ۔ ان کے کھیت اور فصلیں اور ہوتی ہیں اور ہم وہ نہیں ۔۔۔ گھاگھرا خود اپنے آپ میں سے باہر آ کر کھیتوں کو جاتا ہے اور انہیں سینچتا ہے ۔۔۔ اسے کوئی اور نہیں لے جاسکتا ۔۔۔ تم

اپنے کو ہلکان نہ کرو ۔۔ ہو سکے تو کنک تلوں اور سالو کا بیج کھیتوں میں سے کھود نکالو شائد اگلے برس کام آسکے ۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ باجرے کی طرح ان کا بیج بھی جل کر خاک ہو جائے ۔۔۔"

"ماسا اگر کنک کا بیج بھی ختم ہو جائے اس بستی میں سے تو پھر یہ کھائیں گے کیا ۔"؟

"تمہیں اس سے کیا ؟ تم تو کنک نہیں کھاتے ۔ تم تو وہی کھاتے ہو جو تمہیں ان رکھوں میں مل جاتا ہے ۔ تم ان کے لئے کیوں دکھی ہوتے ہو جو تمہارے لئے دکھی نہیں ہوتے ۔۔۔ تم ابھی تک وہاں ہو ۔۔ ادھر نہیں آئے" ۔۔۔

پاروشنی نے یہ کہا کہ یہ وہ پانی نہیں"۔۔

"ہاں ۔۔۔ ہاں تو وہ جان گئے کہ وہ ٹھیک کہتی ہے ۔ اصل میں وہ پہلے سے جانتے تھے کہ اس بار کھیت سوکھے رہیں گے ۔ پر ان کا جی نہیں مانتا تھا ۔ وہ سب کچھ دیکھتے تھے پر ان کا جی نہیں مانتا تھا اس لئے وہ یوں اپنے آپ کو ہلکان کرتے رہے اور اب وہ سارے چپ ہیں ۔ ایک آلکس ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں ۔ کچھ تو کھیتوں میں سے بیج ڈھونڈتے ہیں اور تم جانو مٹی میں ملے ایک بیج کو ڈھونڈنا کتنا مشکل ہے اور وہ اگلے برس کے لئے اسے سنبھالتے ہیں پر کچھ تو بس آلکس میں سانس لیتے ہیں اور اپنے چھپروں تلے پڑے رہتے ہیں اور ان بڑے بڑے مٹوں میں ہاتھ لٹکا کر ٹٹولتے ہیں کہ کنک کتنی باقی رہ گئی ہے کھانے کو ۔۔۔۔"

"کنک تو اتنی ہوتی ہے جتنی کہ اگلی فصل تک کام دے جائے تو کنک کتنی رہ گئی ہوگی ۔۔۔ یہ کھائیں گے کیا ۔؟"

"تم ابھی تک وہیں ہو" ۔۔۔ ماسا بولا پر غصّے سے نہ بولا ۔۔ "پر میں یہاں کی سوچتا ہوں ، یہ ہماری بستی ہے"

تب اسے بھوں بھوں کر کے رونے کی آواز آئی جو چیوا کی تھی جو رکھوں میں آنے کے بعد اپنی حیاتی میں پہلی بار رو رہا تھا اور وہ روتے ہوئے اتنا بودن لگ رہا تھا کہ ماسا پھر سے ہنسنے لگا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہنے لگا ۔۔ "روتا ہے یہ ابھی تک وُہیں ہے ۔ اُن کے لئے دکھی ہے ۔۔ روتا ہے ۔۔" یہ کہہ کر ماسا دُوسرے رکھ پر جا بیٹھا تاکہ وہ آرام سے رو لے ۔

اور دوسرے رکھ پر بیٹھنے کے بعد اس کے اندر بھی گھبراہٹ پھیلی کہ رکھوں میں جو ایک دو جوہڑ تھے جو مینہ سے بھرتے تھے اب سوکھنے کو تھے اور رکھ بھی سوکھتے تھے ۔ اس کے اندر بھی گھبراہٹ پھیلی ۔

تیز ہوا کانوں اور ناکوں کو سُن کرتی تھی پر گلیوں ، ویہڑوں اور کھیتوں میں باریک دھول تپتی تھی اور فضا میں گھلتی تھی اور پھر وہیں ٹھہر جاتی تھی ۔۔۔ اسی بار پوہ ماگھ کی دھوپ میں بھی ایک گرم چبھن تھی جو بدن کو خشک کرتی تھی ۔

ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں اور اپنی سویر دوپہر اور شام کو کیا کریں ۔۔۔ کھیت اب کھیت نہ تھے دُھول کے میدان تھے ۔۔۔ وہاں کرنے کو کچھ نہ تھا ۔ انہوں نے پہلی بار جانا اور اس جانتے پر انہیں اچنبھا بھی ہوا کہ ان کی پوری حیاتی ایک بیج کے چار چفیرے بسر ہوتی ہے ۔ بیج کے لئے کھیت کھودنا، اسے مٹی میں دبانا ، پھر پانی کا انتظار اور جب وہ آجائیں تو انہیں چاردیواری میں گھیر کر ٹھہرائے رکھنا تاکہ وہ دیر تک کھڑے رہیں اور مٹی کو سینچیں اور بیج تک پہنچیں اور پھر پھوٹ کی رُت شروع ہونا اور کھیت سے گھاس پھونس کا اگاؤ اور اکھاڑنا ۔۔۔ ڈنگروں کے لئے چارہ اور ان کا گوبر کھیت میں ۔۔۔ اور ہانڈی میں وہ سبزیاں جو کھیت کی منڈیروں پر پھیلتی ہیں ۔۔۔ ان کے پاس سوائے کھیت کی بات کے اور کچھ نہ تھا اور اُس بات کے نہ ہونے سے وہ گونگے ہو گئے تھے ۔ ایک وا ایک چاند اور تاروں کی بات نہیں کرتا اسے تو اپنے ڈھور ڈنگر کے اچھے برے ہونے کا فکر ہوتا ہے دودھ کی کمی پر اس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑتی ہیں ۔ دودھ میں چیتر کے سبزے کی بُو پڑ جانے پر سوچتا ہے ۔۔۔ تو اب ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا ۔ وہ اِدھر اُدھر پڑے رہتے جیسے وہ آلکس کے مارے ہوں پر وہ ڈھے گئے تھے ۔ وہ گھاگھرا سے روٹھے پھرتے تھے اس طرف دیکھتے نہ تھے ۔ انہیں بڑا دکھ تھا کہ ان کے ساتھ اس نے ایسا کیا اور وہ ادھر بہت کم جاتے تھے ۔ پینے کے پانی کے لئے کنوئیں بہت تھے اور ان کا پانی بہت ٹھنڈا تھا ۔ کنک اور دال جو بھڑولوں اور مٹوں میں تھی بس اتنی تھی کہ ایک دو ماہ اور چل جائے اور وہ بھی سب کے پاس نہ تھی ۔ پکلی کے علاوہ اور لوگ بھی اپنے بچوں کو رکھوں میں بھیج دیتے اور وہ وہاں سے پیلو اکٹھے کر لاتے یا نیچے جھاڑیوں میں چھپا کوئی خربوزہ

ڈھونڈ لاتے ۔۔۔ ہاں مچھلی بہت تھی اور جنہوں نے کبھی مچھلی کا ماس نہیں کھایا تھا وہ بھی دریا کے پانی میں کھڑے دکھائی دیتے ۔۔۔ مچھلی یوں بھی بہت تھی ، پہلے اتنی نہ تھی ۔ پر اس کے ماس کی گرمی ان کو راتوں کو بہت تنگ کرتی ۔۔۔ اگر وہ سکھی نہ تھے تو دکھی بھی نہ تھے ۔ وہ کھانے پینے کے بارے میں زیادہ فکر نہیں کرتے تھے صرف یہ کہ ان سے ان کے سویر شام الگ ہو گئے تھے اور ایسے سویر شام آگئے تھے جو ان کے لئے اوپرے سے تھے ۔ وہ جانتے نہیں تھے کہ ان کا کیا کریں ۔۔۔ پہلے تو ایسا ہوتا کہ وہ گھروں سے نکل جاتے اور جب کھیتوں میں پہنچتے تو وہاں خشکی ہوتی اور دور سے وہ سبزہ دکھائی نہ دیتا جو پانی کے آنے کے چند دنوں بعد پھوٹتا ہے تو وہ دل بہت چھوٹا کرتے اور وہیں پڑے رہتے ۔۔۔ پھر وہ ایک دوسرے کے پاس آنے جانے لگے ۔۔۔ چند روز بعد وہ اس میل سے بھی اکتا گئے اور پھر اپنے چھپروں میں رہنے لگے ۔ کنک کا کچھ بیج تو انہوں نے نکال کر سنبھال لیا تھا اور انہیں اگلے برس کے پانیوں کی اڈیک تھی ۔۔۔ اور تب تک ان کے سویر شام اسی ڈھنگ میں گزرنے تھے ۔

پکلی نے آوا چڑھانا چھوڑ دیا تھا ۔۔۔

ان کے پاس کچھ رکھنے کو نہ تھا اور وہ بھانڈے ٹھنڈر کا کیا کرتے ۔۔۔ ڈورگا اپنے موہنجو میں تھا ۔ اس نے اس پر چھپر ڈال لیا تھا اور بہت کم باہر نکلتا تھا ۔ اسے کھانے پینے کی کچھ پرواہ نہ تھی ۔ پکلی اس سے پوچھتی تو وہ کہتا ، بھلی لوک بس اپنے گھر میں ہوں اور میں نے اور مجھ سے پیچھے بہت سارے لوگوں نے کھانے پینے کے بغیر ہی زندگی گزاری ہے ۔ ہمیں اس کی عادت ہے ۔۔۔ میں اپنے گھر میں ہوں ۔

شام ہوتی تو سب لوگ چولہوں میں اپلے رکھ کر سلگاتے تا کہ ان کا دھواں اٹھے اور ناک میں جائے اور بتائے کہ کچھ پک رہا ہے ۔ چاہے ایسا ہو یا نہ ہو ۔۔۔ وہ ایسا ضرور کرتے ۔۔۔ سمرو ان میں سے یوں الگ تھا کہ وہ دریا سے نہیں روٹھا تھا وہ شام ڈھلے ضرور ادھر جاتا اور کنارے پر بیٹھ کر اسے ایسے دیکھتا جیسے اسے اب بھی امید ہو کہ یہ دھیرے سے بہتا پانی اونچا ہونے لگے گا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے کنارے پار کر کے کھیتوں میں پھیلے گا ۔

ورچن نے ایک بار سوچا کہ اگلے پانی تک وہ کسی اور بستی میں چلا جائے ۔۔۔ اور ایک روز پاروشنی کے چولہے کے پاس بیٹھے چنگیر میں رکھی دو تین روٹیوں کو تکتے اور اپلوں کا دھواں ناک میں محسوس کرتے وہ خاموشی سے اٹھا اور باہر چلا گیا ۔۔۔ پاروشنی نے اسے اٹھتے دیکھا مگر چپ رہی ، اسے شک تھا کہ وہ وہیں جائے گا جہاں سے آیا تھا اور جب وہ گلی میں آیا تو اس نے کالی

بنگن کے کسی گھر میں اس سے اکیلی بیٹھی عورت کو لوٹنے کا سوچا صرف اگلے پانی تک اور پھر اس کا منہ کھلا اور وہ یکدم خوفزدہ ہوا کہ کالی بنگن بھی تو گھاگھرا کے کنارے ہے اور وہاں بھی بڑے پانی نہیں آئے ہوں گے اور وہاں کے لوگ بھی کہیں اور جانے کا سوچتے ہوں گے تو اس نے جانا کہ کوئی کہیں نہیں جاسکتا ۔ اسے وہیں چھپر چھاؤں ملتی ہے جہاں کا وہ ہو ۔۔۔ اور وہ واپس پاروشنی کی چنگیر پر آ بیٹھا اور روٹی کھانے لگا ۔

پاروشنی بولی ۔ "میں جانتی ہوں تمہارے دل میں کیا تھا جب گئے ہو اور اب کیا ہے جو آئے ہو" ۔

ورچن نے جواب نہ دیا ۔

منہ اندھیرے پاروشنی بستی کی گلی میں سے نکلتی تھی اور اس کے چلنے سے دھول اٹھتی تھی اور وہیں ٹھہرتی تھی ۔ اس نے گلی کے آخر میں پہنچ کر اپنے سینے کا لیڑا ڈھیلا کر کے دوبارہ باندھا اور پھر چلنے لگی ۔۔۔ اسے کہیں جانا نہیں تھا پر وہ اپنے چھپر تلے اتنی دیر لیٹی رہی تھی کہ اس کی کنڈ دکھنے لگی تھی اور وہ نکلنا چاہتی تھی ، کہیں جانا چاہتی تھی ۔۔۔ اور وہ جا رہی تھی ۔۔۔ اور اسے کہیں جانا نہیں تھا ۔۔۔ چیوا کا چھپرا بھی وہیں تھا جہاں گاگری کے پاؤں ہمیشہ رکتے تھے اور اس کا مال ڈنگر ادھر ادھر چرتا پھرتا تھا پر اب اس چھپر والا رکھوں میں تھا اور گاگری کو مکوڑے کاٹ کاٹ کر لے جا چکے تھے ۔ چھپر سے گزر کر کھیپ اور چھپری کی جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے کترن کے جھنڈ کے قریب سے ڈوبو مٹی کا علاقہ شروع ہو رہا تھا ۔۔۔ پر اب وہ ڈوبو مٹی نہیں پیڈی مٹی تھی ۔ پاروشنی اس راستے کو جانتی تھی جس پر سے وہ گزر کر رکھوں میں جاتی تھی پر اب اس کی کیا ضرورت تھی ۔ وہ ڈوبو مٹی پر چلنے لگی جو اب ڈوبو نہیں تھی اور اسے عجیب سا لگا ۔ پہلے تو یہ لگا کے یکدم اس کے پاؤں ڈوبیں گے اور وہ نیچے ہونے لگے گی پر یہ مٹی اب اتنی پیڈی ہو چکی تھی جتنی کہ بستی کی گلی کی تھی یا دریا کنارے کی تھی ۔۔۔ اس مٹی میں کون کون گیا اور اس کا اتہ پتہ نہ رہا ۔۔۔ یہ اوپر سے ایسے لگا کرتی تھی جیسے کسی کھیت میں سبزہ لگ رہا ہو اور اس پر مچھر اور مکھیاں اڑتے ہوں اور اس سبزے پر پاؤں دھرو تو ۔۔۔ نیچے ۔۔۔ اس کے سامنے کئی بار ایسا ہوا ۔ بستی کے کئی لوگ نیچے گئے ۔۔۔ بچے بھی ۔۔۔ جنور بھی ۔۔۔ اور اب وہ ان سب پر ، لوگوں بچوں اور جنوروں کے اوپر چل رہی تھی اور وہ کہیں نیچے تھے مٹی میں مٹی ۔

اور اس نے ایک مرتبہ پھر کترن کے ایک جھنڈ میں پندرو کو دیکھا ۔ وہ گردن اٹھائے ادھر

ادھر دیکھتا تھا اور اس کا باقی جسم بالکل ساکت تھا۔ تب پاروشنی کے پاؤں تلے ایک سوکھا پتہ چرمرایا اور پندرو کے کان تھرتھرائے اور وہ چھلانگ لگا کر رکھوں کے قریب چلا گیا۔ اس کی بھاگ بھی پہلے سے کم تھی۔ وہ بھی تو برسوں کے بھار تلے آیا ہوا تھا۔۔۔ وہ گردن موڑ کر اسے خاصی دیر تکتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش میں ہو اور جونہی وہ قریب ہوئی وہ اطمینان سے چلتا ہوا رکھوں کے اندر چلا گیا۔۔۔ پاروشنی بھی اسی راستے سے ان کے اندر داخل ہوئی۔۔۔ اسے کہیں نہیں جانا تھا پر وہ رکھوں کے اندر داخل ہوئی اور یہاں اسے چلنے میں دشواری پیش آئی۔۔۔ بہت سارے تنے راستہ روکتے تھے اور ٹوٹی ہوئی اور سوکھی ہوئی ٹہنیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔۔۔ اور جہاں مٹی تھی وہ بھی دھول تھی ایسے جیسے بستی کی گلی میں ہو باریک اور دھوپ سے تپتی ہوئی۔۔۔ پوہ کے مہینے میں بھی ایسا ہی تھا۔ یہیں پر بانجھ عورتوں کا پیپل تھا جو ابھی گرا تو نہیں تھا پر اندر سے بالکل خالی ہو چکا تھا اور اس کی سوکھی ٹہنیوں سے بندھی لیریں اپنے رنگوں کو کھو کر بدرنگ ہو چکی تھیں اور ان کے دھاگے بے بسی سے لٹکتے تھے۔ تنے پر موٹے موٹے سیاہ دھک مکوڑے قطار بنائے اوپر کہیں جا رہے تھے۔ پاروشنی جانتی تھی کہ ماسا یہیں کہیں ہے اور وہ سارا وقت کان لگائے ذرا سی آہٹ پر اوپر دیکھنے لگتی کہ شائد وہ ہو پر وہ نہ ہوتا کوئی پکھیرو ہوتا، گلہری ہوتی، وہ نہ ہوتا۔۔۔ پر وہ وہاں تھا۔۔۔ چیوا اسی کے پیچھے پیچھے کودتا آتا تھا اور وہ چپ چاپ پاروشنی کے اوپر دائیں بائیں آ کر چھپتے چلے آ رہے تھے۔۔۔ دھوپ رکھوں کے اندر تک آتی تھی اور کئی جگہوں پر تو اتنی تیز تھی کہ یوں لگتا جیسے کوئی سوکھا کھیت ہو رکھوں کے اندر کی زمین نہ ہو۔۔۔

"یہ کہاں جاتی ہے؟" چیوا ماسا کے کان پر ہونٹ لگا کر بولا۔

ماسا نے دانت نکال دئے اور وہ نیچے پتوں پر آہستہ آہستہ پاؤں دھرتی پاروشنی کو دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا "اس نے کہاں جانا ہے۔ یہ کہیں نہیں جا سکتی"

پاروشنی نے چونک کر اوپر دیکھا۔۔۔ اوپر ایک سوکھی بیری کے پتے تھے اور کچھ نہ تھا۔۔۔ وہ ستانے کو بیٹھ گئی۔

ان راتوں میں جب بڑے پانی آنے کو ہوتے تب ادھر ایک گیلی اور ہانپنے والی گرمی ہوا کرتی تھی۔ اس کے جثے سے پسینہ پھوٹتا تھا اور تب روز ہی مینہ برستا تو ادھر رکھوں کے اندر ایک نمی سے بوجھل ہوا سارا دن دم سادھے موجود رہتی۔ اب پچھلے چھ سات برس سے پتوں ٹہنیوں اور جھاڑیوں پر جمی دھول جوں کی توں تھی۔ مینہ برستا تو دھلتی۔۔۔ اور پانی کی کمتی ہوئی تو نیچے کا گھاس پھونس بھی سوکھ گیا اور اس کی جگہ کانٹے دار جھاڑیاں جنہیں پانی کی ضرورت نہ تھی پھیل رہی تھیں اور ان میں سے ایک کے ساتھ پیلو لگتے تھے جو ماسا شوق سے کھاتا تھا۔ وہ ستانے کے لئے بیٹھی تھی پر اس پر آلکس اثر کرتی تھی اور وہ سست ہو کر سوکھے پتوں پر لیٹ گئی اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگی۔۔۔ اُس نے اپنے دونوں لیڑے ڈھیلے کئے اور بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ پتوں میں طرح طرح کے مکوڑے اور مچھروں ایسے رانگلے کیڑے تھے جو ان کے نیچے اوپر چلتے تھے اور پتے جیسے سانس لیتے ہلتے تھے۔

۔۔۔ پاروشنی کے اندر ایک ڈر تھا جسے نکالنے کو شائد وہ ادھر آتی تھی پر وہ نکلتا نہ تھا۔ وہ وہیں تھا اور دھیرے دھیرے جڑ بس پکڑ رہا تھا۔۔۔ جیسے وہ جان گئی تھی کہ بڑے پانی اس بار نہیں آئیں گے ایسے ہی وہ کچھ اور جان گئی تھی اور اس کچھ اور کا ڈر اس کے اندر سے نکلتا نہ تھا۔۔۔ اس نے بانجھ عورتوں کے پیپل کا سوچا جو اب بیکار ہو گیا تھا۔ اور ادھر کوئی نہ آتا تھا۔ اس کا ہاتھ نیچے ہوا اور اپنے بیچ پر جا ٹھہرا۔۔۔ کیا یہاں اب بھی اتنی گرمی اور نمی ہے کہ بیج پھوٹ سکے یا مجھے بھی پیپل کے ڈال کے ساتھ ایک ٹاکی باندھنی ہو گی، ایک ایسے کے لئے جو چپ نہ چلا جائے بلکہ روئے اور ایسا روئے کہ مجھے ہلا دے تب میں ہوں گی ورنہ میں تو نہیں۔۔۔ پر اس نے تو تب سے ورچن کو یا سمرو کو پاس نہ آنے دیا تھا، اس کے اندر مرد کا میل گم ہو چکا تھا۔۔۔ پر وہ ان دونوں کے لئے یوں کڑھتی اور یوں سکھی ہوتی جیسے ان کی میّا ہو۔۔۔

اس کی کنڈ پر ایک ایسی گرم اور بھیگی ہواڑ پھیلی جو اس کے جثے کو جانتی تھی اور جسے وہ جانتی تھی۔ اس نے فوراً پاسا نہیں پلٹا کہ کون ہے بلکہ وہ سانس روکے کان لگائے لیٹی رہی۔۔۔ پتوں پر اس کے پاؤں تھے، جھکی ہواڑ تھی اور وہ چرمراتے تھے کیونکہ وہ ایک بھاری وجود کے نیچے تھے۔ اس کا وہ ہاتھ جو اس کے بیچ پر رکھا گیلا ہوتا تھا وہیں رہا کیونکہ اس نے بتانا تھا کہ اس ہواڑ کو کنڈ پر پھیلنا ہے یا اس کے اندر تک جا کے اس کے بیچ جثے میں پھیلنا ہے۔ وہ اسے اپنے سُموں تلے پیس سکتا تھا۔ اس کا سرمہ بنا سکتا تھا۔ ڈور گا کو اس نے ادھیڑا تھا اور یہ یہیں پر سے ان رکھوں میں، ان چھدرے ہوتے رکھوں کے اندر اور اب اس کی تھوتھنی اس کی کنڈ کو ایسے سونگھتی تھی جیسے وہ ہلکائی ہوئی ہو اور پھر اس نے اس کی زبان کھردری اور گیلی زبان اپنی کنڈ پر محسوس کی اور اس کے پنڈے پر جب وہ ہولے سے چلی تو اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور بدن تھرتھرانے لگا اور وہ دم روکے پڑی رہی کہ یہ زبان اور چلے اور وہاں پہنچے جہاں اس کا ہاتھ دھرا تھا اور

گیلا ہوتا تھا اور یہ اس کے اندر پھیل جائے اور وہ سیدھی ہوتی گئی۔

ماسا نے اوپر ٹہنیوں میں سے اپنا جبڑا آگے کر کے دیکھا تو نیچے صرف بھینسا نظر آیا۔ وہ ایسے لرز رہی تھی جیسے پانی میں اُگے سروٹ بہاؤ کے زور سے لرزتے ہیں ۔۔۔ اس کا جی چاہا کہ وہ سیدھی ہو جائے اور اپنے آپ کو پھیلا دے ۔۔۔ اور وہ سیدھی ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو پھیلا دیا اور سیاہ لشکتی جلد والا اس کے اوپر تنا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئیں کہ اب وہ آئے گا اور اس کا جسہ کانپنے لگا اس سواد کے لئے جو پھوٹنے کو تھا اور دم روکے ہوئے تھی ۔۔۔ اور پھر اس پل اسے یوں لگا جیسے وہ گھاگھرا کے دوسرے کنارے پر ریت میں گیلی اور بے سدھ ہے اور وہ آچکا ہے اور اس کے کان اس کے رونے کی آواز پر لگے ہیں کہ یہ روئے تو میں جانوں کہ یہ آگیا ہے اور وہاں چپ ہے اور وہاں خاموشی ہے اور وہ ہے تو سہی پر وہ روتا نہیں ۔۔۔ اور تب وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اٹھی اور اس کی طرف نگاہ کئے بغیر اندھا دھند بھاگنے لگی ۔۔۔ اس سے پرے ہونے کے لئے اس سے دور ہونے کے لئے ۔۔۔ پہلے تو وہ خود تھی جو ہانپتی جاتی تھی اور پھر اس کے سموں کی دھمک سنائی دینے لگی، وہ اس کے پیچھے آتا تھا۔ اب میں تمہارے بس میں آنے والی نہیں ۔۔۔ وہ سوکھے پتوں اور ٹہنیوں مرے ہوئے جنوروں کی ہڈیوں اور گرے ہوئے رکھوں کو پھلانگتی بھاگتی تھی اور آخر کو رکھ بہت پیچھے رہ گئے اور وہ لمبے سینگوں اور کوہان کے بغیر نربو بیلوں کے باڑے کے قریب آگئی ۔۔۔ دیوار کے ساتھ چارے کے گٹھے ہوا کرتے تھے پر اب وہاں تھوڑی سی پرالی پڑی ہوئی تھی ۔۔۔ چارہ، مینہ اور پانی کے نہ ہونے سے کیسے ہوتا ۔۔۔ بستی والے مشکل سے اپنے ڈھور ڈنگر کے لئے بندوبست کرتے تھے۔ تو وہ اِن بے کار اور نسل بڑھانے والے بیلوں کے لئے چارے کے گٹھے کہاں سے لاتے ۔۔۔ وہ باڑے کہ قریب ہوئی تو اس نے پہلے کی طرح دھردا کو دیکھا جو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

مامن ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ میں یم کتوں کو رات سوتے میں دیکھتا ہوں اور میں آج گیا کہ کل گیا اور یہ ابھی تک یہیں ہے اتنے برسوں سے اور یہی کہہ رہا ہے کہ میں دریا کے پار گیا کہ گیا ۔۔۔ پر اب یہ نرا ڈھانچہ ہے پنجر ہے، پتہ نہیں اس میں بولنے کی سکت ہے یا نہیں۔

"پاروشنی ۔۔۔" اس لمحے دھروا کی تیز آواز آئی "تیرے پیچھے کیا آتا ہے جو یوں ہانپتی ایک سودائن کی طرح آتی ہے ۔۔۔ ہوش سنبھال سانس لے ۔۔۔"

پاروشنی رکی تو اس نے دیکھا کہ دُھروا کے سیاہ چہرے پر لکیریں تھیں جیسے وہ روتا رہا ہو ۔۔۔ اور اس کی مہین آنکھوں میں ابھی تک لالی تیرتی تھی۔

"تجھے پتہ ہے کیا ہوا؟" وہ خود ہی بولا "آج ان میں سے ایک مر گیا اس لئے کہ بستی والے پورا چارہ نہیں دیتے ان کے لئے ۔۔۔ اور یہ مانا کے بیل ہیں۔ وہ بے جان پڑا ہے آنکھیں کھولے تو میں اب اُس کا کیا کروں۔ میں اسے دوسرے مردہ جنوروں کی طرح چیلوں اور کوؤں کے آگے تو نہیں ڈال سکتا ۔۔۔"

"کیوں؟"

دُھروا کو ایک جھٹکا لگا اس "کیوں"؟ سے کہ پاروشنی نے یہ کیا کہا "کیوں؟ یہ نربو بیل ہیں۔

"کیا چیلیں ان کا ماس نہیں کھاتیں؟" پاروشنی دھیرے سے بات کرتی تھی۔

"تیرے بھیجے میں بھی کچھ ہو گیا ہے" ۔۔۔ دھروا نے مایوسی سے سر ہلایا۔ تو بس ان کو بول دے کہ آپ بے شک بھوکے رہیں پر مانا کے بیلوں کے لئے چارہ ضرور لائیں ۔۔۔"

پاروشنی سانس ٹھیک کرنے کو بیٹھ گئی ۔۔۔ پسینے سے نچڑتی لنگی کو اس نے کھول کر پھر سے کس لیا"۔ ان کو چارہ نہ ملا تو یہ سارے مر جائیں گے دھروا مامن؟"

"تو اور کیا ۔۔۔" دھروا نے منہ پرے کیا چارے بنا تو ہم نہیں رہ سکتے یہ کہاں رہیں گے ۔۔۔"

توانہیں مر جانے دے مامن ۔۔۔ یہ تو گھاس پھونس سے بھی بڑھ کر بیکار ہیں۔"

دُھروا کی مہین ٹھوڑی کے ساتھ چپکا گھنگھریالے بالوں کا گچھا ہوا میں سرسرایا اور سرسراتا رہا۔ دھروا نے پہلے کی طرح اسے اپنی ٹھوڑی سے چپکانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے سر کی ہڈی بہت دکھنے لگی "یہ نربو بیل ہیں پوتر ہیں" اس کی آواز گلے میں اٹکتی آئی۔

"جنور نہیں بندے پوتر ہوتے ہیں جو انہیں چارہ دیتے ہیں ۔۔۔ انہیں مر جانے دے"

وہ اٹھی اور دھروا کے اچنبھے سے کھلے منہ پر ایک نظر ڈال کر چلنے لگی، وہ بڑبڑایا پر وہ اس سے دور ہو چکی تھی اس کی ٹانگیں آپس میں بھڑتی تھیں اور گھٹنوں میں تھکاوٹ بیٹھی ہوئی تھی۔ پکلی کے آوے کے اوپر آسمان خالی تھا۔ بھکشو ٹیلے کے پاس ہو کر وہ رکی کہ اب کدھر جائے، بستی کو لوٹے یا آگے ہو کر دریا کو دیکھ آئے ۔۔۔ اور تب اس نے سمرو کو دیکھا جو ادھر تھا اور وہ ادھر چلنے لگی۔ سمرو نے بھی پیچھے نہیں دیکھا تھا پر وہ جان گیا تھا کہ وہ آتی ہے۔ سروٹوں میں سے نکل کر وہ ریت اور کنکریوں پر چلتی ہوئی پانی کے قریب آئی جہاں سمرو بیٹھا تھا۔

---"ہماری ساری حیاتی ایک بیج تو نہیں ---" اس نے کہا" ---کہ وہ پھوٹے اور پھر اس کے گرداگرد ہم حیاتی کرتے رہیں --- پانی کٹائی ۔ کھیت ۔ بھڑولے ۔ چولہے ۔ اپلے ۔ موتی منکے اور برتن --- یہ سب ایک بیج کے آس پاس ہی تو ہوتے ہیں ۔ اب وہ نہیں تو ہم کیسے خالی ہو گئے ہیں ۔ ہم ایسے پڑے ہوئے ہیں کہ اگر کیڑے مکوڑے چاہیں تو ہمیں اٹھا کر لے جائیں اور ہم ان کو لے جانے دیں گے ۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہئے ۔"

"نہیں ---" پاروشنی نے گھٹنوں پر سر رکھا اور دریا کی طرف دیکھا جدھر سمرو دیکھتا جاتا تھا ۔ "پر ایسا ہوتا ہے ۔ ہم خود حیاتی کا ایک ڈھنگ بناتے ہیں جیسے پکلی ایک جھجھر بناتی ہے تو خود بناتی ہے اور جب اس ڈھنگ میں اکا پیچھا ہو جاتا ہے تو ہم خالی ہو جاتے ہیں ۔"

"پر مٹی سے جھجھر نہ بنے تو پکلی اس کا کوئی اور برتن بھانڈا بنا لیتی ہے ۔ کیا یہ ضروری ہے کہ جھجھر ہی بنے ---"

"ہاں --- ہم نے وہ ڈھنگ خود جو بنایا ہوتا ہے اس لئے اسے توڑ نہیں سکتے --- اور اس کے ٹوٹنے سے ہم خود ٹوٹ جاتے ہیں --- ذرا اُدھر دیکھو ، اس رُت میں دریا اپنے کناروں کے اندر آرام سے بہاؤ کرتا کیسا اوپرا لگتا ہے جیسے کوئی اور دریا ہو ہمارا نہ ہو۔ اس رت میں تو یہ --- کیسا عجیب لگتا ہے ---"

"پر ایسا کیوں ہوا پاروشنی --- یہ سوال میرے سر میں گھومتا ہے اور مجھے پتہ نہیں چلتا کہ ایسا کیوں ہوا ہے ۔ ہم آرام سے بیٹھے تھے اور اپنے ڈھنگ سے زندگی کرتے تھے اور ہر شے اپنی اپنی جگہ تھی تو اب مینہ کیوں نہیں برسا ۔ بڑے پانی کیوں گم ہو گئے ---"

"کوئی بھی ڈھنگ --- جینے کا کوئی بھی ڈھنگ جب ٹوٹے تو کہیں نہ کہیں کچھ ہوتا ہے تو وہ ٹوٹتا ہے --- ڈورگا کہتا ہے کہ جب لوگوں کو جنور بنا کے جھکا دیا جائے اور ہزاروں برسوں سے کڑھتے رہیں اور بے بس رہیں اور مرنے اور جینے کے درمیان رہیں تو ان کے کڑھنے سے بہت کچھ ٹوٹتا ہے ۔"

"سمرو کے ہونٹ مسکرانے کو پھیلے اور وہ ریت پر پاؤں مارتا ہوا بولا "لوگوں کے کڑھنے سے بڑا پانی نہیں آتا ۔ یہ کیا بات کرتی ہو ؟

"اس نے ورچن کو بتایا تھا اور ورچن نے مجھے بتایا ہے"

"پر ہماری بستی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہاں کسی کو جھکایا گیا ہو --- یہاں ڈورگا پہلا بندہ تھا جو جھکا ہوا تھا اور وہ باہر سے آیا تھا ۔ اسے ہم نے تو نہیں جھکایا تو اس کے کڑھنے سے ہماری بستی

میں پانی کیوں نہ آئیں ۔؟"

"میری سمجھ میں بھی نہیں آتا ۔ اور تم مجھے کیوں نہیں بتاتے مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟ ۔

"تم ہم سے آگے ہو --- ہم سے زیادہ بوجھ رکھتی ہو اس لئے"

پوہ ماگھ کی ہوا میں ایسا کورپن اور ٹھنڈک ہوتی ہے کہ وہ جُثّے کو لگے تو بندے کے اندر خوشی کی پھوٹ شروع ہو جاتی ہے ۔ یہ ہوا انہیں لگتی تھی اور دریا پر کروٹیں بناتی پار اترتی جاتی تھی اور پاروشنی بھی اس کے ساتھ پار اترتی تھی اور کبھی بیچ دریا ڈوبتی تھی اور اس کے ناک منہ میں پانی جا کر اسے بے حال کرتا تھا۔

"تم کہاں تھیں"

"بس ادھر ہی"

ہوا کی کروٹیں پانی میں ابھرتے ٹاپوؤں پر چڑھتی لپٹتی جاتی تھیں ۔

"تم کیوں پوچھتے ہو ؟"

"تم میں سے ایک عجیب باس آتی ہے --- تمہارے جُثّے میں سے" سمرو نے کہا ۔

پاروشنی چونکی اور اس نے سونگھنے کو ناک سکیڑی "مجھے تو نہیں آتی"

"اپنی باس اپنے آپ کو تو نہیں آتی ---" سمرو ہنسا اور اسی کی لنگی پر اٹکے گھاس کے ایک تنکے کو اٹھا کر سونگھنے لگا ۔

"پھر یہ میری نہیں ہو گی" پاروشنی بولی ۔

"نہیں یہ تمہاری نہیں" سمرو نے اس کی چھاتیوں پر ہاتھ رکھا جیسے دیکھتا ہو کہ یہ زندہ ہیں" یہ باس کسی جنور کی لگتی ہے ۔"

"میں رکھوں میں گئی تھی --- شائد اُدھر سے --- پتہ نہیں ۔ نہیں سمرو" اس نے سمرو کا ہاتھ اپنے پرے سے پرے کیا" اِدھر ہاتھ مت رکھ --- ابھی نہیں --- ابھی میں ڈر میں ہوں"۔

"کیا ہے جس سے ڈرتی ہو"

پاروشنی نے جواب نہ دیا اور پھر چپ رہی اور پھر بولی "تم کبھی گم ہوا کرتے تھے اور پھر باتیں کیا کرتے تھے مجھے دیکھ کر --- میری باتیں ، میرے جُثّے کی اور اپنے آپ کے اندر کی --- اب کیوں نہیں کرتے ؟"

"تم اب میرے سامنے کم بیٹھتی ہو اس لئے" سمرو مسکرایا ۔ "میں تو کیا تمہارے چولہے

کے سامنے پیڑھی پر بیٹھا ورچن بھی ایسی باتیں نہیں کہتا ہو گا۔"

"تمہاری بات میں شک ہے" ۔۔۔ پاروشنی نے سر جھکایا "اس رات ، میرے بیاہ کی رات جب میرے جُتّے پر پکلی کے بیل بوٹے مجھے ایک رُکھ ایسا بناتے تھے میں جھیل سے اٹھ کر اسے چھوڑ کر آئی ادھر آئی تھی ۔۔۔ اور پھر بھی تم شک کرتے ہو ۔۔۔ تم دونوں برابر کے باٹ ہو نہ کم نہ زیادہ ۔۔۔ ہاں کبھی ہوا کے چلنے سے جھکاؤ ایک طرف ہو جاتا ہے پر پل دو پل کے لئے جیسے سروٹ تھوڑی دیر کے لئے جھکتا ہے ۔۔۔ اور پھر سیدھا ہو جاتا ہے ۔۔۔ پھر برابری آجاتی ہے ۔۔۔ پر اب یہ سب کچھ بھی گم ہوا اور میں تم دونوں سے پرے ہو گئی ہوں ۔ ابھی تم نے میرے سینے پر ہاتھ دھرا تھا تو میرا دم گھٹا ۔۔۔ اور آج میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم دونوں یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ جو رویا نہ تھا کس کا تھا تو مجھے خود نہیں پتہ کہ وہ تم دونوں میں سے کس کا تھا تم دونوں برابر کے باٹ ہو۔"

سمرو نے سر ہلایا۔ جیسے وہ سمجھتا ہو پر اسے یہ سب کچھ اچھا نہ لگتا ہو "تم نے ابھی کہا کہ تم ڈر میں ہو تو کیا ہے جس سے ڈرتی ہو ؟"

وہ جھجکی کہ کہے یا نہ کہے ۔۔۔ اور پھر دریا پر نظر ڈال کر اس نے سمرو کا ہاتھ پکڑا اور اسے وہیں اپنی چھاتیوں پر رکھا جہاں اس نے رکھا تھا جیسے ڈر اس کے اندر رہو اور کہنے لگی "مجھ میں کچھ اور کا ڈر ہے ۔۔۔ جیسے میں نے جانا کہ اس بار بڑے پانی نہیں آئیں گے ۔۔۔ اور ایسا پکا پیڈا جانا جیسے میں یہ جانتی ہوں کہ میرے سینے پر رکھا یہ ہاتھ تمہارا ہے اور اس ہاتھ میں تم اپنے ہونٹ رکھتے ہو ۔۔۔ تو اسی طرح میں نے یہ جان لیا ہے کہ بڑے پانی اب کبھی نہیں آئیں گے ۔ پچھلے برس نہیں آئے تو اب نہ اس برس آئیں گے اور نہ اگلے برس اور نہ ۔۔۔ اور بستی کے لوگ راہ تکتے ہیں"۔

سمرو نے اپنا ہاتھ ہٹایا اور اسے اپنے سینے پر رکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی لُنگی کے ساتھ ریت کے ذرّے چمٹے ہوئے تھے جنہیں اس نے جھاڑا اور پھر تھکے ہوئے پاؤں دھرتا وہ پانی کے ساتھ جا کھڑا ہوا ۔ پاروشنی اسے دیکھتی رہی ۔ سمرو نے جھک کر پانی کو ہاتھ لگایا اور پھر ہتھیلیوں کو بھر کر الٹے پاؤں آہستہ آہستہ واپس آیا اور پاروشنی کے منہ کے آگے کر کے کہنے لگا "اس پانی کو پی لو" پاروشنی کی پلکیں اوپر ہوئیں اور اس نے اُس کی ہتھیلی میں لرزتے ایک گھونٹ پانی پر ہونٹ رکھ کر اسے اپنے اندر اُتار لیا۔ سمرو پھر بیٹھ گیا پر اب وہ ایسے سانس لیتا تھا جیسے کسی لمبی مسافت سے آیا ہے اور اس کا گلا سوکھ رہا ہے ۔ "بڑے پانی اب کبھی نہیں آئیں گے ؟" اس کی آواز

جیسے ڈوبی ہوئی تھی ۔

"ہاں" ۔۔۔ پاروشنی نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھا" ۔۔ وہ کبھی نہیں آئیں گے ۔ یہ دریا اس طرح بہتا رہے گا لیکن اس کے پانی کبھی کناروں سے نکل کر ہمارے کھیتوں تک نہیں جائیں گے اور ہم نے جو بیج سنبھال کر رکھا ہے اس برس کے لئے وہ بھی باجرے کے بیج کی طرح سڑ کر سواہ ہو جائے گا ۔۔۔ تم کہتے تھے کہ ہماری ساری حیاتی صرف ایک بیج تو نہیں ۔۔۔ تو اب ایسا نہیں ہے ۔"

سمرو کی آواز نیچے تھی شائد تہہ میں کنکریوں اور ریت کے ساتھ اور وہ پانی سے باہر آتی تو گم لگتی اور وہ اسی گم آواز میں بولا ۔۔۔ "اور مجھ میں بھی کچھ اور کا ڈر ہے" ۔۔۔

"اس سے آگے اور کیا ہو گا ۔۔۔ کہ اب بڑے پانی نہیں آئیں گے اور جب ہماری کنک ختم ہو جائے گی اور جو اَن پانی ہے وہ ختم ہو جائے گا ۔ اور ڈھور ڈنگر کے چارے کا کیا ہو گا ۔ اس سے آگے تو کچھ نہیں"۔

"اس سے آگے ۔۔۔" سمرو پھر اٹھ کھڑا ہوا "اس سے آگے پکلی کے آوے کی ٹھیکریاں ہیں جو کناروں کے ساتھ ساتھ زمین میں ہیں اور بہت گہرائی میں ہیں ۔ اتنی گہرائی میں کہ وہ جانے کب اور کتنے برسوں میں کسی مینہ سے باہر آئیں گی اور جانے مینہ کب آتا ہے اور اس سے آگے اونچے کناروں کے درمیان ایک چوڑا راہ ہے جو بل کھاتا ہوا جاتا ہے اور اس راہ میں سوکھے ہوئے گھونگھے اور پتھر ہیں اور گھڑوں کے ٹوٹے ہوئے گول گلے ہیں اور کہیں کہیں جو ادھر سے گزرتے ہیں وہ رات گزارنے کو اور کچھ پکانے کو آگ جلاتے ہیں تو آگ کی سیاہی ہے جو ٹھیکریوں کو کالا کرتی ہے ۔۔۔ اور ہوا ہے ۔۔۔ یہی ہوا تب ہے پر اس کے راستے میں نہ میں ہوں اور نہ تم ہو ۔۔۔ ہم ویسے ہیں جیسے ڈوبو مٹی کے نیچے گہرائی میں جو گئے تو وہ ہیں مٹی میں نیچے اور دور مٹی ۔۔۔ اور اس سے آگے ۔۔۔"

سمرو ایسے بولتا رہا جیسے ہوا کو بتاتا ہو۔ جیسے دریا سے باتیں کرتا ہو اور پاروشنی وہاں نہ ہو اور وہ نہیں تھی ۔ وہ وہاں تھی جہاں سمرو تھا اور جانتی تھی کہ سمرو سوتے میں وہاں جاتا ہے جہاں وہ اب تھا ۔۔۔ اور سمرو بولتا رہا ۔

ایک ہی ماہ میں تیسرے بیل کی آنکھیں پتھر ہوگئیں اور اس پر اڑنے والی مکھیوں کی بھنبھناہٹ یکدم سنائی دینے لگی تو دھروا نے اپنی ٹھوڑی سے چند بال پکڑ کر انہیں نوچ لیا ۔

باڑے کے اندر یوں تو پورے چودہ بیل تھے پر ان میں سے چار تو مرے ہوئے تھے ۔ اور ان کے سڑتے گلتے گوشت کی بساند سے ہر شے پھولتی تھی اور سوائے دھروا کے کوئی اور وہاں سانس نہیں لے سکتا تھا اگر لیتا تو اس کے اندر سے سب کچھ باہر آجاتا منہ سے بھی اور پیچھے سے بھی ۔۔۔ پہلا بیل تو اس روز مرا جب پاروشنی ادھر سے گزری تھی ۔ وہ اسے باڑے سے گھسیٹ کر باہر خشک کھیتوں میں نہیں ڈال سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے گدھ اسے نوچتے اور پیٹ بھرتے اور پوتر بیل مرنے کے باوجود اٹھتا اور دھروا کو کھا جاتا ۔۔۔ یہ کہا جاتا تھا کہ اگر یہ بیل ناراض ہو جائیں تو ایک روز چارہ نہیں کھاتے اور پھر اس سے اگلے روز اس بندے کو کھا جاتے ہیں اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا بلکہ بستی میں رہنے والوں کو بھی شک نہیں ہوتا کہ اسے کھا لیا گیا ہے ۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص بہت دنوں سے دکھائی نہیں دیا ، شائد ڈوبو مٹی نے نگل لیا یا دریا میں چلا گیا پر ہوتا یہ ہے کہ اُسے چپکے سے بیل کھا جاتے ہیں اور صرف ان کی آنکھوں کو غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کسی کو کھایا ہے ۔ پر آج تک کسی نے اتنی ہمت نہ کی تھی کہ کسی کے گم ہونے پر وہ دھروا کی آنکھ بچا کر باڑے میں جاتا اور وہاں بیلوں کی آنکھوں میں دیکھتا اس لئے کسی کو یہ پتہ نہ تھا کہ آنکھوں میں دیکھنے سے بھی آخر پتہ کیسے چلے گا کہ اس نے بندہ کھایا ہے تو بوڑھا دھروا مرے ہوئے بیلوں کو بھی ناراض نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس نے انہیں اسی حالت میں چھوڑ دیا ۔۔۔ اور وہ تینوں مرے ہوئے جنور پلپلے پانی ہوئے اور ہڈیوں سے الگ ہو کر بُو دینے لگے اور ان میں مکوڑوں نے راستے بنا لئے پر وہ وہیں پڑے رہے ۔ دھروا باڑے کے اندر جاتا تو دم روک کر جاتا پر باہر آتے جاتے اسے ایک آدھ سانس لینا پڑتا اور اس کی بُو دیر تک اس کے نتھنوں میں چمٹی رہتی ۔ پہلے تو چارے کے گٹھے کم ہونے لگے اور دھروا نے

سب کو بہت بُرا بھلا کہا اور پھر یہ ہوا کہ سارے دن میں ایک آدھ گٹھا آتا ۔ رکھوں کے آس پاس ابھی تھوڑی بہت سوکھی گھاس تھی اور کبھی کوئی ادھر جاتا اور اس کے سینے میں ان جنوروں کے لئے نرمی آتی تو وہ گھاس کھود کر ایک گٹھا بناتا اور باڑے کے باہر دیوار کے ساتھ رکھ کر چلا جاتا۔

پہلا بیل انہی دنوں میں مرا ۔۔۔ پوہ ماگھ کے دنوں میں ۔۔۔ اور پھر چیتر وساکھ میں درختوں اور جھاڑیوں میں پھوٹ شروع ہوئی تو خشکی کے باوجود کہیں کہیں گھاس پھونس نے بھی سر نکالا تو دھروا جاتا اور اسے کھود لاتا اور کبھی کسی بستی والے کو بھی بُرا بھلا کہہ کر اسے گھاس کھودنے پر مجبور کرتا تاکہ وہ نربو بیلوں کے لئے اتنا تو کرے ورنہ وہ اسے کھا جائیں گے ، پر یہ تھا کہ اب لوگ ایسے ڈراوے میں کم آتے تھے ۔ وہ خود بے حال تھے اور ان کے جثے پہلے سے آدھے رہ گئے تھے ۔ تو وہ پوتر بیلوں کے لئے کیا کرتے ۔۔۔ اگرچہ ان کے پاس باجرے اور تِلوں کے بیج نہ تھے ۔ وہ کب کے ختم ہو چکے تھے پر پھر بھی وہ اس چیتر کو دیکھتے تھے جس میں وہ پہلے فصل کی کٹائی کرتے تھے اور ان کے بھڑولے بھرتے تھے اور ان کے پیٹ کنک سے مست ہوتے تھے اور اپنی سوانیوں پر لوٹتے تھے اور اب بھی آسمان کو دیکھتے تھے کہ شائد مینہ آجائے ، فصل کے لئے نہ سہی ان کے لئے سہی ۔۔۔ رکھوں اور گھاس کے لئے اور گلیوں میں ٹھہری دھول کے لئے اور رکھوں میں چھپے جوہڑوں کے لئے جنہیں ماسا اور چیوا سوکھتا دیکھتے تھے ۔۔۔

پر آسمان ویسا ہی رہا جیسا کہ پچھلے چار پانچ برس سے تھا خالی اور بے رنگ جیسے مٹی کا ہو ۔ پھر بھادوں بھی سوکھا گیا اور اسوں چڑھ گیا اور اسوں کے پہلے دن سب لوگ ایک بار پھر انہی کاموں میں جت گئے جو گئے برسوں میں وہ کرتے تھے ۔ انہوں نے اپنی کسیاں اور کدالیں کاندھوں پر رکھیں اور اپنے لاغر ڈھور ڈنگر لے کر کھیتوں کو گئے جن میں دھول اڑتی تھی ۔ انہیں تو اب یہ نہیں پتہ تھا کہ کونسا کھیت کس کے حصے میں ہے ۔ جیسے ہر بندہ اپنے مہاندرے سے پہچانا جاتا ہے کہ اس کی ناک ایسی ہے اور ہڈیاں ایسی ہیں تو ایسے ہی کھیت بھی اپنی فصل اور اُگاؤ سے جانے جاتے ہیں ۔ وہ اگر سوکھے ہوں اور ان میں ایک دو برس سے مینہ نہ برسا ہو پانی نہ ملا ہو تو وہ پہچانے نہیں جاتے، سب ایک سے ہو جاتے ہیں تو انہیں اپنے کھیتوں کو جاننے کی مشکل ہوئی ۔ ان کے ڈھور ڈنگر بھی کم ہو چکے تھے ۔ وہ ان کی دُمیں مروڑ مروڑ کر چلاتے تھے ورنہ وہ ایک جگہ کھڑے ہو جاتے تو وہاں سے ہلتے نہ تھے اور جو چلتے تھے تو لڑکھڑا کر چلتے تھے ۔ جن کے تھنوں میں دودھ ہوتا تھا وہ اوپر چلا گیا تھا اور بہت کم نیچے آتا تھا ، چارے کے بغیر دودھ کیسے اترتا ۔۔۔ پر اب ان کو پھر سے یقین ہونے لگا کہ سب کچھ ویسا ہی ہو گا جیسا کہ تھا اور انہوں

نے اپنے اپنے حصے کے کھیت پہچانے اور انہیں پھر سے کھودا اور اتنا ہی پسینہ بہایا جتنا کہ وہ پہلے بہاتے تھے اگرچہ ان کی کسیاں جب زمین کو کھودتیں تو زیادہ گہرائی میں نہ جاتیں ان میں اور ان کے یقین میں زور نہ تھا ۔۔۔ کھیت کھود کر وہ اپنے چھپروں اور گھروں میں آئے اور اپنے اپنے چولہے اور دیئے اور چنگیریں اٹھا کر دریا کے کنارے چلے گئے ۔۔۔ بڑے پانی کو دیکھنے ۔۔۔ پاروشنی نے انہیں ایسا کرتے دیکھا اور دیکھتی رہی ۔۔۔ اگر وہ انہیں یہ سب کچھ کرنے سے روکتی تو وہ بالکل ڈھے جاتے ، اب یہ تھا کہ وہ جُتتے تو ہوئے تھے ان کا دھیان تو لگا ہوا تھا ۔۔۔ وہاں دریا کنارے شام ڈھلے سب چولہوں میں اپلے سلگتے تھے پر اب ان کے پاس پکانے کو بہت کم تھا وہ پانی پیتے یا کترن جھاڑی کی جڑیں منہ میں رکھ کر بھوک پرے کرتے ۔۔۔ پر جن کے چولہے جلتے وہ تھوڑا بہت بانٹ کر کھاتے ۔ چولہے کنارے پر کہیں کہیں دہکتے اور جب بُجھتے تو دریا کے پانی تاریکی میں لوٹ جاتے ۔ اب دیئے نہیں جلتے تھے ۔ سرسوں اور تِلوں کا تیل کب کا ختم ہو چکا تھا اور گھی انہیں خود چاہیئے تھا اور وہ بھی تھوڑا تھا ۔

کُتیں کے پہلے دنوں میں وہ جان گئے کہ بڑے پانی اس بار بھی نہیں آئیں گے اور وہ چپکے سے اٹھے اور پھر اپنے چھپروں کو لوٹ گئے جیسے یہی ہونا تھا اور وہ تو صرف من پرچانے کو ادھر آبیٹھے تھے ۔ یوں بھی وہ ڈر سب کے اندر تھا ۔ جب وہ کھیت کھودتے تھے تب بھی تھا اور جب دریا کنارے پانی پر منظر رکھتے تھے تب بھی تھا کہ اس بار بھی کچھ نہ ہوگا اور اب کبھی کچھ نہ ہوگا پر وہ یہ سب کچھ کرتے رہے کھیت کھودتے اور پانی کو دیکھتے رہے کہ یہ نہ کرتے تو اور کرنے کو کچھ نہ تھا ۔

ان سب نے اپنے گھروں میں جا کر گھڑوں کی پال میں سے وہ گھڑے اتار کر دیکھے جن میں کنک رکھی جاتی تھی اور وہ سب کے سب خالی ہونے کو تھے ۔

انہی دنوں کوہان کے بغیر سیدھی کمر والا ایک اور زیبو بیل زمین پر بیٹھا اور اس کی ہڈیاں اسے سہار نہ سکیں اور وہ ڈھیر ہوگیا ۔ دھروا باڑے کے باہر بیٹھا تھا اور وہ جان گیا کہ اب یہ بھی گیا ۔۔۔ وہ اٹھا اور بستی کو چلنے لگا ۔۔۔ باڑے کے اندر تین بیل مرے پڑے تھے اور ان میں سے پہلے کی تو نری ہڈیاں تھیں جو کالی ہو چکی تھیں پر باقی دونوں کا کیڑوں بھرا ماس ادھر ادھر حرکت کرتا رہتا ۔ دھروا نے سوچ لیا تھا کہ اگر اب کوئی اور مرا تو وہ اس کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر اسے باڑے سے نکال کر کُھلے کھیت میں رکھ آئے گا ۔۔۔ باڑے کے اندر ایک اور مرے ہوئے کے لئے جگہ نہ تھی ۔۔۔ شام سے پہلے پہلے وہ چار پانچ لوگوں کو لے آیا پر وہ آتے نہ تھے اور بہت

بُرا بھلا کہنے اور منت سماجت کرنے پر وہ آئے اور ان میں ڈور گا بھی تھا ۔ انہوں نے پہلے تو باڑے کے اندر جانے سے انکار کر دیا کیونکہ دروازے کے پاس جاتے ہی ایسی متلی لانے اور سب کچھ باہر لانے والی بُو آئی کہ وہ فوراً پیچھے ہوگئے ۔ پھر دُھروا نے کچھ سوچا اور اپنی ٹھوڑی کے چند بالوں میں کُھجلی کی اور پھر خود اندر جا کر اس نے مرے ہوئے بیل کی ٹانگوں کو سلماکی رسی سے باندھا اور اس کے سرے کو ہاتھ میں لئے باہر آگیا ۔

"اب یہاں سے اسے باہر کھینچ لو ۔۔۔" اس نے رسّی کا سرا ڈور گا کو تھما دیا ۔ "پر ذرا سہجے سے اسے چوٹ نہ لگے ۔"

"یہ مرا نہیں ؟" ڈور گا حیران ہوا ۔

"مرا تو ہے پر یہ کوئی عام ڈنگر تو نہیں زیبو بیل ہے اور اس میں مانا بستا ہے تو اسے مرے ہوئے بھی چوٹ لگ سکتی ہے ۔"

سب زور لگانے لگے۔

جب اس کا مردہ جُثہ باڑے سے باہر گھسٹتا ہوا آیا تو ڈور گا نے اسے حیرانی سے دیکھا ۔ اس نے ایسا سج دھج والا بیل موہنجو میں بھی نہ دیکھا تھا ۔۔۔ اگرچہ اس کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں پر اس کی تھوتھنی اور سینگ دیکھنے والے تھے ۔ وہ ابھی ابھی مرا تھا اور جہاں جہاں ماس تھا ابھی ڈھلکا نہ تھا ۔۔۔

"دیکھو دیکھو ۔۔۔ اسے چوٹ نہ لگے ۔۔۔ سہجے سے" دھروا کہتا جاتا تھا ۔

زور صرف ڈور گا میں تھا باقی سارے تو مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال رہے تھے اور اسی لئے جب ڈور گا رکا تو سبھی رک گئے ۔ "سنو دھروا اس بیل کو گھسیٹ کر کیا کرنا ہے ؟"

"کرنا کیا ہے ۔۔۔ اسے ابھی تو ذرا دور لے جانا ہے ۔۔۔ باڑے سے پرے کھلے میدان میں ۔۔۔"

"گِدھوں اور کوّوں کے کھانے نوچنے کو ؟"

"نہیں نہیں ۔۔۔" دھروا ڈر کے مارے کانپا "ایسامت کہو ۔۔۔ یہ سن لے گا ۔ مجھے ایسا کرنا پڑا ۔۔۔ ادھر ان کی بُو سے باقی بھی ڈھیلے پڑ رہے تھے صرف اس لئے میں نے سوچا کہ اسے ادھر رکھ دیں ۔۔۔ ہم اسے وہاں رکھ آئیں گے ۔۔۔"

"رکھ آئیں گے ۔۔۔" ڈور گا نے نا سمجھی میں سر کو ہلایا ۔ "اس کی سجاوٹ بناوٹ کرنی ہے وہاں کہ رکھ آئیں گے ۔ اس کے سارے جُثے کو کیڑے مکوڑے تو کھانے سے رہے ، گدھ

اور کوّے ہی کھائیں گے ۔۔۔ تو کیوں نہ ہم کھالیں ۔۔۔"

دھروا کا منہ تڑ سے کھلا جیسے کسی نے اس کا جبڑا چیر دیا ہو اس نے اپنی داڑھی کے چند بالوں کو ٹھوڑی سے چپکانے کی کوشش کی ۔ باقی لوگ بھی منہ کھولے ڈور گا کو دیکھنے لگے ۔ اس نے اپنی لنگی کی ڈب سے پتھر کا ایک تیز پھل نکالا اور بیل کے پاس جا کر اسے تھپکنے لگا ۔

"کیا ۔۔۔ کیا" ۔۔۔ دھروا صرف اتنا کہہ سکا ۔

ڈور گا نے دستی کے اوپر پتھر کے پھل کو ماس میں اتارا اور پھر اسے سہجے سہجے کاٹنے لگا اور اس کے مردہ جسّے میں سے گاڑھی رُت پتھر کے پھل اور ڈور گا کے ہاتھ پر پھیلنے لگی ۔

"تم بھی آؤ" ۔۔۔ وہ پل بھر کے لئے رکا اور دوسروں سے کہنے لگا ۔ "ہمارے پیٹ ماس کے لئے ترسے ہوئے ہیں اور ہم بھوک سے گرتے پڑتے ہیں تو اسے گدھ اور کوّے کیوں کھائیں ۔۔۔ یہ ابھی مرا ہے اور اس کا ماس کھایا جاسکتا ہے" ۔۔۔ وہ آگے ہوئے کہ ان کے پیٹ بھی پچکے ہوئے تھے ۔

اس کی تیز آواز ایسے آئی جیسے اس کے مہین اور بوڑھے جسّے کو چیرتی ہوئی آرہی ہے ۔ "اسے کھاؤ گے ۔۔۔ اسے ۔۔۔ زیبو بیل کو ۔۔۔ تم تم ۔۔۔ یہ تمہیں کھا جائے گا ۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں"

وہ جھجک گئے ۔

"پہلے ہم اسے کھالیں" ۔۔۔ ڈور گا نے ایک بڑا حصہ کاٹ لیا تھا اور اسے کاندھے پر رکھتے ہوئے وہ بولا "پھر یہ کھاتا رہے ہمیں ۔۔۔ دھروا یہ تمہارا زیبو اب پکلی کی کچّی ہانڈی میں ایسے پکے گا کہ ساری بستی کے تھنوں میں اس کے ماس کی باس رچے گی ۔۔۔"

"یہ تجھے کھا جائے گا" ۔۔۔ دھروا چیخا

"تم بھی آگے ہو کر اتار لو ۔ ابھی بہت ہے" ۔۔۔ ڈور گا نے جاتے ہوئے ان کو کہا جو جھجک رہے تھے ۔ "تم گدھوں اور کوّوں سے تو اچھے ہو اور اگر یہ پوتر ہے تو ہمارے جسموں کو زور دے گا ۔۔۔ اتار لو"

جب وہ مُردہ بیل کی جانب بڑھے اور ان کے ہاتھوں میں بھی پتھر کے تیز دھار پھل تھے تو دھروا نے منہ پرے کر لیا اور کہا ۔۔۔ "میں بھی بہت دن سے بھوکا ہوں ۔۔۔"

پاروشنی کی آنکھ کھلی تو دھوپ اس کے چھپر سے نیچے ہو چکی تھی ۔

جب وہ ایک بستی تھے اور کام کاج کرتے تھے اور ان کی سویریں تھیں اور دوپہریں اور شامیں تھیں تب اس چھپر پر اترتی اور ڈھلتی دھوپ اسے دن کے پہر بتاتی تھی اور وہ اس کی طرف دیکھتی رہتی تھی ۔ پر اب اس کے لئے اور بستی والوں کے لئے دھوپ ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی تھی ۔۔۔ انہوں نے نہ کہیں آنا تھا اور نہ جانا تھا ۔۔۔ وہ پڑے اونگھتے رہتے اور آنے والے دنوں کے بارے میں سوچتے رہتے کہ وہ کیسے ہوں گے ۔ اور تب کیا ہوگا اور کبھی بھی ان کے سر میں نہ آتا کہ کیا ہوگا ۔۔۔ وہ اپنے چھپروں میں پڑے رہتے ۔ ان کے بال بچے چھدرے اور گرتے ہوئے رکھوں میں چلے جاتے اور جو وہاں سے ملتا لے آتے ۔۔۔ جو ابھی انہی دنوں کی جم پل تھے وہ اپنی جننے والیوں کی چھاتیوں پر منہ رکھے رہتے ، وہ اپنا منہ چلا چلا کے تھک چکے تھے اور ان میں دودھ کی ایک بوند نہ تھی ۔۔۔ تو پاروشنی بھی دوپہر سے اپنے تھڑے پر ایسے اونگھ رہی تھی اور اب جاگی تھی تو دھوپ چھپر سے نیچے ہو چکی تھی ۔۔۔ ورچن شائد دریا کو جاچکا تھا ۔۔۔ اس کی جگہ خالی تھی ۔۔۔ اسے ایک آواز آئی ۔۔۔ اندر سے کنوئیں والے کمرے میں سے ہلکی گونج کے ساتھ باہر آئی جیسے بوکا پانی میں گرتا ہے ۔۔۔ اور یہی آواز تھی کہ بوکا پانی میں گرتا تھا اور اسی کو گونج تھی ۔۔۔

اسے کتنا پانی چاہئے جو بار بار بوکا گرا کر پانی بھرتا ہے ۔۔۔ پاروشنی نے پاسا پلٹا ۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھی اوز راہداری میں سے ہوتی ہوئی اس کمرے میں آگئی جہاں گہری سیاہی تھی ٹھنڈی اور چپ ۔۔۔ اور ورچن کنوئیں کی منڈیر پر جھکا نیچے دیکھتا تھا ۔ پاروشنی نے اپنے لیڑے الگ کر کے منڈیر پر رکھ دیئے اور اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی ۔ "دو چار بوکے مجھ پر ڈال کر میری آلکس کو دور کرو ۔"

ورچن نے سلما کی رسی کو کھینچا اور بوکا باہر نکال کر پاروشنی کے سر پر اونچا کیا ۔۔۔ پاروشنی

سر کو دونوں ہتھیلیوں میں تھامے جھکی ہوئی انتظار کرنے لگی کہ ٹھنڈا پانی اس کے بالوں میں گر کر پھر سست جسّے پر گرے اور نیند کو دور کرے ۔ "۔۔۔ ورچن ۔۔۔" جب پانی نہ گرا تو اس نے اوپر دیکھا ۔

ورچن نے بو کا الٹا کر خالی کر دیا ۔ وہ جانتی تھی کہ پانی ٹھنڈا ہو گا پر پھر بھی اس کا جسّہ تیار نہ تھا اور وہ کانپنے لگی۔ دوسرے بو کے نے اسے ٹھیک کر دیا ۔

"تم کیا کرتے تھے بار بار بو کا کنوئیں میں گرا کر" ۔۔۔ اس نے پوچھا ۔

ورچن پوری طرح دکھائی نہیں دیتا تھا ۔ اندھیرا تھا اور وہ اس اندھیرے میں بولا "کچھ نہیں ۔۔۔ اپنی آلکس کو دور کرنے کے لئے پانی بھرتا تھا"۔

"تم پانی بھرتے نہیں تھے" ۔۔۔ پاروشنی ہاتھوں میں سر جھکائے بیٹھی تھی اور اندھیرے میں اس کا گیلا پنڈا تھوڑا تھوڑا لشکتا تھا پر جیسے بجھنے کو ہو ۔ "تم بار بار بو کا کنوئیں میں ڈالتے تھے اور اس کی وہ آواز سنتے تھے جو پانی پر گرنے سے باہر آتی تھی ۔۔۔ تم پانی بھرتے نہیں تھے صرف آواز سنتے تھے"۔

ورچن چپ کھڑا رہا۔

"میرے پنڈے کو ابھی پانی چاہیے اور تم رک گئے ہو ۔"

اس نے بو کا کنوئیں میں گرایا اور چھپاک کی آواز اور اس کے بھاری ہونے پر اسے باہر کھینچنے لگا ۔

"آواز کیوں سنتے تھے ؟"

"ایسے ہی ۔۔۔ بس ایسے ہی"۔ وہ جیسے نڈھال ہو کر کہتا ہو ۔

"تم دیکھتے تھے کہ کنوئیں کا پانی بھی نیچے ہو گیا ہے ۔۔۔ اور تم دیکھتے تھے کہ کتنا نیچے ہوا ہے ۔۔۔ ایسا ہونا تھا ۔ ایسا بہت کچھ ابھی ہونا ہے پر تم میرے جسّے پر پانی ڈالتے رہو ۔ اتنا تو اس کنوئیں میں ہے کہ مجھے ٹھنڈا کر سکے ۔۔۔ کیوں ورچن؟"

اس نے خاموشی سے بو کا اس کے جھکے ہوئے سر پر الٹا دیا ۔

دھوپ گلی سے بھی جا چکی تھی اور پتہ نہیں چلتا تھا کہ سویر ہونے کو ہے یا شام اترنے کو ہے ۔۔۔ وہ دونوں باہر آئے تو تین چار کُتّے بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے اور ان کے پاؤں میں لوٹنے لگے ۔۔۔ وہ ایک عجیب سی دردناک آواز نکالتے تھے اور ان کے پاؤں میں لوٹتے تھے ۔ ورچن نے بڑی مشکل سے انہیں پرے کیا ۔

"ان کے پیٹ بھی پچکے ہوئے ہیں" ۔۔۔ ورچن بولا "بستی میں کہیں کوئی ہانڈی فکر نہ ہو تو ان کے پیٹ بھی ساتھ لگیں گے"۔

پہلے شام اترنے کو ہوتی تو لوگ کھیتوں سے لوٹتے ۔ ماتی کے پتروں کی گڈ کی ڈگڑ ڈگڑ دور سے سنائی دیتی ۔ کچھ دریا کنارے ٹھہر جاتے اور چُہلیں کرتے اور کچھ گلی کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر باتیں کرنے لگتے اور جب تک ان کے نتھنوں میں ہانڈی پکنے کی باس نہ آتی وہ وہیں کھڑے رہتے ۔ لیکن اب وہ بہت کم باہر نکلتے ۔۔۔ ہاں ان کے بچوں کے رونے کی آواز بس گلی میں ٹھہری دھول کو پار کر کے بستی میں پھیلتی رہتیں ۔

انہوں نے دور سے دیکھا کہ سمرو وہیں پر ہے جہاں وہ ہر شام بیٹھتا تھا ۔ اور انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ پکلی کے آوے میں سے دھواں اٹھ رہا ہے پر یہ آوے کے چڑھنے کا نہ تھا بلکہ اس چولہے کا تھا جس پر زنبو بیل کا ماس پکتا تھا اور اس کے گرد پکلی کے دونوں بچے بیٹھے تھے اور وہ بار بار اپنے منہ میں پھوٹتے سواد کو نگلتے تھے ۔

وہ سمرو کے ساتھ ہو کر بیٹھ گئے ۔ اس نے ایک ڈھیم اٹھا کر پورے زور سے دریا پر پھینکی اور وہ گری تو ہلکی سی آواز آئی جیسے پاروشنی کے کنوئیں میں سے بو کا گرنے سے آتی تھی ۔

"ہم کیسی حیاتی کر رہے ہیں ؟" سمرو اپنے آپ میں گم تھا ۔" وہ بیج تو ختم ہوا جس کے گرد اگرد ہم سویر اور شام کرتے تھے ۔۔۔ اور اب ہم بیل ہیں کیا کہ اپنے باڑے میں پڑے ہیں اور چارے کے بغیر ہمارا ماس سوکھتا جاتا ہے ۔۔۔ ہم نے اپنے ڈھنگ کو پانی پر بنایا تھا اور اگر وہ ہمارے کھیتوں تک نہیں آتا تو کیا ہر شے ختم ہو گئی ؟ باقی تو سب کچھ ہے ۔ ہم ایسے کیوں ہو گئے ہیں ۔۔۔ ہم کس کی اڈیک میں ہیں ؟"

"میری سمجھ بوجھ میں یہ بات نہیں آ رہی سمرو" ۔۔۔ ورچن اس کے پاس ہوا "کہ یہ بستی والے کیا چاہتے ہیں ۔ آخر کو یہ کیا کریں گے اور جو بھی کریں گے اس بارے ابھی سے سوچ بچار کیوں نہیں کر لیتے"۔۔۔

"سب پڑے ہیں آلکس سے ۔۔۔ ان کے چولہے ٹھنڈے ہیں بھڑولے خالی ہیں اور گلیوں میں دھول ہے ۔ کھیت سوکھ چکے اور چھوٹی موٹی بُوٹیاں بھی ختم ہو چکیں تو کیا یہ لوگ بس ادھر دریا کے پار جانے کی اڈیک میں بیٹھے ہیں ۔۔۔ اپنے اپنے مرتبانوں کی اڈیک میں ہیں جن میں ڈال کر انہیں مٹی میں دبایا جائے گا ۔۔۔ یہ کیا کریں گے"۔

"یہاں کوئی ہو گا تو کسی دوسرے کو مرتبان میں ڈال کر دبائے گا ۔" سمرو نے کہا ۔

"گھاگھرا کے ساتھ ساتھ کوئی یہی ایک بستی تو نہیں اور بھی ہیں ۔۔۔" ورچن سر جھکاتے ہوئے بولتا تھا ۔

"اور وہاں کے لوگ بھی بڑے پانی کے آگے آگے چلتے تھے ۔ وہ تو ایسے نہیں بیٹھ گئے ہوں گے ہماری طرح ۔۔۔ کالی بنگن میں ۔۔۔"

"اپنی بستی تمہیں بری لگتی ہے کیا"؟ پاروشنی تیز دھار میں بولی "تم اسے چھوڑ کر کالی بنگن چلے جاؤ ۔۔۔ ہمیشہ سے تم ایسے رہے ہو ۔ تم نے جڑیں نہیں پکڑیں ۔ کنوئیں میں بھی پانی کم ہو رہا ہے تو کیا ہوا ۔۔۔ ہماری فصلیں نہیں ہیں تو کیا ہوا ۔۔۔ ایسا پہلے بھی تو ہوا ہوگا اور بستی والوں نے وہ وقت گزارا ہوگا کسی نے کسی حیلے سے ۔۔۔ اگر نہ گزارا ہوتا تو ہم نہ ہوتے ۔ تو ہم بھی ذرا بھوک کاٹ کے بے آرام رہ کر یہ وقت کاٹ لیتے ہیں ۔۔۔"

"کب تک ؟" ۔۔۔ ورچن نے کہا ۔

"جب تک سب کچھ پھر سے نہیں پھوٹ آتا ۔۔۔ ہمارے کھیتوں پر ہریاول نہیں بچھ جاتی اور ہمارے کنوؤں کا پانی پھر سے اوپر نہیں آجاتا ۔ اور ایسا ہوگا ۔ اگر اتنے برسوں سے مینہ نہیں اُترا تو ایسا پہلے بھی ہوا ہوگا اور پھر آخر کو مینہ برسے گا ۔۔۔ ہمارے پاس دریا ہے اور ۔۔۔"

"یہ بھی نہیں ہے ۔۔۔"

پاروشنی تیزی سے کچھ بولنے لگی پر ایک ہچکی کے ساتھ اس کا منہ بند ہو گیا اور آنکھیں چوڑی ہو گئیں اور اس کی آنکھوں میں لالی تیرتی تھی اور پھر وہ بے حد دھیمی پڑتے ہوئے بولی ۔ "دریا بھی نہیں ہے ؟"

"تمہیں یاد ہے میری جھجھر میں پانی کم ہو جاتا تھا ۔ جتنا ہونا چاہیے تھا اتنا نہیں ہوتا تھا اور یہ میری سمجھ بوجھ سے باہر ہوتا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے ۔۔۔ یہ گرمی تھی ۔۔۔ دھوپ پہلے سے تیز ہو گئی تھی ۔ اور سہجے سہجے ادھر بستی میں رکھوں میں اور ان کے آس پاس ہر طرف کئی کوس تک اور جانے وہاں تک جہاں سے گھاگھرا آتا ہے گرمی بڑھ گئی تھی ۔ سہجے سہجے اور ہمیں پتہ نہیں چلا ۔۔۔ اس گرمی نے زمین میں سے اور پودوں میں سے اور رکھوں اور بندوں میں سے نمی کو چوسا ۔۔۔ اور ہم جان نہ سکے ۔ اور یہی خشکی اور گرمی رات کو میری جھجھر کا پانی کم کرتی تھی ۔۔۔ وہ پانی ہوا میں گم ہوا تھا جو میری جھجھر میں تھا ۔۔۔ اور تبھی میں دریا پر آتا تھا اور اسے دیکھتا تھا کہ اگر ہوا میں جو تپش ہے وہ میری جھجھر کا پانی چوس سکتی ہے تو پھر وہ اس پھیلے ہوئے دریا کو [illegible] ۔۔۔ اور میں اسی لئے ادھر آتا تھا ۔ دریا کو دیکھنے کہ یہ کم ہوا یا نہیں ۔۔۔ یہ کم تو ہو رہا تھا پر ہم جان نہیں سکے تھے ۔۔۔ یہ گم ہونے کو ہے"

"دریا ۔۔۔ بھی سوکھ رہا ہے"۔ پاروشنی کے اندر بہت سارا شور ہوا جیسے پہاڑوں پر پھیلے سیاہ رکھوں کے ذخیرے میں بے انت بارشیں گر رہی ہیں اور پانی کے برسنے اور گرنے کا اور بہنے کا شور ہے اور پھر یہ سارا شور سہجے سے چپ ہو گیا ۔ ایسے چپ ہوا کہ صرف پاروشنی کا بھاری سانس چلتا تھا اور ان کے سامنے دریا تھا جو اس سانس کو سنتا تھا ۔

"ادھر دیکھو ۔۔۔" سمرو نے پاروشنی کی آنکھوں کے برابر اپنا ہاتھ لا کر دریا کی جانب کیا ۔ کنارے سے کچھ دور جہاں ڈوبو پانی ہوتا ہے وہاں پانی کی ہموار سطح پر ایک بڑے کچھو کی گول پشت ننگی ہو رہی تھی ۔۔۔ کچھو دریا کی تہہ پر تیزی سے چلتا تھا تا کہ اپنی ننگی پشت کو پانی سے ڈھک لے پر ادھر اب اتنا ہی پانی تھا ۔

آندھی کو گزرے ہوئے بہت دن بیت گئے پر ماسا اس سوکھی ہوئی ٹہنی کے گرد ایسے لپٹا رہا کہ دور سے یہ نہ جانا جائے کہ یہ اگر ٹہنی ہے تو ماسا کونسا ہے اور اگر ماسا ہے تو ٹہنی کہاں ہے اور لگتا یہی تھا کہ کوئی سوکھتا رُکھ ہے اور اس کی دو سوکھتی ٹہنیاں ہیں ۔۔۔ ایسا بھی ہوا کہ اس پر کبھی کوئی بھولا بھٹکا پکھیرو بھی آ بیٹھا اور بالکل نہیں ٹھٹھکا کہ وہ اسے ٹہنی جان کر ہی بیٹھا تھا۔ کیڑے مکوڑے تو اس پر سے گزر کر آتے جاتے رہتے ۔ البتہ جب کبھی کوئی چھپکلی یا رینگنے والا کوئی اور جنور اس پر سے رینگتا گزرتا تو اس کے سوکھے ہوئے ماس میں ایسے تھوڑی سی حرکت ہوتی کیونکہ ماسا کو رینگنے والے جنوروں سے بڑی نفرت تھی ۔۔۔ تو وہ وہاں ٹہنی کے گرد لپٹا رہا اور اگر ٹہنی ایسے رُکھ کی نہ ہوتی جو سوکھ چکا تھا تو شائد وہ خود بھی پھوٹ کی رُت میں اس کے ساتھ پُھوٹ پڑتا ۔۔۔ اس کے نیچے رکھوں میں اور ان کے نیچے زمین پر نری ویرانی تھی اور سوکھے پتے تھے جو کبھی کبھی سرسراتے اور پھر اپنی سرسراہٹ میں ہی گم ہو جاتے اور ان میں ٹہنیاں پنجروں کی طرح ابھرتی تھیں ۔ اب وہاں گھاس پھونس بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ گنتی کے چند رکھ تھے جو ڈھیٹ بنے پتے بناتے اور ٹہنیاں نکالتے تھے نہیں تو سارے میں سوکھے کی ایک سوکھی کڑکڑاہٹ تھی جو رکھوں کے تنوں میں سے ایسے نکلتی جیسے وہ بولتے ہوں اور وہ مر رہے ہوں ۔ سوکھتی لکڑی میں سے نکلنے والی یہ کڑکڑی کی آواز رات کے وقت رکھوں کے اندر ہولے ہولے گھومتی جیسے دیکھنے آئی ہو کہ میرے بعد ابھی کتنے باقی ہیں ۔۔۔ چند برس پہلے یہاں رکھوں کے نیچے شام سی رہتی تھی اور اب وہاں سوکھے پتوں پر دھوپ ایسے نکلتی تھی جیسے شکر دوپہر ہو کیونکہ یہی پتے جب اوپر شاخوں کے ساتھ تھے تو اسے روکتے تھے اور اب نیچے گرے تو اسے اپنے ساتھ ہی لے آئے دھوپ کو ۔

"می آؤں ۔۔۔" مور کی مرتی ہوئی آواز شائد ماسا نے ہی سنی ۔

ریت رُکھوں میں اب رکتی نہ تھی ۔۔۔ پہلے وہ رینگتی تھی پر اب کوئی دیکھنے والا ہوتا تو دیکھتا کہ وہ کیسے سوکھے ہوئے رکھوں کے گرد پھیل کر انہیں اپنے ساتھ ملاتی تھی اور کیسے وہ بڑھتی تھی اور رکھ گھٹتے تھے اور انہی رکھوں میں ماسا اور چیوا تھے پر ماسا تو وہیں تھا اور آندھی کو گزرے ہوئے بہت دن بیت گئے پر وہ اس سوکھی ہوئی ٹہنی کے گرد لپٹا رہا ۔۔۔

چیوا کئی بار اسے گم کر دیتا ۔۔۔ اسے یاد نہ رہتا کہ ماسا کونسی ٹہنی کے ساتھ چمٹا ہوا ہے اور کہاں ہے ۔ کئی بار وہ کسی ایسی ٹہنی کے نیچے جا کر اسے آوازیں دینے لگتا جس کے ساتھ کوئی اور ٹہنی چمٹی ہوتی اور وہ اسے ماسا سمجھ بیٹھتا ۔ اب دور سے تو بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ ماسا کونسا ہے اور ٹہنی کونسی ہے ۔ دونوں سوکھے ہوئے تھے اور ہلتے تو صرف تب جب پورا رکھ ہلتا ۔ پھر بھی چیوا اندر سے بڑا شانت تھا کہ وہ ہے تو سہی ۔۔۔ وہ جو اس سے پہلے رکھوں میں آیا اور اس کے لئے راستہ بنایا ۔ پہلے تو یہ ہوا کہ آندھی کے فوراً بعد چیوا نے اس ٹہنی کی طرف دیکھا جہاں ماسا بیٹھا پیلو کھا رہا تھا تو وہ وہاں نہیں تھا ۔ وہ نہ نیچے گرا ہوا تھا اور نہ کسی رکھ میں اٹکا ہوا تھا بس گم ہو چکا تھا تو چیوا نے یہی سمجھا کہ اب وہ گیا دریا کے پار اور اسے بڑا دکھ ہوا ۔ وہ رکھوں میں اکیلا رہ گیا تھا اور وہ بڑا رویا اور اس نے اتنے بین کئے کہ بوڑھا مور بھی تنگ آ گیا کہ یہ کیوں مجھے چین سے مرنے نہیں دیتا اور وہ یہی بین کرتا کہ اگر تو ادھر میرے پاس ہوتا تو تجھے گاگری کی طرح میں ایک بڑے برتن میں دباتا وہیں جہاں وہ ہے اور بچہ ہے جس کے پیچھے پیچھے گاگری چلی گئی ۔۔۔ اور ایسے وہ بہت دن بین کرتا رہا اور جو ہر رات وہ پانی پینے کے لئے رکھوں سے نکل کر گھاگھرا کو جاتا تھا تو وہ وہاں بھی نہ گیا اور پیاسا ہی بیٹھا رہا کہ اسے ماسا کے مرنے کا بڑا دکھ تھا اور ایک روز ایسا ہوا کہ اس کا گلا بیٹھ چکا تھا اور وہ ایک رکھ کے نیچے کھڑا ہو کر "ہا ۔۔۔ مامن ماسا ۔ ہا مامن ماسا" کے بین کر رہا تھا اور رُوئے جا رہا تھا تو اوپر سے کسی نے مدھم سی آواز میں کہا "چیوا چُپ کر" ۔۔۔

اس پر چیوا چپ تو ہوا پر اس کے اندر ڈر آیا کہ یہ کون ہے ؟ کیا یہ رکھوں کی روحیں یکشنی ہیں جو اسے کہتی ہیں کہ چپ کر پر اسے لگا کہ آواز ایسی ہے جو اس نے کہیں سنی ہے ۔۔۔ اس نے اوپر دیکھا تو بہت اوپر ایک سوکھی ہوئی ٹہنی تھی ٹیڑھی میڑھی اور اس کے ساتھ ایک اور ٹہنی لپٹی ہوئی تھی اور جب اس نے بہت دیر تک اسے دیکھا تو اس لپٹی ہوئی ٹہنی میں ماسا کی پتلی پتلی دو ٹانگیں اور دو ہاتھ تھے ۔ اور کھوپڑی تھی پر اسی رنگت کی جیسی اس ٹہنی کی تھی ۔

"مامن ماسا ۔۔۔" اس کی باچھیں کھل گئیں اور وہ تیزی سے رکھ پر چڑھنے لگا تاکہ اپنے مامن کو وہاں سے اتار لائے پر ابھی وہ اس کے قریب نہ ہوا تھا کہ ایک بار پھر اس کی مہین آواز آئی "چیوا پرے رہ" اور چیوا وہیں رک گیا جہاں تھا ۔

"کیوں مامن ؟" اس نے پوچھا ۔

"میں اب یہیں رہوں گا ۔۔" مدھم سی آواز آئی ۔

"پر کیوں ؟"

"رُکھ کہیں آتا جاتا نہیں ۔۔۔ میں رکھ ہوں" ماسا نے کہا ۔

چیوا نے جانا کہ اس آندھی کی وجہ سے مامن ماسا تھوڑا اور ہل گیا ہے اور چند روز میں ٹھیک ہو کر نیچے آجائے گا اور وہ دونوں ایک مرتبہ پھر اکٹھے اچھلیں کودیں گے ۔۔۔ پر ایسا نہ ہوا ۔ وہ روزانہ سویرے اور شام کو ادھر آتا اور اس کے نیچے کھڑا ہو جاتا "مامن ماسا آجاؤ ۔۔۔"

"جاؤ ۔۔۔ چیوا جاؤ" ۔۔۔ اور چیوا سر جھکا کر چلا جاتا ۔ وہ یہ نہیں کر سکتا تھا کہ ماسا کا کہنا نہ مانے ۔۔۔

"پر مامن تم ادھر کھاتے پیتے کیا ہو ؟" ایک روز چیوا نے پوچھا ۔

"جو کچھ رُکھ کھاتے پیتے ہیں ۔۔۔ میں بھی تو رکھ ہوں"

"پر یہ تو سوکھ رہے ہیں ۔۔۔"

"تو میں بھی سوکھ رہا ہوں ۔۔۔"

چیوا سر جھکاتا اور چلا جاتا اور اسی طرح کئی بار ایسا ہوا کہ وہ اس جگہ آیا جہاں اوپر مامن ماسا تھا اور وہ سوکھی ٹہنیوں میں اتنا گھلا ملا ہوتا کہ بڑی دیر تک اسے پتہ نہ چلتا کہ وہ کہاں ہے اور کس ٹہنی کے ساتھ ہے اور وہ منہ اٹھا کر بولنے لگتا ۔ ادھر سے جواب آتا تو وہ جانتا کہ وہ جو اوپر دائیں ہاتھ پر ٹہنی ہے تو وہ اصل میں ٹہنی نہیں ماسا ہے ۔۔۔ کئی بار جواب نہ آتا تو وہ جانتا کہ وہ جو اوپر ٹہنی ہے تو اصل میں بھی ٹہنی ہے ۔۔۔ پر چیوا مامن ماسا کے بارے میں اپنے آپ کو پریشان کرتا تھا کہ اس کا کیا بنے گا ۔۔۔ ریت رکھوں میں پھیل رہی تھی اور جس رکھ کے ساتھ ماسا چمٹا ہوا تھا ادھر سے ریت ہر روز نزدیک ہو رہی تھی اور سوکھے ہوئے درخت گر رہے تھے اور ریت ان پر اپنی تہیں سرکاتی ہوئی آگے آرہی تھی ۔۔۔ چیوا چاہتا تھا کہ مامن ماسا نیچے آجائے یا اس ٹہنی کو چھوڑ دے یا وہ ٹہنی اسے چھوڑ دے اور وہ دونوں رکھوں کے اندر کہیں چلے جائیں ریت سے دور ۔۔۔ پر رکھ اب بڑے تھوڑے سے تھے اور ریت بہت ہو رہی تھی ۔۔۔ کچھ تو سوکھے کی بنا پر اور کچھ اس آندھی کی وجہ سے جو آئی اور پھر رکھوں میں اور بستی کے اوپر اور اس کے چھپروں میں اور گھاگھرا پر اور مٹی ہوتے کھیتوں پر آس پاس ہر جگہ چلتی رہی اور اس میں ریت بہت تھی ۔ باڑ کا مہینہ یوں تو کبھی خالی نہیں جاتا تھا ، دو چار آندھیاں ضرور آتی تھیں اور ایسے آتی تھیں کہ ہر سو اندھیرا چھا جاتا تھا ، دن میں رات پڑ جاتی تھی پر اس بار ۔۔۔ کچھ اور ہوا ۔۔۔

جس روز پاروشنی ورچن اور سمرو نے گھاگھرا کے کم ہوتے پانیوں میں ایک کچھو کی ننگی پیٹھ دیکھی تھی کہ وہاں اتنا پانی نہ تھا کہ وہ اسے ڈھک سکے تو اس روز کے کئی مہینے بعد باڑ کے بیچ میں وہ آندھی اٹھی اور سب نے اسے اپنے سانسوں میں بھر بھر کر خوشی سے اور بھیگتی آنکھوں سے اپنے اندر اتارا کہ اب جو آندھی آئی ہے تو اس کے ساتھ مینہ بھی ہو گا پر ایسا ہوا نہیں اور آندھی کے ساتھ ریت تھی جو اندھیرا کرتی تھی ۔۔۔ اور ایسا پہلی بار ہوا کہ ہوا میں ریت ہو ۔ اس آندھی نے چھپر اڑائے جو ریت کی ہوا میں اڑتے گھاگھرا میں جا گرے اور لوگ اپنے سر گھٹنوں میں چھپائے آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے ۔۔۔ اور یہ بہت دیر نہیں چلی ۔ بس اٹھی ، چلی اور پھر تھم گئی ۔ لوگ گھروں سے نکلے اور گلی میں پڑی اپنی چیزیں اٹھا اٹھا کر واپس لانے لگے جو آندھی سے اڑ کر ادھر ادھر ہو گئی تھیں ۔ آسمان بھی صاف ہو گیا ۔ پر ایک عجیب بات ہوئی کہ مینہ کی ایک بوند بھی نیچے نہ آئی اور ریت کی ایک موٹی تہ ہر سُو بچھی ہوئی تھی ۔ ویہڑوں میں ، گلی میں ڈوبو مٹی پر ۔ گھاگھرا کے کنارے ۔ سروٹوں کے پتوں پر ۔ چھپروں کی دیواروں کے ساتھ اس کے ڈھیر تھے ۔۔۔ اور وہ کھیت جہاں خشک مٹی اڑا کرتی تھی وہ سارے کے سارے ریت سے پھرے ہو گئے تھے ۔ مٹی کم دکھتی تھی ۔۔۔ بستی کے آس پاس کئی جگہ پر جہاں کہیں ٹبّے ٹوئے تھے وہ سب ریت نے بھر دیئے تھے ۔۔۔ ریت بچھنے سے یہ ہوا کہ سب کچھ ایک سا اور ایک ہی رنگ کا ہو گیا اور کئی روز تک راستے نہ ملے کہ وہ دب چکے تھے اور لوگ انہیں بھول جاتے ۔۔۔ اسی آندھی میں ماسا سوکھی ٹہنی کے ساتھ چمٹا تھا اور پھر اسے چھوڑتا نہیں تھا ۔ ریت رکھوں پر بھی برسی تھی اور سوکھے پتوں اور ان پر ڈھیر ہوتی ٹہنیوں اور شاخوں پر بھی جمی ہوئی تھی ۔۔۔ پانی کے تالاب تو کب کے خشک ہو گئے تھے ۔۔۔ چیوا جھیل کی طرف بھی گیا تھا اور وہاں جہاں پانی ہوا کرتے تھے وہاں ریت تھی جو باہر سے اڑ کر آتی تھی اور دھیرے دھیرے پرندوں کی ہڈیوں کے ڈھیر میں گرتی تھی ، اسے ڈھانپتی تھی پر یہاں وہاں کہیں کہیں اب بھی کوئی ہڈی ریت سے باہر نکلتی تھی ۔

چیوا ، ماسا کے بارے میں فکر کرتا تھا ۔

وہ کئی دن سے پانی پینے بھی نہیں گیا تھا ۔۔۔ اس رُکھ کے آس پاس رہتا جہاں ماسا تھا ۔۔۔ پکھیرو بھی کم ہو رہے تھے اور جنور تو اب تھے نہیں ۔۔۔ پر وہ وہاں ابھی تک تھا ۔۔۔ ڈکراتا ہوا اور اس کی موجودگی وہاں سارا وقت ٹھہری رہتی ۔

اور جن دنوں میں بڑے پانی آیا کرتے تھے اور انہیں ہرا کرتے تھے انہی دنوں میں بستی کا پہلا بچہ بھوک سے نڈھال ہوا اور ڈھلک گیا ۔

اس روز شام جب اترتی تھی اور وہ اسے پتھروں کے راستے میں ایک اور پتھر بنا کر واپس آ رہے تھے تو ہر ایک کے دل میں اس بستی کو چھوڑنے کا خیال آیا ۔۔۔ ان میں سے صرف ورچن تھا جو باہر گیا تھا نہیں تو سب کے سب کبھی دور نہیں ہوئے تھے ۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ کہاں جائیں گے پر انہیں یہ پتہ تھا کہ اب یہ سب ریت ہوگا اور سوکھا ہوگا اور یہاں حیاتی گم ہوگی تو ادھر سے جانا چاہیے ۔۔۔ ان کے بھڑولے اور گھڑے کنک اور باجرے اور دالوں کے آخری دانے سے خالی ہونے کے بعد بہت دن گزر چکے تھے ۔۔۔ وہ ان میں ہاتھ لٹکا کر دیکھتے کہ شائد وہاں کچھ ہو پر وہاں کچھ نہ تھا ۔۔۔ اب ان کے پاس کچی چار دیواریاں تھیں اور ان کے چھپر گلی میں اور پرے لِنگ ٹیلے کے پاس ریت میں پڑے تھے اور ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ انہیں اٹھا کر لائیں اور اپنے آپ کو تیز دھوپ سے بچائیں جو اب جلاتی تھی ایسے کہ وہ چمڑی کو خشک کر کے ایسے کڑکڑاتی تھی جیسے سوکھی ٹہنی کڑکڑاتی ہے ۔۔۔ کھانے کو کچھ نہ تھا ، پانی تھا جو ان کے اندر جا کر بھوک کو تھوڑی دیر کے لئے ڈبوتا اور جو پھر سوکھ کر ہونٹوں پر پپڑیوں کی صورت میں جم جاتی ۔

انہی دنوں جب دھروا پانی لینے کو جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ لِنگ ٹیلے کے قریب لنگ کے ٹکڑے پڑے ہیں ، کسی نے اسے توڑ دیا تھا ۔۔۔ اس کے زیبو بیلوں میں سے صرف چار باقی رہ گئے تھے اور وہ بھی بیل کیا تھے پنجر تھے جو نیم تاریک باڑے میں پڑے ہوئے تھے ۔۔۔ چارے کے بغیر نرے پانی پر تھے ۔ ڈور گا ایک رات آیا تھا اور کہتا تھا کہ میں نے ہوا میں سونگھا ہے کہ ایک اور بیل ختم ہو گیا ہے تو میں اسے لینے آیا ہوں اور دھروا نے کہا کہ نہیں ختم تو نہیں وہ ابھی سانس لیتا ہے تو ڈور گا نے کہا ۔ ختم ہو گیا ہے میں جانتا ہوں ۔ وہ اندر گیا اور باہر آیا تو اس

کے کاندھوں پر بیل کا آدھا دھڑ تھا ۔۔۔ دھروا کو اس پر شک تھا کہ بیل مرا نہیں تھا ابھی سانس لیتا تھا ۔۔۔ اس نے لنگ کے ایک ٹکڑے کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا اور پھر پھینک دیا ۔۔۔ جو لِنگ مینہ نہ برسائے وہ کس کام کا ۔۔۔ اور ویسے ہی بیل ۔۔۔

آندھی کے بعد ایک روز سمرو گھاگھرا کو تکتا تھا تو اس نے دیکھا کہ پانی کا رنگ بدلا ہے اور اس کا بہاؤ کچھ تیز ہو رہا ہے اور اس میں پتے اور ٹہنیاں دکھائی دیتے ہیں جو دھلے ہوئے ہرے رنگ کے ہیں جو سمرو کی آنکھوں نے کئی برسوں سے نہ دیکھا تھا ۔ اس کا کلیجہ بُری طرح دھڑکا ۔۔۔ جُثہ پسینے سے بھیگنے لگا ۔۔۔ یہ میں کیا دیکھتا ہوں ، اس نے سر جھٹکا جیسے اسے شک ہو کہ وہ سوتے میں چلتا ہے اور دیکھتا ہے ۔ پر سوتے میں چلتے ہوئے اس نے جب بھی دیکھا دو اونچے خشک کناروں کو دیکھا جن کے درمیان ایک دھول سے اٹی گذرگاہ تھی جس میں دھوپ میں تپتی سیپیاں اور ٹھیکریاں تھیں اور ہر طرف ریت تھی اور جو برتن وہ آج دیکھتا تھا ان کی ٹھیکریاں کل میں وہ سوتے میں دیکھتا تھا ۔۔۔ اور پھر اس کی نظروں کے سامنے پانی کا بہاؤ اور تیز ہونے لگا ۔۔۔ پہاڑ پاسے پانی ابھرتا ہوا چلا آتا تھا اور اس پر جھاگ تھی اور آخر میں پانی کے بولنے کی آواز آئی ۔۔۔ بڑے پانی کے آنے کا آخری سندیسہ ۔۔۔ وہ اٹھا اور گھاگھرا سے منہ موڑ کر کنارے پر چلنے لگا ۔۔۔ اس کا سر جُھکا تھا اور وہ سوچتا تھا ۔ کبھی وہ مڑ کر دیکھ لیتا اور پھر یکدم اس نے بستی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا ۔ جب وہ بڑی گلی میں داخل ہوا تو اس کا سانس چھوٹا ہو رہا تھا اور اس کے پاؤں پسینے میں بھیگتے زمین پر پڑتے تھے ۔ دو لاغر کتوں نے اسے سر اٹھا کر دیکھا دُم ہلانے کی کوشش کی اور پھر ڈھیر ہو گئے ۔

اس ویہڑے میں ورچن پیڑھی پر بیٹھا تھا اور وہ چولہے میں پھونک مارنے کو جھکی تھی جب سمرو آیا ۔ اسے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔۔ ورچن بھی اٹھا ۔

"تمہارے پیچھے کون آتا ہے جو یوں ڈر میں بھاگتے آتے ہو ؟" ورچن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا سمرو یکدم بول نہ سکا ۔ پاروشنی نے کچھ نہ پوچھا ۔ اس نے انتظار کیا اور جب وہ جان گئی کہ اب وہ سنبھل کر کچھ کہہ سکتا ہے تو اس نے کہا ۔۔۔ "بول سمرو !"

"میں ادھر تھا ۔۔۔ کنارے پر ۔۔۔ اور مجھے یوں لگا کہ بڑے پانی آنے کو ہیں ۔۔۔"

پاروشنی کا سانس رکا ۔

ورچن نے تھوک نگل کر بے یقینی میں سر ہلایا ۔

"تم سوتے میں چلتے گئے ہو !"

"نہیں ۔۔۔" اس نے سر جھٹکا "میں وہاں کنارے پر اسے تکتا تھا ہر روز کی طرح ہر شام کی طرح ۔۔۔ ایسے تکتا تھا جیسے ۔۔۔ جیسے" اس نے پاروشنی کے دونوں کندھے پکڑ کر کہا "جیسے یہ تمہارا مہاندرہ ہے بھوک سے کملائے ہوئے بوٹے کی طرح گرتا ہوا ۔۔۔ اور اس ویہڑے کے کونے میں ریت کا وہ ڈھیر ہے جسے تم نے جھاڑو سے دھکیلا اس آندھی کے بعد ۔۔۔ ایسے ہی میں اسے تکتا تھا ۔۔۔"

"یہ ویسی باتیں ہیں جو تم کیا کرتے تھے جب میں تمہارے سامنے ہوتی تھی ۔۔" پاروشنی بولی پر دھیمے سے کہ وہ یہ اپنے آپ سے کہتی تھی ۔

"تو پہلے میں نے اس بے چینی کو دیکھا جو پانی میں کروٹیں بدلتی ہے جب اس میں بڑے پانی آنے کو ہوتے ہیں اور پھر بوٹے اور پتے اور جھاگ ۔۔۔ اور پھر دریا کی آواز"

"دریا بولا ؟" پاروشنی کو جیسے بچھو نے کاٹ لیا ۔

"ہاں ۔۔۔ وہ بول رہا ہے ۔۔۔" سمرو نے پاروشنی کو دیکھا یہ بھول کر کہ ورچن وہاں پر ہے ۔

"چلو ۔۔۔" وہ باہر نکل گئی ۔

وہ تینوں قدم تیز رکھتے تھے اور ان کے کلیجے دھڑکتے تھے ۔ ان کے سوا وہاں کوئی اور نہ تھا کیونکہ اب کوئی باہر نہیں نکلتا تھا ۔ کچی چار دیواریوں کے اندر وہ ٹیک لگائے بیٹھے رہتے تھے اور ان کے اندر بھوک سوکھتی تھی ۔۔۔ صرف ڈورگا ، ورچن ، سمرو ، اور پاروشنی ایسے تھے جو ابھی کھڑے تھے اور چلتے تھے ، اور جو کچھ ملتا اسے دوسروں تک پہنچاتے تھے باقی سب ڈھے گئے تھے ۔

سروٹوں کے قریب پہنچ کر وہ رکے اور پھر ان کے قدم ہولے ہولے اٹھنے لگے ۔ جیسے ڈرتے ہوں کہ آگے شاید وہ نہ ہو جو سمرو نے بتایا تھا اور اس نے یہ سب سوتے میں دیکھا تھا ، پر انہوں نے دیکھا ، ڈھلتی شام میں اور اس دھول میں جو بستی پر اور گھاگھرا پر ٹھہری ہوئی تھی اور اس میں ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ٹھہراؤ کی بُو تھی ۔ اسی دھول میں دریا کی ہموار سطح میں سے ٹہنیاں اور پتے ڈوبتے ابھرتے تھے اور ان کے بہاؤ میں تیزی تھی اور کہیں جھاگ اور بلبلے تھے اور شائد دریا کی آواز بھی تھی ۔۔۔ ان کے جُثّے ایسے کانپنے لگے جیسے وہ ابھی ماں کی کوکھ سے باہر آئے ہوں اور ان کی گیلاہٹ پر ہوا اثر کرتی ہو ۔۔۔ پھر پاروشنی کنارے سے نیچے اتری ۔ اسے پانی تک پہنچنے کے لئے دور تک چلنا پڑا ۔۔۔ اور جہاں پانی تھا وہاں دریا کی تہہ بھی دکھائی دیتی تھی اور جو پانی ذرا

گہرا تھا وہ کہیں بیچ میں تھا اور وہیں پر بہاؤ میں تیزی تھی ۔ پاروشنی نے آنکھیں بھینچ کر پانی کو دیکھا اور دیکھتی رہی جیسے اسے یاد کرتی ہو اسے اپنے اندر سنبھالتی ہو اور پھر وہ تھکے قدموں سے واپس آئی اور کہنے لگی "واپس چلو میرے چولہے میں رکھے اپلے دھواں دے رہے ہیں ۔۔۔"

وہ انہی قدموں پر واپس چلے گئے ۔

وہ ایک مرتبہ پھر چولہے پر جھکی اور ان اُپلوں کو پھونکیں مارنے لگی جن کے اندر کہیں کوئی جلن تھی پر ان کے اوپر راکھ سفید ہوتی تھی اور پھونک مارنے سے وہ راکھ اڑی اور اس کے سیاہ مہاندرے پر بیٹھنے لگی ۔۔۔ اس کے اندر بھی کہیں جلن تھی پر اوپر سے وہ سفید راکھ تھی اور یہ جو ورچن ہے اور سمرو ہے تو انہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ ہم پھونک مار کر دیکھیں تو سہی ۔۔۔ دھواں کم ہوا تو اس نے اوپر دیکھا اور وہ دونوں اسے آنکھیں پھیلائے دیکھتے جا رہے تھے کہ تم جو ادھر کنارے سے اتری تھیں اور پانی کو دیکھ کر آئی تھیں تو اب بولو کہ وہ کیا تھا ۔۔۔ کچھ تھا یا وہ سب سوتے میں دیکھا تھا اور تب اس نے سمرو کے پنڈے پر ہتھیلی رکھ کر کہا "اوپر ۔۔۔ یہاں سے بہت دور کہیں مینہ برسا ہے اور اس کا پانی دریا کے بہاؤ کو تیز کرتا ہے اور ساتھ ٹہنیاں اور پتے لایا ہے پر یہ سب تھوڑی دیر کے لیے ہے ۔۔۔ اب جا کر دیکھو تو وہاں وہی پانی ہو گا جو پہلے تھا اور وہی بہاؤ ہو گا جو پہلے تھا ۔۔۔ ایسا پہلے بھی ہوتا تھا ۔۔۔ بڑے پانی جب آتے تھے تو وہ صاف اور ٹھنڈک کی تیزی کے ساتھ آتے تھے ۔۔۔ اور مینہ کا پانی گدلا ہوتا ہے اور میں نے اسے دیکھا تو جان لیا ۔۔۔"

اُپلوں کا دھواں ورچن کے کئی روز سے خالی پیٹ میں گیا تو مستی سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں ۔ "تو یہ ایسے ہی تھا جیسے میں نے سب کچھ سوتے میں دیکھا ہو ۔۔۔" مایوسی سمرو پر ایک بھاری پتھر کا بوجھ ڈالتی تھی ۔

"پتہ نہیں ۔۔۔" پاروشنی نے سر ہلایا "ہم سوتے میں کیا دیکھتے اور جاگتے میں کیا دیکھتے ہیں اور ان دونوں میں سے وہ کونسا سمے ہے جب ہماری آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور کب ان آنکھوں میں اندھیرا ہوتا ہے" ویہڑے کے ان ڈھکے حصے کے ایک کونے میں گھڑوں کی ایک پال تھی جس کے نچلے گھڑے کے گرد ریت کی تہہ تھی ۔ پاروشنی نے ادھر ہاتھ کیا "بیچ والا گھڑا لے آؤ اس میں تھوڑی کنک ہے"

سمرو اٹھ کر ادھر گیا اور ورچن نے دھوئیں کی مستی سے باہر آ کر اپنے آپ کو سنبھالا ۔

"تمہارے پاس اب بھی کچھ ہے ؟" ورچن بولا ۔

"نہیں ۔۔۔" پاروشنی بولی "کنک کے چند دانے ہیں جو میں نے سنبھالے ہوئے ہیں ۔۔۔ کھیتوں میں پانی آئے گا تو ہمیں ان کی ضرورت ہوگی ۔ ہم ان کو بوئیں گے اور پھر فصل ہوگی ، ہری بھری اور نرم سِٹّوں والی ۔۔۔"

سمرو گھڑے کی گردن پر ہتھیلیاں جمائے اسے اٹھا لایا ۔ اور چولہے کے قریب رکھ دیا ۔۔۔

"یہ تو خالی لگتا ہے ۔۔۔" اس نے اس کے اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا پر جب اس کی مٹھی باہر آئی تو اس میں تھوڑی سی کنک تھی ۔

"اس میں سے آدھی گھڑے میں رکھ دو ۔۔۔"

"آدھی ؟ ۔۔" سمرو حیران ہو کر بولا "ایک مٹھی کنک سے بھی ایک روٹی مشکل سے بنے گی تو آدھی مٹھی بچا کر تم کیا کرو گی ؟"

"میں نے ابھی بتایا ہے کہ جب کھیتوں میں پانی آئے گا تو ہمیں اس کی ضرورت ہوگی ۔۔۔ ہم اسے بوئیں گے"

سمرو نے فکر مندی سے ورچن کو دیکھا جو پہلے ہی پاروشنی کی بات سن کر دکھی ہوا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے ۔

"تم دونوں یہ سمجھ رہے کہ میں سر میں ذرا کچی ہو گئی ہوں ۔۔۔"

"نہیں ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ دریا سوکھ رہا ہے ۔۔۔ اور اب کتنے دن اور رہے گا ؟ دو چار ماہ ۔۔۔ اور پھر کھیت ریت میں دب چکے ہیں اور ہمارے چھپر آندھی سے اڑ چکے ہیں اور نیچے ۔۔۔ سب کچھ تو گم ہونے کو ہے اور تم کہتی ہو کہ ہمیں اس آدھی مٹھی کنک کی ضرورت ہوگی ؟"

"ہاں ۔۔۔" پاروشنی کی آنکھیں جیسے جلتی تھیں ۔۔۔ "سب کچھ کبھی بھی گم نہیں ہوتا ۔۔۔ کھیت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں اگر تمہارے پاس آدھی مٹھی کنک ہو تو ۔۔۔ اور تم اسے گھڑے میں ڈال دو"

سمرو نے مٹھی کھولی اور کنک کے دانے تیزی سے گھڑے میں گرنے لگے ۔۔۔ بقیہ آدھی مٹھی کو اس نے پاروشنی کی طرف بڑھا دیا ۔ اس نے کنک لی اور اسے پتھر پر پھیلا کر کوٹنے کے لئے موہنگلی اٹھائی پر وہ بہت بھاری تھی ۔۔۔ اس نے بھی کئی دن سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اس کے پیٹ میں صرف خالی پانی تھا جو اسے ڈھیلا اور بے بس کرتا تھا ۔

"سمرو تم کوٹو مجھ میں ہمت نہیں ۔۔۔"

سمرو اٹھا اور موہنگلی اٹھا کر کنک کوٹنے لگا ۔۔۔ دانے کم تھے اور وہ بڑی مشکل سے نیچے آتے تھے ۔۔۔

وہ چھوٹی سی روٹی جس میں اُپلوں کی باس رچی ہوئی تھی اور ان کا دھواں اس کے مزے میں ملا ہوا تھا گرم تھی اور اس میں اس کنک کی مست مہک تھی جو کبھی ان کی بستی میں کال میں نہ تھی اور بہت تھی اور ان کے تالو سویر شام اس کے سواد سے ملتے تھے اور وہ ان کے اندر جا کر انہیں بھی مست کرتی تھی اور اب کتنے دنوں بعد اس کا سواد انہوں نے چکھا تھا ؟ ۔۔۔ اس کا حساب نہ تھا ۔۔۔ اور کیا یہ آخری سواد تھا ، گم ہونے سے پہلے کنک کا آخری سواد ۔۔۔ ان کے حصے دو دو بُرکیاں آئیں اور وہ تینوں سر جھکائے اسے غور سے دانتوں تلے چباتے رہے اور وہ اسے نگلتے نہیں تھے جب تک وہ خود بخود باریک ہو کر گلے میں سے پھسل کر ان کے جُثے میں نہیں چلی جاتی تھی ۔۔۔ اس آخری سواد نے ان کی ساری حیاتی بھی سامنے رکھی اور وہ اس میں بہت دیر گم رہے ۔ ایک دوسرے سے الگ ہو کر وہ پیچھے جاتے رہے اور واپس آتے رہے اور شام گہری ہو کر رات ہوئی اور اپلوں پر سفید راکھ کی تہہ موٹی ہوتی گئی ۔۔ اور پھر ان میں سے پاروشنی اٹھی اور اندر جا کر پانی کا بوکا بھر لائی ۔۔۔ انہوں نے سر جھکا کر چُلو آگے کئے اور بوکے سے پانی ان میں گر کر ان کے اندر بہتا گیا ۔۔۔

"پانی کا سواد بھی بدل رہا ہے ۔۔۔" سمرو نے سر اٹھایا ۔

"ہاں ۔۔۔" پاروشنی نے بوکے کو سمرو کے اوپر لا کر ترچھا کیا اور بچا ہوا پانی اس کے منہ سر پر گرا "اس میں اب مٹی ہوتی ہے ۔۔۔"

ورچن نے تیوڑی چڑھا کر اوپر دیکھا "مٹی ؟"

"کنوئیں کی تہہ میں کیچڑ ہوتا ہے ۔۔۔ اور پانی نیچے ہو رہا ہے ۔۔۔ یہ بھی سوکھے گاگھرا کی طرح ۔۔۔"

وہ تینوں رات کی سیاہی میں جہاں جہاں بیٹھے تھے گُم سُم بیٹھے رہے ۔ بہت دنوں بعد انہوں نے کچھ کھایا تھا اور اب ان کے سامنے آنے والے دنوں کی عجیب عجیب شکلیں بنتی تھیں ۔

"ہم یہاں اس بستی میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں ؟" آخر ورچن ہی بولا "پرسوں ایسا ہوا کہ میں پکلی کے آوے کی طرف جا رہا تھا ڈورگا کے پاس تو پرے رکھوں اور آوے کے بیچ میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو نیچے کو جا رہے تھے جدھر دریا بہتا ہے اور انہوں نے کہا کہ پہلے وہ اوپر گئے تھے جدھر سے گھاگھرا آتا ہے اور وہاں جو دو چار بستیاں ہیں وہ لوگوں سے خالی ہیں اور ادھر کوئی

نہیں ۔۔۔ وہ سب وہاں سے جا چکے ہیں“

”کہاں ؟“ پاروشنی بولی ۔

”ادھر ریت میں ۔۔۔ اس کے پار ۔۔۔ جہاں بھی پانی ہو وہاں ۔۔۔ اور صرف ہماری بستی ہے جس میں ابھی تک ہم مُردوں کی طرح پڑے ہیں اور اسے چھوڑتے نہیں ۔۔۔“

”میرے پاس آدھی مٹھی کنک ہے ۔۔۔“ پاروشنی نے صرف اتنا کہا ۔۔۔

سمرو نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور ریت کو محسوس کیا، وہ اٹھا اور باہر آگیا ۔۔۔ رات گرم تھی اور سب کچھ جیسے ٹھہرا ہوا تھا اور سانس کہیں نہیں تھا ۔ وہ گلی میں سے نکل کر بستی سے باہر ہوا اور اپنے چھپر کے آگے سے گذر کر کنارے کی طرف مڑ گیا ۔۔۔ وہاں دریا کنارے جہاں وہ بیٹھا تھا ابھی تک ریت دبی ہوئی تھی پر اس وقت دریا دکھائی نہیں دیتا تھا پر وہ چپ تھا اس میں کوئی آواز نہ تھی وہ بولتا نہ تھا پاروشنی ٹھیک کہتی تھی کہ یہ مینہ کا پانی ہے جو چڑھتا ہے اور اتر جاتا ہے ۔ دریا نہیں دکھتا تھا لیکن وہ ٹاپو اس میں بڑے دکھتے تھے جو پہلے چھوٹے چھوٹے تھے ۔۔۔ اور وہ پانی میں سے جیسے باہر نکلتے تھے ۔۔۔ بڑے بڑے کچھوؤں کی طرح پانی میں بیٹھے تھے اور ان کی پشت ننگی ہوتی تھی اور وہ اب اپنے آپ کو ڈھکنا چاہتے تھے پر اتنا پانی نہیں تھا ۔

”میں یہاں کیا کر رہا ہوں ؟۔۔ جب یہاں سامنے صرف اونچے خشک کنارے ہوں گے اور ٹھیکریاں ہوں گی اور گھونگھے ہوں گے اور ان پر سورج چمکے گا اور آس پاس ریت ہی ریت ہوگی بے انت اور کوئی نہ جانے گا کہ یہاں ہم تھے ، میں تھا ، پاروشنی تھی ۔۔۔ بس یہ پاروشنی تھی جو روکتی تھی ۔ اس نے کبھی زبان سے تو نہ کہا تھا پر وہ جہاں ہوتی وہاں کی ہوا بھی رکتی ۔۔۔ اور پھر رات کی چپ تھی ۔ چیتر کی چاندنی پھیکی پڑتی تھی اور وہ دونوں بے سُدھ منہ کھولے ٹھنڈے اور تھکن سے ٹوٹتے سوتے تھے اور پاروشنی بازوؤں میں منہ رکھے اوندھی ہوتی تھی ۔۔۔ تب پہلی بار جھجھر میں پانی کم ہوا تھا اور تب اسے کچھ شک ہوا تھا ۔ اور اب گھاگھرا سوکھ رہا تھا اور وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا ہاتھ پر ہاتھ دھرے ۔۔۔ نہ وہ اسے چھوڑ سکتا تھا اور نہ اس کے پاس رہ سکتا تھا ۔۔۔ آج کنک کا آخری سواد چکھا تھا اور اب بس ۔ بستی کے کنویں اب مٹیالا پانی نکالتے تھے ، دو چار مہینوں میں مٹی بڑھے گی اور پانی کم ہو گا اور پھر صرف کیچڑ ہو گا تو پھر ۔۔۔ تو پھر ؟

”میں یہاں کیا کر رہا ہوں ؟“ اس نے پھر اپنے آپ سے پوچھا ”یہ بستی ہے جو بندے سے بڑھ کر ہے یا بندہ ہے جس کے لئے وہ بستی بنی ہے بلکہ وہ اسے بناتا ہے ۔۔۔ زمین کا ایک ٹکڑا بڑا ہے یا اس پر بسنے والا ایک بندہ ۔۔۔ اور جب زمین ختم ہو رہی ہو دریا سوکھ رہا ہو تو پھر ایک بندے کو

کیا کرنا چاہیے ؟ ۔۔۔ اور میں یہاں کیا کر رہا ہوں ؟ ۔۔۔“

رات گذرتی تھی پہلے یہ بھیگتی تھی پر اب یہ گرم ہوتی تھی اور سمرو کا سارا جُثہ پسینے میں تھا ۔۔۔ اس نے ریت کو ایڑیوں کے نیچے محسوس کیا ، ٹانگیں پھیلائیں اور بازو پر سر رکھ کر لیٹ گیا ۔۔ اس کے بدن کے نیچے ریت میں ابھی پانی کی گیلی گھلاوٹ باقی تھی ۔ اس نے پاسا پلٹ کر اپنی ناک کو ریت سے چھوا اور اس گھلاوٹ کو سونگھا اور اس کی نمی کو اپنے بدن میں اتارا ۔۔۔ اور پھر وہ اونگھنے لگا ۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ سوتے میں پھر چلے پر وہ سویا رہا وہیں جہاں تھا ، وہ کہیں نہ گیا اور اس نے کچھ نہ دیکھا ۔

سویر کی ہلکی ٹھنڈک ہوا میں بس آئی اور تیرتی ہوئی چلی گئی ، دریا پر ہلکی سفیدی لو دے رہی تھی اور اس کی آنکھ کھلی ۔۔۔ ایک گہرا سانس اس ہوا میں جس میں ہلکی ٹھنڈک بس آئی اور تیرتی چلی گئی اور وہ اٹھا اور پانی کی طرف چلنے لگا ۔۔۔ کنارے کے ساتھ پہنچ کر وہ جھکا پانی کو دیکھا اور پھر وہیں بیٹھ گیا ۔۔۔ یہ تو کوئی اور دریا تھا گھاگھرا نہ تھا ۔۔۔ اتنا سست کہ اس کا بہاؤ دکھائی نہ دے اور ایسے لگے جیسے تھما ہوا ہے اور اتنا گدلا جیسے جوہڑ ہو اور پھر اتنا تھوڑا ہو جیسے کسی نے چند گھڑے پانی کے ریت پر انڈیل دیئے ہوں ۔۔۔ اس نے اپنا چہرہ پانی کے قریب کیا اس کی سطح پر دو چار پھونکیں مار کر اسے صاف کیا اور پھر منہ دھونے لگا ۔۔ وہ اس پانی کو آنکھوں میں ڈالتے ہوئے جھجکا کہ یہ ذرا زیادہ گدلا دکھائی دیتا تھا ۔

سویر کی سفیدی کھلنے لگی تو پانی کی سطح بھی دور تک دکھائی دینے لگی ۔

سمرو وہیں بیٹھا رہا اور کبھی کبھار وہ کوئی کنکر اٹھا کر زور سے دریا کے بیچ پھینکنے کی کوشش کرتا ۔۔۔ یا کسی ٹھیکری کو پانی کے اوپر ایسے پھینکتا کہ وہ سطح کو چھوتی اچھلتی دور تک جاتی اور پھر ڈوب جاتی ۔۔ اور کبھی وہ سروٹوں کے چھلکے اور تنکے اٹھا کر ہتھیلی پر مسلتا اور پھر انہیں پانی پر رکھتا جاتا ۔۔۔

”کیا یہ آخری سواد تھا“؟ ۔۔۔ اس نے پھر اپنے آپ سے پوچھا ۔۔۔

بستی کے اوپر آسمان اپلوں کے دھوئیں سے خالی تھا ۔۔۔ جیسے وہاں کوئی نہ ہو ۔۔۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا ۔۔۔ پھر اس نے کچھ دیکھا اور وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھر بیٹھ گیا اور پانی کو غور سے دیکھا ۔۔۔ وہ تنکے اور چھلکے جو اس نے تھوڑی دیر پہلے پانی پر رکھے تھے ۔۔۔ ابھی تک وہیں تھے ۔۔۔ اسی جگہ ۔۔۔ بہہ کر آگے نہیں گئے تھے ۔۔۔ کیونکہ بہاؤ رک گیا تھا ۔۔۔ پانی بس وہیں تھا جہاں تھا ۔۔۔

"یہ آخری سواد ہے" ۔۔۔ سمرو نے پانی کی سطح پر ڈولتے مگر ایک ہی جگہ ٹھہرے ہوئے تنکوں کو رکی ہوئی سانس کے ساتھ دیکھا ۔۔۔ "ہاں اس رات جھجھر میں اتنا پانی نہیں تھا جتنا ہونا چاہیے تھا ۔۔۔"

وہ اپنے چھپر کی طرف جاتا تھا جب اس نے بستی میں سے ماتی اور اُس کے پُتروں کی گڈ نکلتے دیکھی ۔۔۔ اس کے پہیوں میں سے دگڑ دگڑ کی آوازیں نہیں آرہی تھیں بلکہ وہ ایک سست اور ٹھہری ہوئی چال سے ڈولتی جاتی تھی ۔۔۔ ماتی بیلوں کے بیچ بیٹھی انہیں ہانکتی تھی اور اس کے پیچھے اس کے تینوں پتر وانگو چندرو اور جھوریا بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ گاگری کی بہن کو اسی تھی جس کا بچہ بھوک سے مرا ۔۔۔ گڈ کے ساتھ ان کی پوٹلیاں لٹکتی تھیں اور پیچھے پیچھے دو لاغر بیل جیسے گھسٹتے آتے تھے ۔۔۔ ان سب کے سیاہ مہاندروں میں زردی ٹھنڈی ہو رہی تھی اور ان کے پیٹ اتنے پچکے ہوئے تھے اور ٹانگوں پر ماس اتنا تھوڑا تھا کہ وہ سوکھی لکڑیاں لگتی تھیں اور وہ جیسے ایک نیند میں تھے ، اُونگھتے ہوئے ۔ اور ان کے جنور بھی ان جیسے تھے ۔۔۔ گڈ کو مشکل سے کھینچنے والے بھوک سے گرتے اور بڑی بڑی ہڈیوں والے ۔۔۔

پکلی نے آوا چڑھایا تو اس کی بُو بستی تک گئی اور وہ سب جو دیواروں کے ساتھ ٹیک لگائے پڑے تھے حیران ہوئے کہ یہ اب کیا بنائے گی اور کس کے لئے پکائے گی ۔۔۔ برتن بھانڈا تو کنک باجرے کے لئے ہوتا ہے ۔۔۔ گھڑا پانی کے لئے آتا ہے اور گھگھو گھوڑے بچوں کے لئے تو ان سب کی اب کسے مانگ ہے ۔۔۔

ڈور گا پچھلے کئی دنوں سے اپنی پکی چاردیواری میں پڑا تھا ۔ اس نے ہار تو نہیں مانی تھی کیونکہ وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا پر آس پاس رکھوں میں ، بستی میں کہیں بھی کھانے کو کچھ نہ تھا ، سبز گھاس کا ایک تنکا نہ تھا ۔۔۔ نرا مچھلی کا ماس تھا ۔۔۔ اور دریا کا پانی کم ہونے سے پہلے تو مچھلی بہت تھی اور پکڑنے میں آسان تھی پر اب وہ بھی تھوڑی رہ گئی تھی ۔۔۔ اور مچھلی کا ماس نرا کوئی کب تک کھائے ۔ اب تو اسے دیکھ کر ہی ڈور گا کو ابکائیاں آنے لگتی تھیں اور وہ اسے آنکھیں بند کر کے منہ میں رکھ کر نگلنے کی کوشش کرتا تو وہ باہر کو آتا ۔۔۔ اس کا جثہ تو بس کنک کے سواد کو ترستا تھا ۔۔۔ صرف ایک بُرکی روٹی کی ۔۔۔

وہ ہمت نہیں ہارا تھا ، بس وہ اسے دیکھتا تھا جو اسے موہنجو سے لایا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے کب جاتا ہے اور کدھر کو نکلتا ہے ۔ اس سویر جب وہ سندھو میں تیرتی کشتی میں تھا اور ورچن کو دیکھتا تھا اور پھر اس کے پیچھے پیچھے آتا تھا تو اب بھی وہ اسے دیکھتا تھا اور اس نے اسی کے پیچھے پیچھے جانا تھا ۔ اسے خود تو پتہ نہیں تھا کہ اس نے کدھر جانا ہے ۔۔۔ یہاں سے کہاں جانا ہے ۔۔۔ پر ایک ڈر اس کے کلیجے کو کھاتا تھا ، وہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چار دیواری کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا ۔۔۔ اور پھر اسے یہاں ایک اور کام بھی کرنا تھا ۔۔۔ اس نے میل کو جانا تھا ۔۔۔ وہ اسے سنتا تھا ، کان لگا کر سنتا تھا کہ وہ وہاں ہے اور ڈکراتا ہے ۔۔۔ پکلی نے اور ورچن نے بھی کہا کہ وہاں کچھ نہیں ہے اور تمہیں کوئی نہیں بلاتا پر وہ جانتا تھا کہ وہ وہاں ہے اور اسے بلاتا ہے اور اس نے آخر کو میل کو جانا ہے ۔

اس نے پہلے رکھوں میں جا کر میل کرنا تھا پھر کہیں جانا تھا ۔

آوے کی بُو گھاس پھونس اور سروٹ کے جلنے سے اٹھتی ہے اور ڈورگا نے تھنے سکیڑے کہ پکلی اب کیا پکاتی ہے ۔ وہ اٹھا اور ذرا ہمت کر کے اٹھا کہ بھوک اسے بھی دھیما کرتی تھی اور باہر آیا ۔ باہر دھوپ تھی اور وہ اس میں کھڑا ہوا تو یوں لگا جیسے وہ اُپلا ہو اور ابھی پھونک سے دہکنے لگے گا ، گرمی اتنی تھی کہ جلاتی تھی ۔

پکلی آوے کے پاس کھڑی تھی ۔

"یہ میرا برتن پکانے کو آوا چڑھایا ہے ؟" ڈورگا بولا

"نہیں ۔۔۔" پکلی کی بے دانت مسکراہٹ عجیب تھی "میں گھڑے پکاتی ہوں گھاگھرا کے لئے ۔۔۔"

"گھاگھرا کے لئے ؟" وہ اچنبھے میں آیا ۔

"ہاں ۔۔۔" پکلی پھر بولی "پانی تو گھڑوں میں ہوتا ہے ۔ ان گھڑوں میں جو پکلی پکاتی ہے اور ان پر کالے رنگ سے پتے بوٹے الیکتی ہے تو ان میں پانی ہوتا ہے ۔۔۔ اگر گھڑے نہیں ہوں گے تو پانی تو کم ہو گا ۔۔۔ وہ آئے تو جائے کہاں ۔۔۔" وہ اپنے ڈھلکے ہوئے کولہوں پر ہاتھ رکھے آوے میں سے نکلنے والے دھوئیں کو دیکھتی تھی اور اس کے دونوں بچے جو اب اتنے بچے نہیں تھے کچھ دور کھڑے ڈرتے تھے اور اس کا گھر والا بہت دنوں سے وہاں نہیں تھا ۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ کہیں چلا گیا تھا کہ وہ بھوک سے بے حال ہوا تھا اور کہہ گیا تھا کہ میں ادھر جا کر دیکھوں گا کہ کہیں پانی ہے کنک ہے تو پھر آکر تمہیں بھی لے جاؤں گا ۔۔۔ پر وہ بہت دنوں سے گیا ہوا

تھا ۔۔۔ اور اس کے جانے سے پکلی کی ہمت گھٹ گئی تھی اور وہ بس بیٹھی رہتی تھی اور اس کے بچے اس کے چہرے پر بیٹھنے والی مکھیاں اڑاتے رہتے تھے ۔ ایک روز وہ سویرے چھپر سے باہر نکل کر بیٹھی تو پھر وہیں بیٹھی رہی ۔ بچے رکھوں کی طرف گئے تھے کہ کچھ کھانے کو ملے اور وہ وہیں سارا دن دھوپ میں بیٹھی رہی اور بس اس دن کے بعد اسے کچھ ہوا تھا اور اب وہ گھڑے پکا رہی تھی ۔

"گھڑے ، گھاگھرا کے لئے ؟" ڈورگا نے پھر کہا پر جیسے خود سے کہتا ہو ۔

پکلی اسے دیکھ کر ہنسی ۔ اس کے مسوڑھے کالے ہو چکے تھے ۔۔۔ "ہاں تم تو اپنی پکی اینٹوں میں بند رہتے ہو اور وہ کنک بھالنے گیا ہے اور لوٹا نہیں ۔۔۔ اور مجھے پتا ہے کہ اگر گھاگھرا کے کنارے ایک کے اوپر ایک گھڑا رکھا جائے ۔۔۔ اور ایسے ساتھ ساتھ کہ دور سے وہ ایسے لگیں جیسے بہت ساری عورتیں جڑ کے بیٹھی ہیں گھاگھرا کے کنارے ۔۔۔ تو پانی آئیں گے ۔۔۔ جب وہ دیکھیں گے کہ گھڑے خالی ہیں اور ان کا انتظار کرتے ہیں تو وہ آئیں گے انہیں بھرنے کے لئے ۔۔۔ کل آوا تیار ہو گا پک کر ۔۔۔ تو میرا ساتھ دے گا ۔ ان کو ادھر لے جانے میں ؟" ۔۔۔ پکلی کا مہاندرہ بدلا ایسے کہ وہ ایک چھوٹی سی بچی لگنے لگی جو گھگھو گھوڑے بنا کر خوش ہوتی ہے اور ڈورگا کو کہنا پڑا کہ ہاں میں تیرے ساتھ گھڑے اٹھا کر ادھر لے جاؤں گا پر تو اب چھپر کے اندر چل ۔۔۔ اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چھپر کے اندر چھوڑ آیا اور اس کے دونوں بچے بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور اصل میں وہ دونوں اب قد کاٹھ میں اتنے ہی تھے جتنی کہ پکلی تھی ۔۔۔ ایک تو بالکل پکلی ایسا تھا ۔ جوں جوں آوے کے اندر آگ تیز ہوتی جا رہی تھی توں توں اس کی بُو کم ہوتی جاتی تھی ۔۔۔ تیسرے روز جب آوا پک کر ٹھنڈا ہوا تو اس نے پکلی کے ساتھ وہ گھڑے گھاگھرا کے کنارے تک رکھ آنے کے لئے اٹھائے ۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ دھوپ میں پڑی رہنے کی وجہ سے اور پیٹ سکڑنے کی بنا پر بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح پکلی بھی اب وہ نہ تھی جو پہلے تھی اور اسی لئے اس نے وہ گھڑے چپ چاپ اٹھائے اور گھاگھرا کے کنارے ایک کے اوپر ایک کر کے رکھ دیئے پال بنا کر اور وہ دور تک چلے گئے اور دور سے وہ ایسے ہی دکھائی پڑتے جیسے بہت سی عورتیں جڑی بیٹھی ہیں ۔۔۔ جب آخری گھڑا رکھ کر وہ واپس آیا تو پکلی پھر دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی پر اُس کے مہاندرے پر ایک ایسا ٹھہراؤ تھا جو پہلے اَن دیکھا تھا ۔۔۔ وہ پورے سکھ میں تھی اور مسکرا رہی تھی اور اس کے بچے اس کا ایک ایک ہاتھ تھامے اس کی ہتھیلیوں پر جھکے تھے ۔۔۔

ڈور گا کا سانس ٹکتا نہیں تھا ۔ گھڑے خالی تھے پر آوے سے گھاگھرا تک کم سے کم کوس کا راستہ تھا اور وہ منہ اندھیرے سے انہیں ڈھو رہا تھا ۔۔۔ اس کا زور گھٹ گیا تھا ۔۔۔ وہ چلتا تو ٹانگیں بوجھ اچھی طرح نہ سہارتیں اور کم زوری کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے چرمرے سے ناچتے ۔۔۔

وہ اس کے قریب ہوا اور کہنے لگا "تو اندر چل ۔ یہاں دھوپ ہے"

پکلی کے مسوڑھے دھوپ میں آئے اور وہ خوش مسکراتی تھی "نہیں میں یہیں رہوں گی ۔۔۔ تو مجھے یہیں پڑا رہنے دے ۔۔۔"

"نہیں اٹھ ۔۔۔" ڈور گا آگے ہوا تو اس کے مہاندرے کا ٹھہراؤ ڈوبنے لگا "نہیں نہیں ۔۔۔" اس نے اپنے سوکھا ہوا ہاتھ آگے کر دیا "نہیں مجھے یہیں رہنے دے ۔۔۔ دھوپ میں ۔۔۔ یہاں سے گھاگھرا دکھائی پڑتا ہے ۔۔۔"

پکلی کے آوے سے گھاگھرا کا وہ حصہ دکھائی دیتا تھا جو ٹاپوؤں کے گرد بل کھا کر جیسے ریت میں گم ہوتا تھا ۔ ڈور گا کے اندر اس کا ڈر آیا کہ پکلی آج ایسی کیوں ہے اور اسے کچھ شک بھی ہوا کہ وہ ایسی کیوں ہے پر وہ چاہتا نہیں تھا کہ ایسا ہو کیونکہ یہ وہ عورت تھی جس نے اسے اس کا پہلا گھر دیا تھا ، جس کے پاس وہ واپس آتا تھا ۔ ڈور گا نے بھی دانت نکال دیئے جو دھوپ میں لشکے "چل اب تو خوش ہو ۔۔۔ سارے گھڑے جو تو نے پکائے تھے گھاگھرا کے کنارے ایک کے اوپر ایک کر کے رکھے ہیں ۔۔۔ اب تو اس میں پانی آئے گا ، کیوں آئے گا ناں ۔۔۔ تو کتنا پانی آئے گا"۔

"گھاگھرا میں اب کبھی پانی نہیں آئے گا ۔۔۔" پکلی نے ڈور گا کو دیکھا ۔ ایک ایسا بندہ جو موہنجو سے صرف اس لئے آیا کہ اس کی تھکی ہوئی ہڈیوں کو آرام دے ۔ اس کا ہاتھ بٹائے ۔

ڈور گا کی مسکراہٹ بند ہوئی اور وہ اس کے اور قریب ہوا "نہیں ۔۔۔ آئے گا ۔۔۔ تو نے اتنی محنت سے جو گھڑے بنائے ہیں اور ان پر پھول بوٹے الیکے ہیں اور آوا چڑھا کر انہیں پکایا ہے اور اب وہ گھاگھرا کے کنارے خالی پڑے ہیں تو وہ بھریں گے ۔۔۔"

"نہیں بھریں گے ۔۔۔" پکلی بولی "میں نے گھڑے اس لئے تو نہیں بنائے کہ ان میں پانی بھرے گا ۔۔۔ کہاں سے بھرے گا ۔۔۔ وہ تو گم ہوا اور ساتھ میں اس بستی کو بھی لے گیا ۔۔۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بڑے سبھاؤ سے بات کرتی تھی ۔۔۔ "تو اپنی چار دیواری میں بند تھا اور تو نے دیکھا نہیں کہ میں نے اس بار جو دن رات ایک کر کے ان گھڑوں پر بیل بوٹے الیکے

ہیں ، مور کے پر اور مچھلی کے چانے بنائے ہیں اور پیپل کے پتے اور پھول سجائے ہیں ۔۔۔ تو نے دیکھے نہیں ؟"

"نہیں ۔۔۔" ڈور گا دکھی ہو کر کہنے لگا "میں نے نہیں دیکھے ۔۔۔"

"پاروشنی پوچھتی تھی کہ پکلی یہ بیل بوٹے تم کیسے الیک لیتی ہو ۔ وہ رکھوں میں سے میرے لئے پتلی شاخیں لایا کرتی تھی اور پوچھتی تھی اور میں کہتی تھی کہ یہ بیل بوٹے میرے سر میں تو نہیں ، یہ تو ان ٹہنیوں اور شاخوں میں ہوتے ہیں جنہیں رنگ میں ڈبو کر جھجھروں ، ڈولوں ، صحنکوں اور گھڑوں پر پھیرتی ہوں ۔ اور یہ آپ ہی آپ بنتے چلے جاتے ہیں اور یہ تو اسی نے بتایا تھا کہ میں گھڑوں پر مچھلی کے چانے بناتی ہوں نہیں تو مجھے تو پتہ نہیں تھا کہ میں یہ کیا بناتی ہوں ۔ یہ سب تو بنتا چلا آرہا تھا اور میں بھی اس کو بناتی چلی جاتی تھی اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جھجھر میں پانی ہوتا ہے اس لئے اس پر پانی میں رہنے والے جنور کا بوٹا بناتے ہیں ۔۔۔ تو ڈور گا میں نے یہ بوٹے بنائے دن رات ایک کر کے ۔۔۔ ایک کر کے" وہ رکی اور چپ ہو گئی اور ڈور گا بھی وہیں بیٹھا رہا جہاں تھا سانس روکے وہ سنتا رہا اور پھر اس کا سانس ٹھیک ہوا تو وہ بولنے لگی "ایسے بوٹے بنائے جو میں ساری حیاتی اس بستی کے لئے بناتی رہی اور پھر ایسے بھی بنائے جو ابھی تک نہیں بنا سکی تھی اور وہ صرف ٹہنیوں میں چھپے تھے اور میں نے انہیں نکالا اور کہا کہ اس کے بعد تم باہر نہیں آؤ گے ، میرا ہاتھ نہیں ہو گا تو کیسے آؤ گے اور وہ آئے ۔۔۔ ایسے ایسے نرالے بوٹے ڈور گا ۔۔۔ کہ میں دیکھتی تھی تو حیران ہوتی تھی کہ یہ کہاں تھے اور آج تک کیوں نہیں بنے ۔۔۔ شائد انہیں بھی پتہ چل گیا تھا کہ اب سب کچھ سوکھنا ہے ۔۔۔ ابھی باہر آنا ہے اس ٹہنی میں سے جس میں ہم چھپے ہیں اور وہ ہاتھ جو ہمیں الیکتا ہے بعد میں نہیں ہو گا ۔۔۔"

"دھوپ تپتی ہے ۔۔۔" ڈور گا کا جُسہ پسینے میں بھیگتا تھا اور اس کی آنکھوں میں پسینہ گرتا تھا "چھپر میں چلتے ہیں ۔۔۔ آؤ" اس نے ہاتھ آگے کیا ۔

"نہیں ۔۔۔" پکلی نے غصے سے کہا "اور سنو ۔۔۔ میں نے یہ سارے جتن کئے ۔ بیل بوٹے ایسے ایسے بنائے جو ۔۔۔ اور تم نے دیکھا نہیں کہ آج تم جتنے گھڑے لے کر دریا پر گئے ان سب پر الگ الگ بیل بوٹے تھے کوئی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا تھا"

"اچھا ۔۔۔" ڈور گا نے منہ کھول کر کہا "پر کیوں ؟"

"اب ان گھڑوں کی پال ادھر کنارے پر ہے ۔۔۔ اور ابھی کناروں کے اندر تھوڑا بہت پانی ہے اور پھر یہ بھی سوکھے گا ۔۔۔ اور پھر صرف کنارے رہ جائیں گے ۔۔۔ ریت بھی آئے

گی ۔۔۔ ہوا بھی ۔۔۔ اور میرے گھڑے گریں گے ٹوٹ کر ۔۔۔ اور اسی ریت میں دبتے جائیں گے ۔۔۔ پھر اور ریت آئے گی ۔۔۔ کبھی شائد مینہ بھی آئے اور کبھی ۔۔۔ پتہ نہیں کب ۔۔۔ آج سے کئی رُتوں بعد ۔۔۔ میرے گھڑوں کی ٹھیکریاں گھاگھرا کے خشک راستے میں سے نکلیں گی اور لوگ دیکھیں گے ۔۔۔ اور وہ ان کے بیل بوٹے دیکھیں گے اور کہیں گے کہ کیا سوہنے اور عجب بیل بوٹے ہیں جو کسی نے بنائے ۔۔۔ اور وہ کس کا ہاتھ تھا جس نے انہیں بنایا ۔۔۔ اور کب بنایا ۔۔۔ جب کہتے ہیں کہ ادھر بستیاں تھیں اور دریا تھا اور رکھوں میں مور بولتا تھا ۔۔۔ تو ڈورگا وہ میرے ہاتھ کو یاد کریں گے ۔۔۔" پکلی نے اپنے بچے سے ہاتھ چھڑا کر اسے ہوا میں اونچا کیا ۔۔۔ نچڑا ہوا سیاہ اور سوکھا ماس جس میں رگیں بھی خشک تھیں ۔۔۔

ڈورگا نے اپنی آنکھیں جھپکیں اور ان میں تھوڑا پانی تھا ۔۔۔ "چل اندر چل"۔

پکلی نے صرف سر ہلایا اور اسے وہاں سے چلے جانے کو کہا ۔ وہ اٹھا اور بوجھل پاؤں اٹھاتا اپنی چار دیواری میں آ لیٹا ۔۔۔ شام کو وہ باہر آیا تو پکلی وہیں تھی اسی حالت میں ٹیک لگائے ۔۔۔ اور اس کا سانس چلتا تھا ۔۔۔ اور اس سے اگلی سویر اس نے دیکھا کہ سانس نہیں ہے تو اس نے اسے اس برتن میں ڈالا جو وہ پہلے سے بنا چکی تھی اور اسے اٹھا کر ادھر لے گیا جدھر ایسوں کو لے جاتے تھے جن کے سانس ختم ہوتے تھے ۔۔۔

رکے ہوئے پانی کے کیچڑ میں لوگ جھکے ہوئے تھے ۔ انہیں لگتا کہ گدلے پانی میں کوئی سایہ سا تیرا ہے تو وہ اس پر تیزی سے جھپٹتے ۔۔۔ سارا دن وہ یہی کرتے رہتے اور کبھی کبھار ان کے ہاتھ کوئی چھوٹی سی مچھلی آجاتی ۔۔۔

پاروشنی ان سے دور جب ان کو دیکھتی تو پل دو پل کے لئے اس کا منہ کھل جاتا کہ یہ لوگ دریا کے درمیان میں کیسے کھڑے ہیں پانی میں ڈوبتے کیوں نہیں اور پھر اس کے اندر ڈر زور زور سے دھڑکتا کہ یہ تو سچ مچ دریا کے بیچ کھڑے ہیں اور پانی ان کے گھٹنوں تک آتا ہے ۔۔۔ اور ایک دن یہ اور نیچے ہو گا ۔۔۔ اور ایک دن بے انت کچھوا اس میں تیزی سے ادھر ادھر چلتے کہ اپنے آپ کو کہیں چھپالیں پر پانی کی کمی کی بنا پر وہ اور زیادہ دکھائی دینے لگتے ۔۔۔ کسی نے ایک بڑا مچھ بھی دیکھا تھا جو اپنی پُوشل پٹختا تھا اور پانی میں چلتا اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا ۔

ان کے کھانے کو کچھ نہ تھا اور وہ گدلے پانی سے پیٹ بھرتے تھے ۔

ورچن ویہڑے کے کونے میں ٹیک لگائے بیٹھا رہتا اور اسے دیکھتا کہ وہ کیا کہتی ہے پر وہ چپ تھی اور وہ ایسے ختم نہیں ہونا چاہتا تھا یوں کچھ کئے بغیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے ۔۔۔ پر وہ چپ تھی ۔ وہ بولے تو کچھ ہو ۔۔۔ اور وہ اس سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ اب کیا کرنا ہے ۔۔۔ پاروشنی کے جُثے میں بھی کالی زردی پھیلتی تھی اور اس کی آواز آگے پیچھے ہوتی تھی اور کم آتی تھی پر وہ ہر سویر گھاگھرا کے کنارے ضرور جاتی ۔۔۔ اسی نے ایک سویر ورچن کو بتایا تھا کہ ادھر کنارے کے ساتھ گھڑے ایک دوسرے پر رکھے ہیں اور ان پر ایسے بیل بوٹے ہیں جو اس سے پہلے نہ اس نے دیکھے اور نہ پکلی نے بنائے اور وہ اتنے سوہنے تھے کہ اسے اپنی بھوک بھولی اور گھاگھرا کی خشکی بھولی اور وہ وہیں کھڑی انہیں دوپہر تک دیکھتی رہی ۔

سمرو اپنے چھپر میں رہتا پر ہر شام آتا اور تھوڑی دیر ان دونوں سے پرے ہٹ کر بیٹھتا اور چلا جاتا ۔۔۔ ان سے اب بات نہیں ہوتی تھی ، بات کے لئے زور چاہئیے اور وہ کم ہو رہا تھا ہر

دن ۔۔۔

دھروا اپنے بیلوں کی راکھی بیٹھتا تھا پر ایسے کہ اسے اب یہ معلوم نہیں تھا کہ اندر باڑے میں وہ سانس لے رہے ہیں یا ان کی آنکھیں پتھرا چکی ہیں ۔۔۔ اگر سانس لیتے ہیں تو کتنے ہیں ۔۔۔ وہ انہیں کھانے کے لئے کچھ نہیں دے رہا تھا ۔ جوان کے لئے چارہ لاتے تھے ان کے لئے چلنا پھرنا بوجھ ہو چکا تھا اور دھروا اپنے تھڑے پر بیٹھا رہتا اور اس کی ٹھوڑی سے لٹکتے بال کابلی سے ہوا میں سرسراتے رہتے ۔۔۔ گجرو اور چمرو اور اپلے تھاپنے والی کومی اس کے سامنے سے گزرے اور دور ہو گئے ۔۔۔ ماتی کے بعد انہوں نے بستی کو چھوڑا ۔۔۔ اور ان کے بعد ہر روز کوئی نہ کوئی اٹھتا اور چلا جاتا ۔۔۔ کچھ ریت میں دو تین دن سفر کے بعد لوٹ آتے کہ وہاں بھی کچھ نہیں ۔۔۔

ایک شام مندرا جو ان سب میں سے زیادہ بوڑھا تھا ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور ورچن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ پوچھنا چاہا تو وہ لڑھک گیا ۔ جانے کب سے وہ جا چکا تھا ۔ ورچن اسے اٹھا کر رکھوں میں لے گیا کہ اسے وہاں رکھ آئے جہاں اس کے مائی باپ کے پنجر تھے جن کے ساتھ دکھی ہونے پر وہ لپٹتا تھا اور روتا تھا اور اس نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ رکھ اب وہ نہیں ہیں ۔۔۔ وہ بھی ان کی طرح بھوکے اور پیاسے ہیں اور سکڑ چکے ہیں ۔۔۔ پتے یا بوٹیاں کہیں نہ تھے ، سوکھے ہوئے رکھ تھے ٹیڑھے میڑھے اور ان کے گرد ریت جمع ہو رہی تھی اور اس کے مائی باپ کے پنجر پتہ نہیں کونسے رکھ کے تنے میں تھے ۔۔۔ اس نے مندرا کو ایک گرے ہوئے کھوکھلے تنے کے اندر رکھا اور بستی کو لوٹ آیا ۔

"می آؤں ۔۔۔ می آؤں" شائد مور بولا ۔۔۔ وہ ابھی تھا ۔

پوہ ماگھ کا پالا کم ہونے لگا ۔۔۔ اور پالا بھی کیسا تھا دھوپ میں ایسی خشک تیزی تھی کہ وہ ہر جنسے اور بوٹے کو چوستی تھی اور سکھا کر پھوک بنا دیتی تھی ۔۔۔ بستی اور گھاگھرا پر دھول ابھی تک ٹھہری ہوئی تھی اور کم نہ ہوئی تھی ۔ ہوا اپنے ساتھ ریت لاتی جو گلی میں بچھ کر چوکھٹوں تک اونچی ہونے لگی ۔۔۔ پھر چیتر میں رُت بدلی تو ہریالی اور کھلے موسموں کی بجائے تپش نے ہرشے کو چاٹنا شروع کر دیا ۔۔۔ کنوؤں میں سے پانی اتنے مٹی بھرے نکلتے کہ انہیں پینے کی بجائے نگلنا پڑتا ۔ گھاگھرا کا سارا پاٹ چھوٹے چھوٹے جوہڑوں میں بدل چکا تھا اور وہ بھی سوکھتے جاتے تھے ۔ ان میں بہت کم کوئی مچھلی پھڑکتی ۔۔۔ چھپروں کی کچی دیواریں ڈھے رہی تھیں اور ان

کے ساتھ ٹیک لگا کر اونگھنے والے بھی ان کے ساتھ ڈھتے رہے تھے ۔۔۔ بستی میں بہت کم لوگ رہ گئے تھے ، کچھ تو وہیں ٹیک لگائے پار پہنچ گئے اور کچھ نکلے اور ریت میں کھو گئے ۔ ان میں کئی ایسے تھے جو کہتے تھے کہ ہم کہیں نہیں جائیں گے بس اس بستی کے آس پاس ریت کی دنیا میں سفر کریں گے ، جہاں پانی ملے گا پڑاؤ کریں گے اور جو ملے گا کھا لیں گے پر اپنا آسمان نہیں چھوڑیں گے چاہے آنے والے دنوں میں ہمارے بیج سے پھوٹنے والوں کو یہ یاد رہے نہ رہے کہ ہم بھی کبھی بستے تھے ۔

اب وہاں صرف پاروشنی ، ورچن ، سمرو اور ڈورگا بچے تھے ۔۔۔ اور دھروا جو ان بیلوں کی راکھی کر رہا تھا جو باڑے کے اندر تھے ، مُردہ یا زندہ اس بارے میں وہ نہیں جانتا تھا پر وہ راکھی کرتا تھا ۔ ڈورگا کبھی کبھار بستی کی طرف آتا ، وہ اب پہلے سے بھی زیادہ جھک گیا تھا ، وہ پاروشنی کے ویہڑے میں جھانکتا اور واپس چلا جاتا ۔۔۔

پاروشنی اب ایسے لگتی تھی کہ بس پنجر ہے اور اُس پر کس کر ماس چڑھا ہوا ہے ۔ اُس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اور آنکھیں باہر کو آتی تھیں ۔۔۔ اُس کے وہ کولہے سوکھ گئے تھے جن پر وہ بیٹھتی تھی تو وہ پھن کی طرح پھیلتے تھے اور چلتی تھی تو اپنے آپ اُس کے بیچ گرمی اور نمی آجاتی تھی ، اور اُس کی بھری ہوئی چھاتیاں خالی تھیں اور پچک گئی تھیں ۔۔۔ پاروشنی ایک پنجر تھی جو بس ٹیک لگائے سانس لیتا تھا اور اُس کے قریب ورچن تھا جو اُس پنجر کو دیکھتا تھا ، سوچتا تھا کہ مجھے یہاں سے جانا چاہیئے پھر اُس کی طرف دیکھتا تھا کہ اس کی اُبلتی آنکھیں کیا کہتی ہیں اور وہ کچھ نہیں کہتی تھیں اس لئے وہ سوچتا ایک دن اور دیکھ لوں ۔۔۔ ایک دن اور ۔۔۔ اور سمرو بھی آتا تھا ، گرتا پڑتا ، وہ پہلے ہی کچھ زیادہ زور والا نہیں تھا اور اب تو کئی دنوں سے پتہ نہیں کتنے دنوں سے صرف مٹی بھرا پانی پیٹ میں جاتا تھا ۔۔۔ تو وہ آتا تھا اور پاروشنی کے ویہڑے میں جھانک کر چلا جاتا تھا کیونکہ وہ بھی اُس کی آنکھیں دیکھنے آتا تھا کہ کیا کہتی ہیں اور اُسے بھی وہی جواب ملتا تھا ، جو ورچن دیکھتا تھا ، وہ کچھ نہیں کہتی تھیں ۔

پاروشنی کے ویہڑے میں اب ریت بہت تھی ۔۔۔ وہ جھاڑو دینے کی سکت میں نہیں تھی ۔۔۔ پانی بھی وہ دونوں مل کر نکالتے اور اُس کیچڑ کو گلے میں اُتار کر پھر دیوار کے ساتھ لگ جاتے ۔۔۔

ڈورگا کئی دن نہ آیا تو پاروشنی کے اندر ڈر اُترا کہ اُسے کیا ہوا ۔۔۔

وہ اپنی چار دیواری میں پڑا تھا اور سویر ہونے کو تھی کہ اُس کے کانوں میں ایک دھمک آئی

جیسے دُور ڈھول پر تھاپ پڑتی ہو اور ڈکرانے کی آواز آئی اور اُس کے پیچھے پیچھے ایک گرم ہوا آئی یہ کہنے آئی کہ تم کہتے تھے کہ میں میل کو آؤں گا ۔۔۔

ڈورگا اُس مٹی پر چلتا تھا جس پر اب ریت تھی اور جو کبھی ڈوبو مٹی کہلاتی تھی اور یہاں اتنی ریت تھی کہ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ کبھی یہاں ڈوبو مٹی ہوا کرتی تھی ۔۔۔ ڈورگا جاتا تو صرف ایک کو ملنے کو تھا پر وہ اکیلا نہ جاتا تھا ۔۔۔ نہ جاتا تھا ۔ یہاں وہ سب تھے جو آج تک بھٹے کی چاردیواری کے اندر پیدا ہوئے اور مر گئے ۔ وہ پیدا ہوئے تو بندے کی اولاد تھے پر دھیرے دھیرے جنوروں کے جائے بنتے گئے ۔ اینٹیں بناتے اور ڈھوتے ڈھوتے اُن کی کمر جُھک گئی ، کھال سکڑ گئی اور اُن کے جُثّے سے جنوروں ایسے بال لٹکنے لگے ۔۔۔ اور جب بھی کبھی اُن ہزاروں لاکھوں جنوروں میں سے کوئی ایک اپنے بھوکے پیٹ اور باہر لٹکتی زبان کے ساتھ اپنے جھکے ہوئے جُثّے پر مالک کی مار کھاتا تو کہتا تھا کہ میں آخر کو تم سے ملنے آؤں گا ۔۔۔

ڈوبو مٹی جو کبھی تھی اُس کے خاتمے پر اُس نے رکھوں کے اندر قدم رکھا ، وہاں تاریکی نہ تھی ، لشکتی دھوپ تھی اور رکھوں کے سُوکھے پنجر اور ریت کی زبانیں تھیں اور الاؤ کی گرمی تھی ۔۔۔

ڈورگا بے دھڑک چلتا تھا اور دیکھتا تھا کیونکہ دھوپ تھی اور وہ دیکھ سکتا تھا ۔۔۔ پر اُس کی ٹانگیں بھڑتی تھیں ، بھوک سے زور کم پڑتا تھا ۔

"می آؤں ۔ می آؤں" مور ایسے بولا جیسے آخری بار بولتا ہو ۔

ڈورگا نے دیکھا کہ وہ اپنا جھاڑو پھیلائے کھڑا تو ہے پر اُس کی پتلی ٹانگیں اُس کو سہارتی نہیں اور وہ گرتا ہے اور پھر سنبھلتا ہے اور اُس کے رنگ دھوپ میں سوکھ چکے ہیں اور آنکھیں خشک ہو چکی ہیں ۔ ڈورگا نے اپنی چپٹی ناک کے نتھنوں کو پھلا کر خشک ٹہنیوں کی باس کو اپنے اندر کھینچا کہ وہ کہاں ہے ۔۔۔ "میں تجھے سونگھتا ہوں" وہ مسکرایا اور باس کو اپنے اندر تک پھیلایا اور اندھا دھند بھاگنے لگا ۔۔۔ چیتر کی تپتی دھوپ تھی اور پتہ چلتا تھا کہ آگے کیا ہے ۔

پتہ نہیں وہ ایک خشک ٹہنی تھی یا مامن ماسا کا سُوکھا ہوا جُثّہ جس نے اُس کے قدموں تلے کڑکڑاتی ٹہنیوں کو سُنا اور دیکھا کہ نیچے کوئی گرے ہوئے خشک تنوں سے ٹکراتا اُن کو پھلانگتا بھاگتا ہے ۔ اور وہ وہاں ایک سوکھے ہوئے ڈال کے ساتھ کھڑا اُڈیک میں تھا ۔ اُس کی کالی بھور آنکھیں اپنے زور میں بے سُدھ تھیں ۔۔۔ اُس کے نتھنوں کی گرم ہوا ڈورگا کے سیاہ جُثّے پر بھاپ کی طرح پھیلتی تھی ۔۔۔ اور وہ دونوں رُکھوں میں میل کرتے تھے ۔ ایک میں اُن سب

کا زور تھا جو جُھکے ہوئے تھے اور دوسرے میں اُن جھکے ہوؤں میں سے چوسا ہوا زور تھا ۔۔۔ تو زور ایک ہی تھا ۔

"مامن ماسا ۔۔۔ مامن" چیوا ایک سُوکھے ہوئے رُکھ کے نیچے دہائی دے رہا تھا "ریت آ گئی ہے تمہارے رُکھ تک ۔۔۔ آؤ اندر چلیں ۔ چند رُکھ ابھی ہیں آؤ اُن میں گم ہو جائیں ۔۔۔ اور وہ دونوں بھی یہاں ہیں ۔۔۔ آؤ"

اور مامن ماسا تھا یا کوئی سُوکھی لکڑی کی ٹہنی تھی جو مُسکراتی تھی کہ نہیں اب میں نہیں آؤں گا میں رُکھوں میں رُکھ ہوں اور الگ نہیں ہوں ۔

اُس کا بھاری سیاہ لشکتا جُثّہ ڈورگا کی ہڈیوں کو کُچلتا تھا اور اُس کا سانس بند ہوتا تھا اور اُس کے نتھنوں میں سے رَت اُبلتی تھی اور وہ جان رہا تھا کہ اب میں گیا ۔ میں جو آیا تھا تو اب گیا ۔ اور میں ایک بار پھر اُدھڑوں گا اور مات کھاؤں گا ۔۔۔ اُن دونوں کا پسینہ ریت میں گرتا تھا اور اُسے کیچڑ میں بدلتا تھا اور وہ دونوں اِس کیچڑ میں کیچڑ ہوتے تھے اور ایک دھمک تھی جو پھیلتی تھی اور رُکھوں سے باہر جاتی تھی اور جہاں پاروشنی تھی وہاں تک جاتی تھی اور وہ سنتی تھی ۔۔۔ اور پھر وہ دونوں زور لگاتے تھے ۔۔

اور ایسے ایک پہر ہو گیا اور شام اندر آ گئی ۔۔۔ اور پھر اُس نے جانا کہ اُس میں جان نہیں ہے اور وہ گیا اور اُس میں سکت گم ہوئی ۔۔۔ اور ہر طرف چپ تھی ، سنسانی تھی پر مور بولتا تھا ایسے جیسے پہلے بولتا تھا جب رُکھوں میں ہریاول تھی اور روز مینہ اُترتا تھا اور جھیل کے پانی تھے جہاں پکھیرو اُترتے تھے اور جب پاروشنی اُس کے قریب سے گذری تھی تو وہ مستی میں بولتا تھا ۔

بھینسے کا سیاہ جُثّہ دھیرے دھیرے ٹھنڈا ہو رہا تھا ۔

ڈورگا نے اپنے آپ کو اُس سے الگ کیا اور پرے ہو کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔ اور سیدھا کھڑا ہو گیا ۔۔۔ جُھکا ہوا تھا پر اب نہیں تھا ۔

سیاہ جُثّہ ٹھنڈا ہو گیا اور اُس کی آنکھیں ڈورگا کو دیکھتی تھیں اور وہ اسے دیکھتا تھا جس نے اُسے ایک ہزار برس تک موہنجو میں بند رکھا تھا اُسے اور اُس جیسے بے انت بندوں کو ۔۔۔ جن کے پسینے کی مہک اب اُسے آتی تھی ۔

بھینسے کا سیاہ اور زور والا جسم ٹھنڈا ہو گیا ۔۔۔ اور وہ اُس کے سامنے پڑا تھا ۔

پھر پہلی چیونٹی آئی ۔۔۔

اور اُس کے بعد خُشک پتّے اور سُوکھی ٹہنیاں اُن سے سیاہ ہونے لگیں جیسے پتّے چلنے لگے ہوں ۔ جیسے ٹہنیوں میں جان پڑ گئی ہو ، پر وہ ساری چیونٹیاں تھیں اور ادھر آتی تھیں اور ڈور گا نے اُنہیں دیکھا تو ڈرا اور اُس کے ڈر کو سُونگھ کر ایک چیونٹی نے کہا ۔۔۔ ”ہم تجھے نہیں اِسے لینے آئی ہیں“ ۔۔۔ اور وہ اُس کے سیاہ جُثّے پر چڑھنے لگیں اور اس کے نیچے اور اوپر اور ہر طرف سیاہ ہونے لگیں یہاں تک کہ بھینسے کا مردہ جسم دھیرے دھیرے ویسے ہی چلنے لگا جیسے چیونٹیوں سے بھرا ہوا روٹی کا ایک ٹکڑا چلتا ہے اور وہ اُسے اٹھا کر لے جا رہی تھیں اور ڈور گا حیرت میں کھڑا تھا۔

”ہم اسے لے جائیں گی پر یہ پھر آ جائے گا ۔۔۔“ ایک چیونٹی نے کہا ۔

”پھر آ جائے گا ؟ ۔۔۔“ ڈور گا پھر ڈرا ۔

”ہاں ۔۔۔“ دوسری بولی ”اور تم پھر اسے مارو گے ۔۔۔ اور ایسا ہوتا رہے گا ۔۔۔“

”ہاں ہمیشہ ۔۔۔“ سب چیونٹیوں نے مل کر کہا ”۔۔۔ یہ پھر آئے گا ۔۔۔ اس کے بغیر کوئی سمے پورا نہیں ہوتا“

”اور میرے بغیر ؟“

”اور تمہارے بغیر بھی ۔۔۔“ سب چیونٹیاں بول رہی تھیں ”اور تم پھر اسے مارو گے ۔۔۔ اور ایسا ہوتا رہے گا ۔۔۔“ اور وہ اُسے لے گئیں ۔

اور تب ڈور گا نے اپنے آس پاس دیکھا اور دیکھا کہ وہاں اب ایک بھی رُکھ نہیں اور سایہ نہیں اور وہ ریت کے بے اَنت میدان میں اکیلا کھڑا ہے اور وہاں سے بستی کے چھپر اور گھاگھرا کے اونچے کنارے صاف دکھائی دیتے ہیں اور وہاں بھی ریت ہے ۔۔۔ ہاں اُس نے دیکھا کہ اس میدان میں دو ٹہنیاں ہیں ایک دوسرے سے چمٹی ہوئیں اور اُن میں جیسے جان ہے اور اُس نے دیکھا کہ ایک مور ہے جس کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہیں اور آنکھیں خشک ہو چکی ہیں پر وہ اپنا جھاڑو پھیلائے کھڑا ہے اور چونچ کھولتا ہے بولنے کو پر بول نہیں سکتا ۔۔۔

دُھروا لگتا نہیں تھا کہ سانس لیتا ہے پر ابھی اُس میں حیاتی کا اُپلا سلگتا تھا اور اُس پر جمی راکھ کی تہہ سے دکھائی پڑتا تھا کہ شائد اندر کچھ نہیں پر وہ سانس لیتا تھا ۔۔۔ وہ اپنے تھڑے پر پڑا تھا اور اُس کی ٹھوڑی سے لٹکا سفید بالوں کا گُچھا ہولے ہولے ہلتا تھا ۔ کبھی کبھار اُس کا پتلا بازو آہستہ سے اُٹھتا اور وہ اس گُچھے کو ٹھوڑی سے چپکانے کی کوشش کرتا ۔۔۔ اُس کے قریب ایک جھجھر تھی جو ورچن وہاں رکھ گیا تھا اور اُس میں مٹّی ملا پانی تھا جو وہ پیتا تھا پر اب جھجّھر کی تہہ میں نِری مٹّی تھی اور پانی ختم ہو چکا تھا اور وہ پچھلے تین چار روز سے یونہی تھڑے پر پڑا راکھی دے رہا تھا ۔ اُسے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ اندر باڑے میں کتنے بیل باقی ہیں باقی ہیں بھی کہ نہیں ۔۔۔ اُس نے ہمت کر کے آنکھیں کھولیں تو دُھوپ اُن میں پگھلنے لگی ۔۔۔ وہ اِس دُھوپ کو نہیں جانتا تھا ۔ یہ نِری آگ تھی اور اس میں نِری جلن تھی ۔۔۔ باڑے کی دیوار خالی تھی اور اُس کے ساتھ چارے کا کوئی گٹھا نہ تھا ۔۔۔ چارہ لانے والے اب وہاں نہیں تھے ۔۔۔ اور چارہ بھی نہیں تھا ۔۔۔ اور اُدھر رُکھوں میں بھی تو اب کچھ نہیں تھا نہ گھاس ، نہ ہریالی ، نہ پتّے ۔۔۔ اور اُس نے ادھر دیکھا ۔ اور غور سے دیکھا اور پھر سر جھٹکا ۔۔۔ جتنا جھٹک سکتا تھا کہ وہاں ادھر جہاں رُکھ ہونے چاہیئے تھے وہاں کچھ بھی نہ تھا ۔۔۔ اور ریت یہاں سے وہاں تک جہاں تک نظر جاتی تھی ، لشکتی تھی اور اس میں نِری جلن تھی ۔۔۔ اُس کے دل میں آیا کہ یہ وہی دن ہے یم کے کُتّے آئیں گے تبھی اُسے رُکھ دکھائی نہیں دیتے تھے ۔۔۔ وہ تو وہاں ہوں گے پر اُس کی آنکھوں کے سامنے کچھ اور آ گیا تھا ، پر لگتا یہی تھا کہ وہاں اب کچھ نہیں ۔۔۔

بستی سے نکلنے کے لئے راستہ ادھر سے جاتا تھا اور جو نکلتا وہ ادھر سے جاتا اور دُھروا کو کہتا کہ تو بھی چل ۔۔۔ دیکھ ہمارا ٹبّر آدھا رہ گیا ہے ، ہمارے مال ڈنگر آدھے رہ گئے ہیں تو ہم نے اِسے چھوڑا ہے ، ہم چھوڑنا نہیں چاہتے تھے پر اگر یہاں رہیں گے تو پھر ہم نہیں رہیں گے تو بھی

چل ۔۔۔ تو دُھروا کہتا کہ نہیں اور بڑی مشکل سے "نہیں" کہتا ۔ کیونکہ اُس میں تو دوسروں سے بھی کم سکت تھی ، میں ادھر راکھی پر بیٹھا ہوں اور ادھر سے جا نہیں سکتا ۔۔۔ راکھا چلا جائے تو بیل کیا کہیں گے ۔۔۔ نہیں میں نہیں جا سکتا ۔۔۔ اور اب کتنے دنوں سے ادھر کوئی نہیں آیا تھا شائد سب جا چکے تھے اور وہاں گھاگھرا کے ساتھ جہاں گھاگھرا بہتا تھا اُس کے ساتھ جو دو چار گلیاں تھیں اُن میں اب ریت تھی اور گھروں کے چھپر ڈھے چکے تھے یا آندھی سے اڑ چکے تھے اور وہاں کوئی نہ تھا اور وہ اکیلا رہ گیا تھا ۔۔۔ اِس خیال سے اُس کے کلیجے میں ہول اٹھا کہ اس بستی میں اور رُکھوں میں ، جو وہیں ہوں گے جہاں تھے پر اُسے نظر نہیں آ رہے تھے اور گھاگھرا کے آس پاس وہ اکیلا رہ گیا تھا ۔۔۔ اُس کے سُوکھتے جُثے میں ایک جھرجھری سی آئی اور وہ جانے کیسے کچھ زور لگا کر کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھ گیا ۔۔۔ باڑے کے اندر وہ تھے جن کی وہ راکھی کرتا تھا تو وہ اکیلا کیسے ہوا ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ وہ گھسٹتا ہوا تھڑے سے اُترا اور پھر دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔ وہ اندر ہیں باڑے میں تو اُن کے پاس چلتا ہوں ، یہاں اور کوئی نہیں تو کیوں بیٹھا رہوں ۔۔۔ وہ بڑبڑا رہا تھا ۔۔۔ دروازے کے اندر نیم تاریکی تھی اور اُس میں سے جو باس نکلتی تھی وہ پیٹ سے سب کچھ باہر نکالتی تھی پر دُھروا کے پیٹ میں کیا تھا جو باہر آتا ۔۔۔ اندر وہ تھے پر گلتے سڑتے اور بودار پانی چھوڑتے جُثے تھے جن میں سے اُن کی ہڈیاں باہر نکلتی تھیں اور اُن کے گرد ماس ڈھلکتا تھا اور اُن کی آنکھیں بہہ چکی تھیں ۔

دُھروا نے اُنہیں پاس جا کر تھپکا ۔۔۔ اور اُس کے تھپکنے سے ماس ہڈیوں سے گر کر زمین پر بہنے لگا ۔

پر اُن میں سے ایک کی آنکھیں تھیں اور دیکھتی تھیں ۔۔۔ وہ اٹھ نہیں سکتا تھا اور گرا ہوا تھا پر دیکھ سکتا تھا ۔۔۔

اور اُن میں سے ایک اور تھا جو ابھی تھا اور وہ بھی دُھروا کو دیکھتا تھا ۔۔۔ دُھروا کو بھی اُن دونوں کی چار آنکھیں اندھیرے میں نظر آ گئیں اور وہ جان گیا کہ وہ اُسے ایسے کیوں دیکھتے ہیں ۔۔۔

اُس بودار اور گلتے سڑتے اندھیرے میں کچھ دیر بعد صرف چار آنکھیں تھیں جو اندھیرے میں نظر آتی تھیں اور اگر کوئی اُن میں دیکھتا تو جان جاتا کہ دُھروا اب کہاں ہے ۔

اور آخر کار ورچن نے اُس سویر دیکھا کہ یہ سویر بھی ویسی ہی ہے جیسی بے انت گذر چکی ہیں اور پاروشنی اور اُس کی ہڈیوں کا گودہ خشک کر چکی ہیں اور آج بھی وہی دن تھا جو پہلے تھا اور کوئی فرق نہیں ۔۔۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ یہ دن اُس برتن کے پاس ہے جو اُنہیں مٹی میں لے کر جاتا ہے ۔۔۔ اب وہاں گھاگھرا نہیں تھا ۔۔۔ اُس کے اونچے کنارے تھے جن کے اندر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے جوہڑ تھے اور پکلی کے گھڑے کچھ ٹوٹے ہوئے اور کچھ سالم ادھر ادھر اوندھے سیدھے پڑے تھے ۔۔۔ اور ان میں سے کچھ ریت میں دبتے تھے ۔۔۔ اور وہاں بستی نہیں تھی ، صرف وہ دونوں تھے اور شائد آوے کے پاس ڈور گا ہو ۔۔۔ شائد سمرو بھی ہو جو پہلے روز آتا تھا اور ویہڑے میں جھانک کر چلا جاتا تھا اور اب کئی روز سے دکھائی نہیں دیا تھا اور اُن کے علاوہ ۔۔۔ وہاں جلانے والی دھوپ اور خشکی اور ہول تھا جو کلیجے میں بل کھاتا تھا اُن واورولوں کی طرح جو اب گلیوں میں اور اونچے کناروں پر اٹھتے رہتے تھے ۔۔۔ اور پیاس تھی ۔ وہ جان گیا کہ اگر وہ آج نہ اُٹھا تو شائد کل اُس کے گھٹنے جواب دے جائیں اور سارا جُثہ وہیں گر کر ریت ہو جائے ۔۔۔ ویہڑے میں بھی پاروشنی کا پوچا ہوا فرش نہ تھا نری ریت تھی جو چوکھٹ سے اندر گرتی رہتی تھی ۔۔۔ اور اُنہوں نے اُس آدھی مٹھی کنک کی روٹی کے سوا آج تک کچھ نہیں کھایا تھا ۔۔۔ اور اُن کے اندر صرف مٹیالا پانی تھا جو ہر سویر اُنہیں کم زور کرتا ۔۔۔ تو وہ جان گیا کہ کل سویر وہ اٹھ نہیں سکے گا اس چوکھٹ کے پار نہیں جا سکے گا تو وہ اٹھا ۔۔۔ پاروشنی چولہے کے پاس پڑی تھی جیسے سوکھا ہوا پرندہ ہو ۔۔۔ جھیل کنارے گرنے والے پرندے چند دنوں بعد ایسے ہی ہو جاتے تھے جیسی کہ اب پاروشنی تھی ۔۔۔ ہڈیاں اور ڈھیلا ماس ، جبڑا باہر کو نکلا ہوا اور کھوپڑی جیسے تنگی ہونے کو ہو اور ہونٹ ایسے کھنچے ہوئے کہ دانت ڈھک نہ پائیں ۔۔۔

"پاروشنی ۔۔۔" وہ اُس کے قریب ہوا اور نرا بولنے سے اُس کا سانس اُکھڑتا تھا ۔۔۔ اُس کی آنکھیں تھوڑی سے کھلی تھی جیسے چوری دیکھتی ہوں اور اُن آنکھوں میں زردی تیرتی

تھی ۔۔۔ اُس کے چہرے پر ایک مکھی بھنبھنانے لگی ۔۔۔ ورچن کا دل نیچے ہوتا گیا ۔۔۔ یہ چلی تو نہیں گئی ؟ "پاروشنی ۔۔۔" اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے بازو پر رکھا اور تب اُس کے پپوٹے پورے اُٹھے پر وہ وہیں پڑی رہی ۔

"اُٹھو ، اب چلتے ہیں ۔۔۔" اُس نے اُس کے بازو کو پکڑا اور اُسے کاندھے پر رکھ کر سہارا دیا کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ سکے پر وہ اٹھ نہ سکی ۔

"اُٹھو ۔۔۔" اُس نے ایک گہرا سانس لے کر زور جمع کر کے کہا "اٹھو ۔۔۔ چلیں"

اُس کی آواز مدھم تھی جتنی مکھی کے بھنبھنانے کی تھی پر سنائی دی "کہاں ؟"

"جہاں پانی ہو ۔۔۔" وہ مُشکل سے بولتا تھا "کہیں بھی ۔۔۔ یہاں سے چلیں"

"ہُوں ۔۔۔" پاروشنی نے اُسے دیکھا ۔

"ہم ڈور گا کو بھی ساتھ لے لیں گے ۔۔۔ موہنجو بھی جا سکتے ہیں ۔ وہاں سندھو ہے ۔۔۔"

داتنوں پر سے ہٹے ہوئے ہونٹ اور ہٹے اور وہ مسکرائی اور پھر ہولے ہولے وہ اپنے آپ اُٹھنے لگی اور گھسٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گئی "نہیں ۔۔۔" اُس نے کہا اور اُس کی آواز اور دُور اور کم سُنائی دینے والی تھی ۔۔۔

"نہیں ؟" ورچن حیرت میں ہوا "کچھ مر چکے ہیں اور کچھ جا چکے ہیں ۔۔۔ پانی نہیں ہے اور ریت ہے ۔۔۔ اور کل تک ہم ہمیشہ کے لئے گم ہو جائیں گے اور ہمارا ماس مکوڑوں کے لئے ہو گا ۔۔۔ اُٹھو چلیں ۔۔۔" وہ رُکا اور ایک گہرا سانس لیا ۔۔۔ "میں اب تک تمہاری طرف دیکھتا رہا ہوں کہ تم کیا کہتی ہو ۔۔۔ اور اب میری آنکھیں مدھم ہو رہی ہیں اور میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا"

پاروشنی جیسے گہرائی میں ہو اور وہاں سے جیسے گہرے کنوئیں پانی سے خالی کنوئیں میں سے اُس کی "نہیں" کی آواز آئی ۔۔۔ "سُنو ۔۔۔" اُس نے اپنا ڈھانچہ ہاتھ ورچن کے سینے پر رکھا "میرے پاس آدھی مُٹھی کنک ہے ۔۔۔"

اور تب ورچن نے جانا کہ پاروشنی جا چکی ہے اور اب یہاں اُس کا پنجر ہے اور دُھوپ نے اور بُھوک پیاس نے اُس کا بھیجہ نرم کر دیا ہے اور وہ پاروشنی جو تھی اور اُن دونوں پر پورا چاند پڑتا تھا اور وہ رُکھوں کے بیچ جھیل کے پاس اُس کلراٹھی زمین پر جو کبھی جھیل تھی لیٹے تھے اور وہ ایسے پڑی تھی جیسے پتوں اور ٹہنیوں والا ایک رُکھ گرا پڑا ہو تو وہ پاروشنی جا چکی تھی اور یہ سامنے

اُس کا پنجر تھا پر وہ اِس پنجر کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا ۔

"چلو پاروشنی ۔۔۔ اب ہم ٹھیکریوں سے جانے جائیں گے ۔۔۔ اب کھیت ہرے نہیں ہوں گے ۔۔۔ چلو"

"نہیں ۔۔۔" پاروشنی بولی اور ایسے بولی کہ ورچن نے دوبارہ نہ کہا کہ چلو ۔

وہ اٹھا تو لڑکھڑا گیا ۔ اُس کا جُثہ اُس کا ساتھ نہ دیتا تھا ۔۔۔ وہ پھر بیٹھ گیا ۔۔۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں ؟ ۔۔۔ یوں ایسے پڑے رہنا کہ ہوا کم ہو جائے اور سانس نہ آئے اور گلے پر ہاتھ رکھ کر بندہ ہونکتا ہوا ٹھنڈا ہو جائے اور اُس پر ریت کی تہہ جمتی جائے اور دُھوپ اُسے خشک کر دے ۔۔۔ مکوڑوں کا اَن پانی بن جائے ۔ وہ اٹھا اور لرزتی ٹانگوں نے اُسے چوکھٹ تک پہنچا دیا ۔ پاروشنی کی آنکھیں اُسی طرح آدھی کھلی تھیں اور اُن میں زردی تیرتی تھی پر اُنہوں نے ورچن کو چوکھٹ پار کرتے دیکھا ۔

باہر خالی گلی میں ریت پر اُس کے پاؤں گھسٹتے تھے اور اُس کا پسینہ گرتا تھا ۔

چار دیواری کے اندر ڈور گا تھا اور اُس نے دیکھ لیا کہ ورچن آیا ہے اور کھڑا ہے اور بول نہیں سکتا اور اُس کا سانس ٹوٹتا ہے ۔

"چلو ۔۔۔" بالآخر ورچن نے کہا اور ڈور گا نے اُسے سہارا دیا اور وہ پکی کے آوے اور گھگھرا سے دور ہونے لگے ، لڑکھڑاتے اور کم زور جُثے جو ریت پر گھسٹتے ، ہاں ورچن نے یہ دیکھا کہ ڈور گا اب جھکا ہوا نہیں ہے ۔

وہ وہیں کئی دن پڑی رہی اور اُس کے مہاندرے پر مکھیاں بھنبھنانے لگیں کیونکہ نہ وہ چلتی تھی اور نہ آنکھیں کھولتی تھی اور وہ جہاں تھی وہیں رہی ۔۔۔ اُس کا ویہڑا ریت سے بھر رہا تھا ۔ دھوپ تیز ہوتی تو وہ تھوڑی سے سُکڑ جاتی اور دیوار کے ساتھ لگ جاتی ۔۔۔ اُس کا منہ کھلا رہتا اور آنکھوں میں زردی تیرتی ۔ وہ اپنے اندر کہیں سانس لیتی تھی پر باہر سے پتہ نہ چلتا تھا اور اپنے اندر کہیں سوچتی تھی کہ میں ابھی ہوں اور اپنے ویہڑے میں پڑی ہوں اور ریت چوکھٹ پر سے اندر گر رہی ہے اور مجھ پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں اور ورچن جا چکا ہے ۔۔۔

یہ اسوں کا اخیر تھا اور گرمی اب بھی ہر شے کو سُکھاتی تھی اور اُس کا پھوک بناتی تھی ۔۔۔ اِنہیں دنوں وہ کھیت کھودتے ، بیج ڈالتے اور بڑے پانی کی اڈیک میں بیٹھتے ۔۔۔ پر اُن دنوں

وہ ایک بستی تھے جیسا کہ اُس پکھیرو نے دیکھا تھا کہ نیچے ایک لکیر ہے اور اُس کی سکڑتی آنکھوں نے پہچان کی تھی ، لشکتی لکیر ریت نہ تھی اُس میں نمی کی جھلک تھی اور اُس لکیر کے کنارے کوئی بستی تھی اور اُس سے پرے ہریاول کے ٹکڑے اور رُکھ تھے جن کی باس مردہ ہوتی ناک میں بھی اترتی چلی گئی تھی ۔۔۔ اور پھر نیچے رُکھوں میں گھری ایک جھیل تھی ۔۔۔ پانی ۔۔۔ اُس نے اپنے پر سمیٹے اور پھڑپھڑاتا ہوا نیچے آنے لگا ۔۔۔ مرنے کے لئے ۔

وہاں پڑی وہ اپنے اندر کہیں سوچتی تھی کہ مجھ پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں اور میں اس دھوپ اور جلتی گرمی میں پڑی ہوں اور مجھ میں اتنا زور نہیں کہ اپنا سوکھا ہوا پنجر گھسیٹ کر اندر جاؤں کنوئیں والے کمرے میں اور بوکے میں سے پانی نکالوں ۔۔۔ پانی ۔۔۔ اُس کی زبان تالو کے ساتھ چپک کر خشک ہو چکی تھی اور اُس کے اندر اتنی نمی نہ تھی کہ اُسے پسینہ آتا ۔۔۔ وہ ایک خشک لکڑی کی طرح دھوپ میں پڑی رہی ۔۔۔

ایک سویر ایسی آئی کہ مکوڑے اُس کے جُثّے پر رینگتے تھے اور اُس کے کُھلے مُنہ میں مکھیاں بھنبھناتی تھیں ۔۔۔ اُس کی ادھ کُھلی آنکھوں کے سامنے کچھ نہ تھا اور وہ ڈوبتی تھی اور تب اندر ہی اندر اُس نے جانا کہ وہ جانے کو ہے اور اس بستی میں اُس کے سانس پورے ہوئے ۔۔۔ پر وہ ایسے تو نہ جاتی تھی ۔۔۔ نہ ۔۔۔ وہ اپنی بستی چھوڑ کر ایسے نہ جاتی تھی ۔۔۔ اُس کے پپوٹے اوپر ہوئے اور اُس کا ایک ہاتھ بُری طرح کانپنے لگا جسے اُس نے دوسرے ہاتھ سے دبا کر روکا ۔۔۔ اُس نے مُشکل سے اپنا منہ بند کیا جو کب سے کھلا پڑا تھا ۔ پھر اُس نے دونوں ہتھیلیاں ویہڑے کی ریت پر جمائیں اور اُس کا جُثہ کپکپا رہا تھا جیسے سُوکھے پتّے کے نیچے مکوڑے چلتے ہیں تو وہ کپکپاتا ہے ۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے گِھسٹنے لگی ۔۔۔ ابھی اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا پر وہ ایک مردہ ٹانگ کے کُتّے کی طرح ہولے ہولے گھسٹتی رہی اور اپنے آپ کو کنوئیں والے کمرے کے پاس لے گئی ۔۔۔ وہاں ایک نَم ٹھنڈک ہوتی تھی ۔۔۔ پر اب نہیں تھی ، اب وہ ایک تنور کی طرح تپتا تھا ۔۔۔ منڈیر پر رکھے بوکے کو اُس نے ہاتھ سے دھکیلا تو خاموشی رہی اور کچھ دیر بعد وہ کہیں گرا ۔۔۔ پاروشنی ادھر پڑی رہی بہت دیر تک اور کبھی وہ اندھیرے میں ہوتی اور کبھی اُسے کچھ دکھائی دے جاتا ۔۔۔ وہ بہت دیر تک پڑی رہی اور پھر اُس نے رسّی کو تھام کر کھینچنا شروع کر دیا ۔۔۔ اور یہ بوکا کبھی اتنا بھاری نہ تھا ۔۔۔ وہ اُسے تھوڑا کھینچتی اور ہونکنے لگتی اور پھر بہت دیر پڑی رہتی اور پھر کوشش کرتی ۔۔۔ بوکا منڈیر کے پاس آگیا تو اُسے جُھک کر ہاتھ سے باہر لانے کا مسئلہ تھا اور وہ اُس پر جُھکی رہی ۔۔۔ اُس نے بوکے کو پکڑ

رکھا تھا پر اُس میں اتنا زور کہاں تھا کہ اُسے باہر نکالتی اور ایک بار تو بوکا اُسے اپنے ساتھ کنوئیں میں گھسیٹنے لگا اور وہ منڈیر سے ٹکرا کر ادھر گر گئی ۔ وہ سانس میں بے حال ہوتی رہی اپنے اندر رہوا کھینچنے کا جتن کرتی رہی اور آخر کو اُس نے بوکا باہر نکال لیا ۔ وہ بھاری بہت تھا ۔۔۔ اُس میں پانی نہ تھا نرا کیچڑ تھا ۔ اِس کیچڑ میں اُس نے ہاتھ ڈالے اور پھر اِسے اپنے مہاندرے پر ملا اور اُسے یوں کچھ ٹھنڈک ملی ، کچھ زور ملا ۔۔۔ نہیں یہاں اُس ویہڑے میں بیٹھے بیٹھے مجھے مکوڑے نہیں کھائیں گے ۔۔۔ وہ گھسٹتے ہوئے ویہڑے میں آگئی ۔۔۔ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہی اور بہت دیر بیٹھی رہی ، پھر دیوار کو تھام کر ڈولتے ہوئے اپنے آپ کو سیدھا کیا اور اُن ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی جو کم زور والے دل کی طرح دھڑکتی تھیں ۔۔۔ اُس نے چوکھٹ کو پار کیا ۔ گلی میں ریت تھی ۔۔۔

پیاس اُس کے بدن میں تریہائے ہوئے بوٹوں کی طرح منہ کھولتی تھی اور چُبھتی تھی اور وہ گھسٹتی ہوئی آگے ہوتی جاتی تھی ۔ اُس کے سوکھے چمڑے کو گرمی پگھلا کر نرم کرتی تھی اور اُس کی ہڈیوں کو دھوپ جلاتی تھی ۔۔۔ اور وہ آگے ہوتی جاتی تھی ۔۔۔ ہلکی سی ہوا تھی جو ریت کو پلٹتی ہوئی چلتی اور اس کے سوا چپ تھی ۔

وہاں سروٹ بھی خشک ہو چکے تھے ، پانی کے بغیر وہ بڑھتے نہ تھے ۔

کنارے کے قریب پہنچ کر وہ ایک بار گری اور پھر منہ کھولے وہیں پڑی رہی ۔۔۔ اُس کے چہرے پر کیچڑ کا پوچا خشک ہو چکا تھا اور اُسے ایک ایسی ڈراؤنی شکل دیتا تھا جسے دیکھ کر پکھیرو بھی تربک سکتے تھے ۔۔۔ اُس کے منہ میں اور بالوں میں ریت جاتی تھی ۔

سمرو اپنے چھپر میں اوندھا پڑا تھا اور اُس کی آنکھیں بھی بے جان ہوتی تھیں اور اُس کا اندر ریت ہی ریت تھا جس میں نمی کا کہیں شک بھی نہ تھا ۔۔۔ اُس کے اندر بھی کچھ تھا جو کہتا تھا کہ سمرو تم گئے ۔۔۔ تم یہیں پڑے رہو گے اور مکھیاں تمہارے کُھلے منہ کے اندر بھنبھنائیں گی اور مکوڑے تم پر چلیں گے ۔۔۔ وہ اونگھتا تھا ۔۔۔ اور تب اُسے لگا کہ اُس کے چھپر کے سامنے کوئی تھا ، اور وہ بہت دیر تک سامنے تھا اور پھر آگے ہو گیا ۔ وہ گردن سیدھی کر کے دیکھنے کی کوشش تو کرتا کہ کون ہے پر گردن ڈھلک جاتی ۔۔۔

گھاگھرا میں پکّی کے گھڑوں کی ٹھیکریاں گرم ہوا سے تپتی تھیں ۔

کبھی پاروشنی ایک ناؤ میں اس کے پار گئی تھی اور اُدھر اُوپر خالی آسمان تھا جو روشنی کم کر رہا تھا ۔ اُس کے آس پاس کچھ نہ تھا بس وہ خود تھی اور مٹی میں ایسی مہک تھی جو اُس کے سر

بین الٹر کرتی تھی ۔۔۔ اور جب وہ ہلکی ہوئی تھی تو جیسے دریا میں تیرتی تھی کہ اُس کا سارا جسم اُس پاس کی مٹی پانی تھی ۔۔۔ اُس کے کان سنتے تھے ۔۔۔ پر رونے کی آواز نہ آئی ۔

اُس میں ہمت ہوتی تو وہ آج ناؤ کی بجائے چلتی ہوئی اُس پار جاتی ۔۔۔

سانس بند ہوجائیں تو بستی میں کہتے تھے کہ وہ دریا کے پار چلا گیا اور پاروشنی ریت میں پڑی ہوئی تھی اور اُس میں سکت نہیں تھی پار جانے کی نہیں تو چل کر جاتی ۔۔۔ تو پھر پار کہاں ہے ۔۔۔ اور وہاں کیسے جایا جائے ؟

یہ سب کیا ہے ۔۔۔ کیوں ہے ۔۔۔ کدھر ہے ۔۔۔ وہ اگر ہے تو کہاں ہے اور ہم کیوں ہیں ۔ ہم کیا ہیں؟ ماسا پھر ہنسا کہ تم بستی میں کیوں رہتی ہو ؟ ۔۔۔ وہاں پانی ہے گھاگھرا ہے اس لئے ۔۔۔ اور اگر وہاں پانی نہ ہو گھاگھرا نہ ہو ۔۔۔

"پاروشنی ۔۔۔"

اُس نے مہاندرہ ادھر کر کے نہیں دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی کہ جانے کسی نے نام لیا ہے یا نہیں اور کون ہے ۔۔۔ رُکھوں کے سانس ہیں جو یہ کہتے ہیں ۔۔۔ دوسری بار یہ آواز ذرا پاس سے آئی اور یہ سمرو تھا جو منہ کھولے ہانپتا ہوا آتا تھا اور اُس کا جُثہ بھی کمزوری کی بنا پر لرزتا تھا اور وہ بار بار زبان ہونٹوں پر پھیرتا تھا اور ہونٹ ایسے تھے جیسے پپڑیاں بھری خُشک زمین ۔۔۔

پاروشنی نے اُسے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور جانا کہ وہ ترازو کے دو باٹ تھے، برابر کے، پر نہیں برابر کے نہیں تھے، اِن میں سے ایک بھاری نکلا اور پلڑا ادھر ہوا ۔

اُس نے ہاتھ اٹھایا آگے کیا اور سمرو کے کانپتے بازو کو پکڑ کر سہارا دیا اور وہ اُس کے پاس اور ریت پر اُس کے ساتھ گرا ۔۔۔ اُن کے چھونے میں ایک زور تھا جو وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ وہاں تھا اور اب اُن کے جُثوں میں جان ڈالتا تھا ۔۔۔ گھاگھرا کے کنارے اُس جلاتی دھوپ میں جب سورج سر پر تھا اور الاؤ تھا اور آس پاس چپ تھی اور نہ رُکھ تھے اور نہ بستی تھی اور نہ کوئی جنور تھا اور نہ کوئی اور تھا اور نہ پانی تھا ۔۔۔ اونچے کنارے تھے اور ان میں ایک خشک راستہ تھا جس پر کبھی دریا تھا اور اُس پر اب پاروشنی اور سمرو پڑے تھے ۔۔۔ اور اُن کے نیچے کہیں کسی گھڑے کی ٹھیکریاں تھیں جو اُن کو چبھتی تھیں ۔۔۔ اور اُن میں اُس رات کا زور آیا جب وہ رُکھ تھی اور اُس رُکھ میں ورچن جان نہیں ڈال سکا تھا اور تب وہ ادھر آئی تھی اِسی دریا کے کنارے اور یہاں سمرو تھا اور پھر رات کی چپ تھی ۔ چیتر کی چاندنی پھیکی پڑتی تھی اور وہ دونوں بے سُدھ منہ کھولے تھکن سے ٹوٹتے سوتے تھے ۔۔۔ اور اب سورج الاؤ تھا اور آس پاس چپ تھی اور نہ

رُکھ تھے اور نہ بستی اور نہ کوئی جنور تھا اور نہ کوئی اور، اور نہ پانی تھا اور اُن کے لِنگ جو پہلے مرتے تھے اب زندہ ہوتے تھے اور اُن میں زور بھرتا تھا ۔ وہ اُس کے اندر سانس لیتا تھا اور پگھلاتا تھا اور اُس کے اوپر سورج الاؤ تھا جو اُس کی آنکھوں میں تھا اور اُس کا پسینہ تھا جو آنکھوں میں گرتا تھا اور وہ پاسا پلٹنا چاہتی تھی پر پلٹ نہیں سکتی تھی کہ بوجھ تلے دبتی تھی اور اٹھتی تھی اور پھر دبتی تھی ۔۔۔ پاروشنی بولی کہ بستی نہیں ہے اور پانی نہیں ہے ۔۔۔ اور نہیں ہیں ۔۔۔ وہ تھے ۔۔۔ اور وہ تھی اور اُس کا جُثہ تھرتھرانے لگا ۔۔۔ انگلیاں کھبو دیں کہ وہ آنے والے تھے ۔۔۔ اور وہ ہونکتی تھی اور کاٹتی تھی اور وہ ایسے آئے کہ اُسے بہانے لگے ۔۔۔ جیسے گھاگھرا بہنے لگا ہو اور وہ اُس میں ہو اور وہ دونوں اُس میں ایک دوسرے پر بہتے ہوں اور اوپر نیچے بہتے ہوں ۔۔۔ پانی تھا اور کھیت ہرے تھے اور اُس کا اندر ہرا ہونے لگا ۔۔۔ اور اُس نے اُس پَل جانا کہ اب اگر کتّے کا مہینہ ہے تو سَون بھادوں میں آنا بنتا تھا اور وہ دم سادھے سنے گی اور وہ روئے گا ۔۔۔ اور وہ روئے گا یہ وہ جان گئی تھی اِس پل جب وہ گھاگھرا کی خشک ریت پر پڑی تھی اور یہ ریت گیلی ہوتی تھی ۔۔۔ اور وہ دیکھتی تھی کہ سمرو اُس پر سے اٹھا ہے اور کہتا ہے میں جب بھی دیکھتا تھا تو یہی دیکھتا تھا کہ اونچے کنارے ہیں اور درمیان میں ایک خشک راستہ ہے اور اس کی مٹی میں ٹھیکریاں ہیں اور آس پاس کچھ نہیں ریت ہے ۔۔۔ اور ویرانی ہے اور ہم نہیں ۔۔۔ اور میں یہ سب سوتے میں دیکھتا تھا تو اب یہ سب کچھ میرے سامنے ہے تو میں اب سوتا ہوں یا جاگتا ہوں ۔۔۔ وہ یہ کہتا تھا اور چلتا جاتا تھا ۔۔۔ پاروشنی پاسا پلٹ کر اُسے دیکھتی رہی کہ وہ یہ کہتا جا رہا ہے اور چلتا جا رہا ہے کہ جو میں سوتے میں دیکھتا تھا وہ اب ہے تو میں اب کیا ہوں سوتے میں ہوں یا جاگتے میں اور وہ چلتا جا رہا ہے اور پھر خشک راستے کے درمیان میں کھڑے ہو کر اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو پاروشنی کو وہاں سورج الاؤ کے نیچے ایک رُکھ کی طرح لیٹے دیکھا پر رُکھ ایسا جس کی کوکھ ہری ہو ۔۔۔ اور پاروشنی نے اُسے وہاں کھڑے دیکھا اور پھر آنکھ جھپک کر دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھا ۔۔۔

وہ اٹھی اور اپنے آپ کو سنبھالتی ادھر گئی ۔ وہ اب لڑکھڑاتی نہ تھی اور مرے ہوئے پکھیروؤں کی طرح نہ تھی ۔ وہ اب ویسی تھی جیسی وہ ہوا کرتی تھی اور جب وہ وہاں تھی جہاں اُس نے سمرو کو کھڑے دیکھا تھا تو وہاں کچھ نہ تھا ۔۔۔ وہاں کوئی نہ تھا ۔۔۔ وہ اس خشک راستے میں گم ہو چکا تھا ۔ وہاں نہ تھا جہاں وہ سوتے میں آتا تھا وہاں اب وہ جاگتے میں چلا گیا تھا ۔

پھر وہ بستی کو لوٹتی تھی ۔۔۔

وہ ڈولتی تھی چلتے ہوئے جیسے سرکنڈے کا سفید سٹّہ ڈولتا ہے ہوا کے چلنے سے پر اُس کے پاؤں گھسٹتے نہ تھے ۔

ان دنوں بڑے پانی آتے تھے پر وہ دن ایسے اُپلوں کی طرح دُھنختے اور جلاتے نہ تھے ۔ پکلی کے آوے کے اوپر آسمان صاف تھا اور اُس کے پاس پکی اینٹوں کی چاردیواری کی سرخی دھوپ میں ایسی تھی کہ آنکھوں میں چبھتی تھی ۔

وہ پسینے میں بھیگتی جاتی تھی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے ریت سے گرم ہوا ابل کھاتی اٹھتی تھی ۔

جب گلی سامنے آئی تو وہ رکی ۔۔۔ وہاں دُھول نہ تھی اُس کے تلووں تلے تپتی ریت تھی ۔ اُس نے گردن پیچھے کر کے اوپر آسمان کو دیکھا جو گرمی سے نچڑ گیا تھا اور پھیکا ہو کر سفید ہو رہا تھا۔

اُس کے ویہڑے میں دُھوپ ڈھل رہی تھی ۔ وہ تھڑے کے قریب جا کر یکدم بھوک پیاس اور دھوپ کے نیچے آئی اور گر پڑی ۔۔۔ وہ بہت دیر وہاں پڑی رہی اور چھپّر کی کچّی دیوار کو دھوپ دھیرے دھیرے چھوڑتی رہی اور اوپر ہوتی رہی ۔۔۔ وہ زور جو جانے کہاں سے آیا تھا اور اُس کے جُثّے میں بہتا رہا تھا اب جا چکا تھا اور اُس کا ماس پیاس سے سوکھتا تھا اور اُس کا منہ کھلتا تھا اور ایک بار پھر مکھیاں اُس کے کُھلے مُنہ کے گرد بھنبھناتی تھیں ۔۔۔ اُس نے بڑی مشکل سے وہ بازو اپنے بوجھ سے نکالا جس پر وہ گری تھی ۔ اس بازو پر کنگن تھے جو اُسے چُبھتے تھے ۔۔۔ اُس نے دُھوپ کو ویہڑے کی دیوار سے اُٹھتے دیکھا ۔۔۔ اُس کے اندر بھی دھوپ کم ہوئی اور چھاؤں آئی اور اُسی چھاؤں میں ایک چولہا تھا جس میں اُپلے تھے اور وہ دھیرے دھیرے دُھنختے تھے اور اُن کا دھواں ویہڑے سے اوپر اٹھتا تھا جیسے دُھوپ کا پیچھا کرتا ہو ۔۔۔

پاروشنی کے تتھنے ایک وحشی جنور کی طرح پھڑکے اور وہ اُپلوں کے دھوئیں کے لئے پھڑکے تھے جو بے انت دنوں سے اُن کے اندر نہیں گیا تھا اور وہ بھی دھوئیں کی باس کے لئے ترسی اور اُس نے اپنی زردی میں تیرتی آنکھیں اُس چولہے پر جمائیں جو وہ ہر شام جب دھوپ دیوار چھوڑتی تھی جلایا کرتی تھی اور پھر وہ اپنا پورا زور دوسرے بازو میں لا کر کہنی ٹکا کر اٹھی اور بیٹھ گئی اور ہولے ہولے ویہڑا پار کر کے چولہے کے پاس ہو گئی ۔۔۔ یہ چولہا پکلی نے پکا کر دیا تھا ۔۔۔

اُپلوں کے بیچ رکھے ککھ کانے اور سوکھی گھاس پتھروں کی رگڑ سے پھوٹنے والی پہلی چنگاری

سے ہی سلگنے لگے اور پھر اُپلوں کا مہندی رنگ سیاہی میں بدلنے لگا ۔۔۔ پاروشنی چولہے پر جھکی اور سانس اندر کھینچ کر اُپلوں پر پھونک ماری اور اُن کے اندر آگ کی بڑبڑاہٹ سنائی دی اور پھر بُجھ گئی ۔ دوسری پھونک کے بعد وہ دھواں دینے لگے اور پاروشنی پیچھے ہو گئی ۔۔۔ اُس کی آنکھوں میں دھواں جانے سے پانی بہتا تھا ۔۔۔ اُس نے پانی کو پونچھا نہیں رہنے دیا ۔۔۔ اور دُھواں اُس کے تتھنوں میں گیا اور پھر ایک گہرے سانس کے ساتھ پورے جُثّے میں پھیلا اور اُسے مست کیا ۔۔۔

سفید دھواں ویہڑے میں سے اٹھ کر گلی میں پھیلتا تھا ۔

پاروشنی اپنے بازو سمیٹے اور اُن پر ٹھوڑی رکھے اُس چولہے کو تکتی تھی جس میں اُپلے سُلگتے تھے ۔۔۔ اگلے استوں میں اُسے آنا تھا اور ابھی سے محسوس ہوتا تھا ۔۔۔

پھر دھوپ بستی سے بھی پرے ہوئی تو ویہڑے میں شام آنے لگی اور اُپلے زیادہ روشن لگنے لگے اور پاروشنی اُنہیں بازو گھٹنوں پر رکھے دیکھتی رہی ۔۔۔

چھپّر کے نیچے گھڑوں کی پال تھی اور اُس میں وہ گھڑا تھا جس میں آدھی مُٹھی کنک تھی ۔۔۔ اور کنک کا سواد تھا ۔۔۔ پاروشنی اٹھی اور اُس گھڑے کو اُتار کر ویہڑے میں لے آئی ۔ اُس کے گول مُنہ میں ہاتھ ڈال کر اُس نے کنک کے دانوں کو ٹٹولا تو اُن کے چھونے سے اُسے ایک جھرجھری سی آئی جیسے اُن میں زور ہو جو پاروشنی میں اُس کی اُنگلیوں کے پوروں کے راستے اُترتا ہو ۔۔ وہ بیج تھے جن کے آس پاس پوری حیاتی ہوتی تھی ۔ وہ مٹی تھے جس کے بغیر جڑیں دھوپ میں سوکھتی ہیں گہری نہیں ہوتیں ۔۔۔ اُس نے اُن میں سے آدھے دانے مُٹھی میں سمیٹے ۔۔۔ اور آدھے گھڑے میں رہنے دیئے ۔۔۔

اُپلوں پر راکھ کی تہہ جم رہی تھی اور اُن میں سے لو بُجھ کر آتی تھی ۔۔۔ شام گہری ہو رہی تھی ۔۔۔ وہ چھپّر کے سامنے بنی ادکھلی پر جُھکی جس میں ریت بھر گئی تھی ۔ اُس نے اُس میں سے ریت نکالی اور پھر جُھک کر پھونک ماری اور مُٹھی میں بند کنک کے چند دانے اُس میں ڈال دیئے ۔

مونگلی کنوئیں والے کمرے میں دھری تھی ۔ وہ اسے لینے اندر گئی تو اُسے ایسا لگا جیسے ادھر اُس تاریک کمرے میں کنوئیں کے اندر کوئی ہے جو سانس لیتا ہے اور اُس کے سانس کی گونج کنوئیں کی گولائی میں گھومتی گم ہوتی ہے ۔۔۔ اُس نے مونگلی اٹھائی تو وہ اُس کی اُنگلیوں کو

بہت پرائی لگی کہ یہ کب تھا جب اُس نے آخری بار کنک کوٹی تھی اور پیسی تھی اور پھر روٹی پکائی تھی ۔۔۔ یہ بہت دن پہلے ہوا تھا جب وہ سب تھے ۔۔۔

چولہے میں اُپلے مدھم ہو رہے تھے ۔۔۔

پاروشنی نے مونگلی کو دونوں ہاتھوں سے درمیان میں سے پکڑا اور اوپر اٹھایا ۔۔۔ وہ بہت بھاری تھی اور پاروشنی کا زور جا چکا تھا اور اُس کی ٹانگیں اُس کے بوجھ سے لرزنے لگیں اور اُس کی پیاس اُسے بے حال کرتی تھی ۔۔۔

اوکھلی میں کنک کے چند دانے تھے اور اوپر پاروشنی کے ہاتھوں میں مونگلی تھی جس کے سِرے پر ایک پتھر کا ٹکڑا تھا کنک کُوٹنے کے لئے ۔۔۔ اُس نے مونگلی کو اپنا بچا ہوا زور دیا اور اُسے اوکھلی میں دے مارا ، کنک کے دانے اُس کے نیچے آکر پیسے گئے پر چند دانے مونگلی کے کنارے سے لگے اور وہ اڑ کر اُس کی پنڈلیوں میں تیز کانٹوں کی طرح جا لگے ۔۔۔

وہ مونگلی کو ایک خاص ٹھہراؤ کے بعد اٹھاتی اور فضا میں بلند کرتے کرتے گہرا سانس جُثے میں بھرتی اور پھر منہ کھول کر سانس باہر نکالتے ہوئے ایک لمبی " ۔۔۔ ہوؤ " کے ساتھ اُسے کنک پر دے مارتی ۔۔۔

مونگلی کا سِرا کنک پر گرتا تو " ۔۔۔ دھم " کی آواز آتی اور پاروشنی سانس نکالتے ہوئے جو ایک لمبی " ۔۔۔ ہوؤ " کرتی تو مونگلی کی دَھم اور پاروشنی کی ہوؤ مل کر ایک سُر بناتے ۔۔۔ اور یہ آواز بتاتی کہ یہ پاروشنی ہے جو شام کی روٹی کے لئے کنک کوٹتی ہے ۔۔۔ پر یہ آواز اب کسے بتاتی ۔۔۔ وہاں سننے کو کوئی نہ تھا ۔

ہوؤ ۔۔۔ دَھم ۔۔۔ ہوؤ ۔۔۔ دَھم ۔۔۔

اور اس میں ایک اور آواز بھی شامل ہوتی تھی ۔۔۔ اُس کے کنگن بازو اوپر کرنے سے کھنکتے ہوئے نیچے آتے تھے اور شور کرتے تھے اور تب اُسے یاد آیا کہ وہ اس شور کو کم کرنے کے لئے کنگن اُتار کر کنک کُوٹا کرتی تھی ۔۔۔ اُس نے دونوں بازوؤں میں سے آدھے آدھے کنگن اُتار دیئے ۔۔۔ اب اُن کا شور کم تھا لیکن تھا ۔۔۔ اور یہ شور اُس کے ماتھے پر لگتا تھا ۔ اُس نے مونگلی رکھ کر سارے کنگن اُتار دیئے ۔۔۔ اور اب وہاں کوئی شور نہ تھا ۔۔۔ صرف ہوؤ ۔۔۔ دھم ۔۔۔ جو کچھ پہن لو ۔۔۔ جتنا کچھ ۔۔۔ اُتنا شور ۔۔۔ اُتنا بھار ۔۔۔

پاروشنی کا جُثہ پسینے میں بھیگتا تھا اور شام میں بھی دکھائی دیتا تھا ۔۔۔

اُس کے سُوکھے ہوئے جُثے میں سے ہڈیاں جیسے ماس سے باہر آتی تھیں اور اُس کی آنکھیں

بڑی ہوتی تھیں اور اندھیرے میں دکھائی دیتی تھیں ۔

دَھم ۔۔۔ ہوؤ ۔۔۔ دَھم ۔۔۔

پاروشنی کے پیروں میں ریت اُس کے پسینے سے گیلی ہوتی تھی ۔۔

گھاگھرا کے اونچے کناروں کے اندر اب خشک راستہ آخر تک چلے گا جس میں صرف ٹھیکریاں ہوں گی اور خشک گھونگھے ہوں گے اور پکلی کے آوے سے کبھی دھواں نہیں اٹھے گا اور چیتر کی چاندنی میں گھاگھرا کے پانی کبھی نہیں لشکیں گے ۔۔۔ وہ یہ سب جانتی تھی اور پھر بھی وہ کنک کوٹتی تھی کہ اُس کے پاس آدھی مُٹھی کنک تھی اور اُس کے کھیت ہرے ہونے تھے ۔۔۔

دَھم ۔۔۔ ہوؤ ۔۔۔ دَھم ۔۔۔ ہوؤ

کنک کوٹنے کی دَھم دَھم کی آواز اُٹھتی تھی اور پاروشنی کے ویہڑے سے اوپر ہوتی تھی اور پھر پھیلتی تھی اجاڑ چھپروں پر اور ریت سے اٹی گلیوں میں اور ڈوبو مٹی پر جو کبھی تھی اور وہاں جہاں کبھی رُکھ تھے اور اب ریت تھی اور ایک سُوکھی ٹہنی تھی اور مور کا پنجر تھا جس کے جھاڑو کے رنگ اُڑ چکے تھے اور وہاں جہاں کبھی دریا تھا اور اب اونچے خالی کنارے تھے اور ان میں پانی کی بجائے دَھم دَھم کی آواز ٹھہرتی تھی اور تیرتی تھی ۔۔۔

